

# اسلام میں

## خواتین کے حقوق



اسلام میں خواتین کے حقوق

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

### ہماری مطبوعات

درجہ قرآن	تفسیر عاشورا
کتبہ تشیع اور قرآن	عزاداری کیوں؟
اسرار نبی البلاغہ	عاشورا اور خواتین
نبی البلاغہ سے چند منتخب نصیحتیں	پیام شہیدان
مدہب الہی بیت	ہمارا پیام
شیعیت کا آغاز کب اور کیسے	آزمائش
لفظ امامت	درس انقلاب
الہی بیت آیہ تطہیر کی روشنی میں	اسلامی تحریک قرآن و سنت کی روشنی میں
انجیر (مختصر سیرت معصومین)	شیانہ انکسار
سوانح حیات حضرت فاطمہ الزہراء	عوامی حکومت یا ولایت فقیہ
الہی بیت کی زندگی مقاصد کی ہم آہنگی زمانہ کی نیرنگی	کتاب المؤمن
فدک تاریخ کی روشنی میں	خانہ ان کا اخلاق
آمریت کے خلاف انجیر ظاہرین کی جدوجہد	ازدواج و اسلام
صدائے حضرت سجاد	اسلام میں خواتین کے حقوق
سوانح حیات حضرت امام حسین	آسان مسائل
تفسیر سیاسی قیام امام حسین	عورت پر وہ کی آغوش میں
اثبات وجود خدا	اسلامی اخلاق و مسالک الہی بیت کی روشنی میں
۲۰ جواب	ملویت و کیونز
آسان عقائد (دو جلدیں)	خاک پر سجدہ مقصد امامیت حقیقت
تعالیم دین سادہ زبان میں (دو جلدیں)	مسجد مقصد تقاضہ کثرت و ارباباں
حسین شناسی	عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز
انقلاب حسین پر محققانہ نظر	دعائے اقتلاح — دعائے ندبہ
لکھ حسین کی الفبا	زیارت نامہ



# اِسْلَام مِیْنُ خَوَاہِنِیْنُ کَے حُفُوْقُ

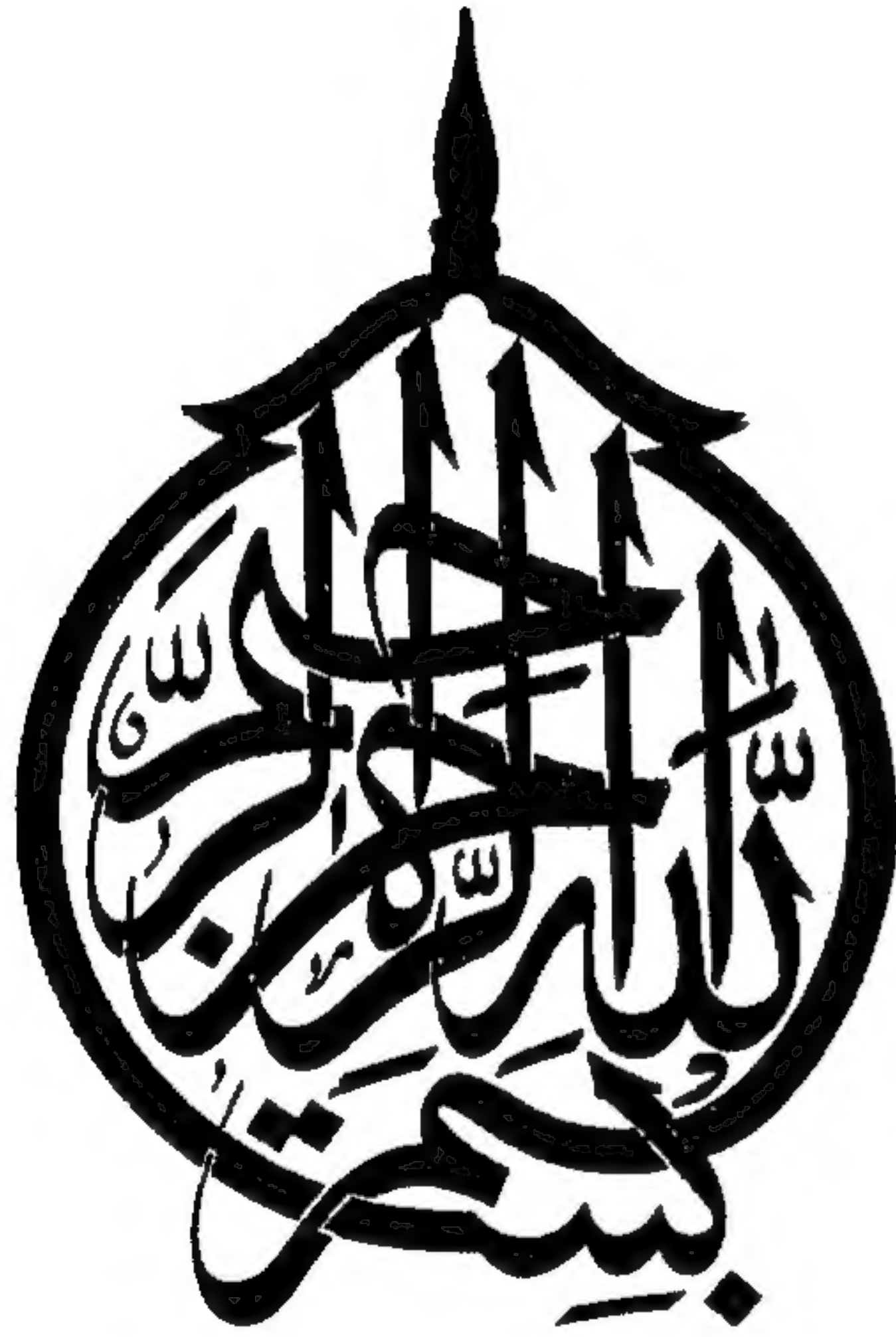
تالیف

اُسْتَاذ شَیْدِ مُرْتَضٰی مَطہَّری

یَکے از مطبوعات

بَیِّنَاتُ الْاِسْلَامِ پَاکِیْسْتَانِ  
۲-۲-۵۷ - ناظم آباد - نمبر ۲ - کراچی





طبع سوم

ہمدانی الاولیٰ ۱۹۱۹ھ، ستمبر ۱۹۹۸ء

نام کتاب \_\_\_\_\_ اسلام میں خواتین کے حقوق  
تالیف \_\_\_\_\_ استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ  
ترجمہ \_\_\_\_\_ مولانا مرتضیٰ حسین صدر الافاضلؒ  
ناشر \_\_\_\_\_ دارالشفافۃ الاسلامیہ پاکستان  
طبع دوم \_\_\_\_\_ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ جنوری ۱۹۹۳ء  
تعداد \_\_\_\_\_ ۲۰۰۰

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

# فہرست کتاب

عرض ناشر  
حرفِ اول

مترجم

○ — مصنف

○ — کتاب

○ — ترجمہ

مقدمہ مؤلف

شہید مطہری

پیش گفتار مؤلف

○ — عائلی روابط کے بین الاقوامی مشکلات

○ — آزاد رہیں یا مغرب کی تقلید کریں ؟

○ — تاریخ کا جبر

○ — ایرانی معاشرے میں مذہبی رجحانات

کتاب کا آغاز

مؤلف

○ — خواستگار کی درنامزدگی

○ — کیا مرد کی طرف سے خواستگار کی عورت کی توہین ہے ؟

○ — مرد کی فرصت، طلب و نیاز — عورت کی فطرت، جلوہ و نیاز



- ۶۰۔ مرد خریدار و محال ہے، عورت کا خریدار نہیں ہے۔  
 ۶۱۔ حیثیت، احترام، خواتین کے تحفظ کا دانشمند اور نفیس طریقہ منگنی ہے۔  
 ۶۲۔ چالیس قانونی نکات مرتب کر کے دئے گئے قانون مدنی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی۔

### دوسرا حصہ

- ۶۴۔ خلاصہ مطالب از مؤلف :-  
 ۶۵۔ نکاح موقت - متعہ -  
 ۶۶۔ متعہ اور آج کی زندگی -  
 ۶۷۔ وقتی رہبانیت -  
 ۶۸۔ آزمائشی شادی یا نکاح موقت (متعہ) کو نسا طریقیہ بہتر ہے۔  
 ۶۹۔ نکاح موقت -  
 ۷۰۔ اعتراضات و جوابات -  
 ۷۱۔ اتفاق - چالیس نکات پر -  
 ۷۲۔ نکاح موقت اور حرم سر -  
 ۷۳۔ حرم - سازی کے معاشرتی اسباب -  
 ۷۴۔ کیا ازدواج موقت ہوس رانی کے لیے جواز مہیا کرتا ہے؟  
 ۷۵۔ آج کی دنیا میں حرم سر -  
 ۷۶۔ ازدواج موقت سے خلیفہ کی منافعت -  
 ۷۷۔ حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث -

### تیسرا حصہ

- ۷۹۔ خلاصہ مطالب از مؤلف :-  
 ۸۰۔ سرنوشت کے انتخاب میں آزادی -

- ۸۱۔ جنم سے پہلے نکاح -  
 ۸۲۔ بیکوں یا بہنوں کو مواضع -  
 ۸۳۔ رسول اللہ نے حضرت معصومہؓ کو انتخاب میں آزاد رکھا۔  
 ۸۴۔ اسلامی تحریک میں خواتین کا انقلاب سفید -  
 ۸۵۔ باپ کی اجازت -  
 ۸۶۔ مرد بندہ شہوت اور عورت اسیر محبت ہے۔

### چوتھا حصہ

- ۸۷۔ خلاصہ مطالب از مؤلف :-  
 ۸۸۔ اسلام اور بدلتی زندگی - ۱۔  
 ۸۹۔ زمانے کے تقاضے -  
 ۹۰۔ خود زمانہ کس سے منطبق ہوتا ہے؟  
 ۹۱۔ انطباق یا نسخ؟  
 ۹۲۔ اسلام اور بدلتی زندگی - ۲۔  
 ۹۳۔ انسان، معاشرہ اور عقل -  
 ۹۴۔ منجمد اور جاہل لوگ -  
 ۹۵۔ قرآنی تشیل -  
 ۹۶۔ اسلام اور بدلتی زندگی - ۳۔  
 ۹۷۔ قوانین اسلام میں جوڑ، موڑ اور اسرار و رموز -  
 ۹۸۔ جسم و صورت کے اختلاف سے زیادہ روح و حقیقت پر توجہ ہے۔  
 ۹۹۔ مستقل ضرورتوں کے لیے پائدار قانون اور بدلتی ضرورتوں کے لیے متبادل قانون -



- — رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ۔
- — ہیٹ پہننا حرام نہیں، دم چھلنا بنا حرام ہے۔
- — اہم اور اہم تر مسئلہ۔
- — ویٹو کا حق رکھنے والے قوانین۔
- — حاکم کے اختیارات۔
- — اصل اجتہاد۔

### پانچواں حصہ

- خلافت مطالب از مؤلف :-
- قرآن کی نظر سے عورت کا انسانی درجہ۔
- برابر کی یا مشابہت۔
- اسلام کی جہاں بینی میں عورت کا مرتبہ۔
- مساوات؟ ناں — مشابہت؟ — نہیں۔
- حقوق انسانی کا منشور، فلسفہ ہے، قانون نہیں ہے۔
- فلسفہ کو پین سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔
- یورپ میں حقوق نسوان کی تاریخ پر ایک نظر۔
- انسان کی حیثیت اور حقوق۔
- منشور حقوق انسانی کے اہم نکات۔
- مقام و احترام انسان۔
- مغربی فلسفوں میں انسان کا منزل اور گراؤٹ۔
- مغرب انسان کے بارے میں تضاد اور تناقض سے دوچار ہے۔
- مغرب نے خود کو بھی بھلا دیا اور خدا کو بھی۔

### چھٹا حصہ

- خلافت مطالب از مؤلف :-
- عائلی حقوق کی فطری بنیادیں۔ (۱)
- طبعی حقوق اور طبیعت کی مقصدیت میں فرق۔
- معاشرتی حقوق۔
- عائلی حقوق۔
- عائلی حقوق کی فطری بنیادیں۔ (۲)
- خاندانی زندگی فطری ہے، یا باہمی مفاہمتی زندگی؟
- چار عہدوں کا مفروضہ۔
- عورت، فطرت کے زاویہ نظر سے۔
- سیاتواں حصہ
- خلافت مطالب از مؤلف :-
- عورت و مرد کے فرق۔ (۱)
- عورت و مرد میں فرق و اختلافات۔
- نقص و کمال یا تناسب۔
- نظریہ افلاطون۔
- ارسطو، افلاطون کے مقابلے میں۔
- دورنگی۔
- نفسیاتی فرق۔
- عورت و مرد کے فرق۔ (۲)
- پروفیسر ریک کے نظریات۔



- - شاہ کار خلقت - ۲۱۴
- - خواہشات سے بلند تر رشتہ - ۲۱۵
- - زن و مرد کے باہمی نفسیات و احساسات - ۲۱۶
- - ماہر نفسیات خاتون کا نظریہ - ۲۱۸
- - جلد بازی کا انقلاب - ۲۱۹
- - ویل ڈیورینٹ کا نظریہ - ۲۱۹
- آٹھواں حصہ ۲۲۵
- خداوند مطالب از مؤلف :- ۲۲۵
- - مہر اور نفقہ - ۲۲۶
- - مہر کا تاریخی - ۲۲۸
- - مہر - نظام قانون اسلام میں - ۲۲۹
- - تاریخ پر ایک نظر - ۲۳۰
- - مہر کا حقیقی فلسفہ - ۲۳۱
- - قرآن میں مہر - ۲۳۶
- - حیوانات میں احساسات کا فرق - ۲۳۷
- - غیر شرعی شادیوں میں بدیہ اور کھفہ - ۲۳۸
- - فرنگی کا عشق اس کی شادی سے بہتر ہے - ۲۳۸
- - مہر اور نفقہ - ۲۴۰
- - جاہلیت کے رسم و رواج اسلام نے منسوخ کر دیے - ۲۴۱
- - مہر کا نظام خاص اسلام کا نظام ہے - ۲۴۲
- - آئین فطرت - ۲۴۳

- - انتقادات و نظر - ۲۴۶
- - مہر اور نفقہ - ۲۵۲
- - نفقہ - ۲۵۲
- - انیسویں صدی کے آخری حصے تک فرنگی عورت کی محرومی - ۲۵۲
- - یورپ نے عورت کو اقتصادی آزادی کیوں دی؟ - ۲۵۳
- - ایک تناظر - ۲۵۶
- - انتقاد اور جواب - ۲۵۷
- - نفقہ کی تین قسمیں - ۲۵۹
- - کیا آج کی بیوی مہر و نفقہ نہیں چاہتی؟ - ۲۶۰
- - مالی معاملات میں عورت کی نگہداشت - ۲۶۱
- - نان و نفقہ کے خلاف پروپیگنڈا - ۲۶۲
- - شوہر کی دولت - ۲۶۶
- - کیا حقوق انسانی کا منشور، عورت کی توہین کرتا ہے؟ - ۲۶۹
- نواں حصہ ۲۷۳
- خداوند مطالب از مؤلف :- ۲۷۳
- - مسئلہ میراث - ۲۷۴
- - میراث سے عورت کی محرومی کے اسباب - ۲۷۴
- - منہ بولا لڑکا، وارث ہوتا تھا - ۲۷۶
- - ہم پیمان (ضامن البحرہ) کا ترکہ - ۲۷۷
- - بیوی، ترکہ کا حصہ تھی - ۲۷۷
- - ساسانی عہد کے ایران میں عورت کا وارث ہونا - ۲۷۷



○ اسلام کی نظر میں عورت کا حصہ میراث ۔

○ مغرب پرستوں کا اعتراض ۔

○ میراث کے مسئلے پر زندیقوں کا اعتراض ۔

### دسواں حصہ

خدمتہ مصائب از مؤلف :-

○ طلاق ۔

○ تہی مطلق ۔

○ نئی زندگی اور طلاق میں تضاد ۔

○ ایران میں طلاق ۔

○ امریکہ میں طلاق کی افزائش کی ہوا ۔

○ مفروضے ۔

○ طلاق ۔ ایک بین الاقوامی مسئلہ ۔

○ غیر شرعیانہ طلاق ۔

○ امام حسنؑ کے خلاف بی بنیاد پروپیگنڈا ۔

○ اسلام نے طلاق کو حرام کیوں نہ کیا ۔

○ طلاق اور نظم و فطرت ۔

○ نکاح و طلاق میں قانون فطرت کی نگہداشت ۔

○ گھریلو زندگی میں شوہر کا فطری درجہ ۔

○ ماہر نفسیات فرانسیسی خاتون کا نظریہ ۔

○ وہ عورت جس کی بنیاد جذبات پر ہے ۔

○ گھریلو زندگی کو استوار کرنے والی چیز مساوت ہے بھی اہم ہے ۔

○ فساد میں مساوت ۔

○ طلاق ۔ کوشش صلح کے پس منظر میں ۔

○ گھریلو صلح کا مندرجہ ہر قسم کی صلح سے جدا ہے ۔

○ اسلام، صدق سے باز رکھنے والی ہر تجویز کا خیر مقدم کرتا ہے ۔

○ خاندان کے لیے بیوی کے گذشتہ خدمات ۔

○ طلاق (آزادی اور تہی) ۔

○ تہی، مرد کے خاص کردار کا نتیجہ ہے اس کا تعلق عشق سے ہے ۔

○ طلاق اس لیے آزادی ہے کہ شادی کی فطری .....

○ طلاق کا جرمانہ ۔

○ اگر تہی طلاق بیوی کو تفویض ہو ۔

○ عدالتی طلاق ۔

○ بندہ راستے ۔

○ طلاق کا بندہ راستہ ۔

○ آیت اللہ علیؑ کا خیال ۔

○ آیات و احادیث ۔

○ دو سہ دل و شوہر ۔

○ شیخ الطائفہ کا نظریہ ۔

### گیارہویں حصہ

○ خدمتہ مصائب از مؤلف :-

○ تقدیر از واج ۔

○ جنسی کمینوزم ۔



- ۳۶۱۔ فلسطون کا نظریہ۔
- ۳۶۲۔ چند شوہری نظام۔
- ۳۶۳۔ چند شوہری نظام کے مشکلات۔
- ۳۶۴۔ تعدد ازواج۔
- ۳۶۵۔ سلام اور تعدد ازواج۔
- ۳۶۸۔ یورپ میں تعدد ازواج۔
- ۳۶۱۔ تعدد ازواج کے تاریخی اسباب۔
- ۳۶۳۔ چند شوہری نظام کی ناکامی کی وجہ۔
- ۳۶۶۔ جنسی اشتراکیت کی تسکین۔
- ۳۸۲۔ تعدد ازواج کے تاریخی اسباب۔ ۲۔
- ۳۸۲۔ جغرافیائی عوامل۔
- ۳۸۵۔ یورپ میں چند ازواجی رسم کی صورت حال۔
- ۳۸۹۔ مابوری۔
- ۳۸۹۔ خواتین کی بچگی کا سن محدود ہوتا ہے۔
- ۳۹۰۔ اقتصادی اسباب۔
- ۳۹۱۔ تعدد و خاندان، ایک سبب۔
- ۳۹۲۔ تحقیق۔
- ۳۹۵۔ کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق۔
- ۴۰۰۔ شادی کے قابل عورتوں کی مردوں کے مقابلے میں عدوی کثرت کے عمل و سبب۔
- ۴۰۲۔ بیماریوں سے خواتین کی قوت مدافعت۔
- ۴۰۳۔ کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق۔

- ۴۰۵۔ رسل کا نظریہ۔
- ۴۰۷۔ دس انگریزوں میں ایک۔
- ۴۰۸۔ تعدد ازواج ممنوع اور ہم جنس بازی کی اجازت۔
- ۴۱۰۔ کیا چند ازواجی مرد کی فطرت ہے؟
- ۴۱۴۔ چند ازواجی نظام ایک زوجہ نظام کا سبب ہے۔
- ۴۱۵۔ بحث کی اصل صورت۔
- ۴۱۶۔ بیسویں صدی کے مرد کی نینرنگیاں۔
- ۴۱۹۔ بے شوہر خواتین کی محرومی سے پیدا ہونے والا بحران۔
- ۴۲۰۔ عورتوں کی فراوانی میں مختلف رد عمل۔
- ۴۲۳۔ چند ازواجی کے مشکلات و عیوب۔
- ۴۲۲۔ تحقیق کا صحیح راستہ۔
- ۴۲۵۔ روحانی زاویہ نظر۔
- ۴۲۷۔ تربیتی نقطہ نظر۔
- ۴۲۹۔ خلائق زاویہ نظر۔
- ۴۳۱۔ قانونی نقطہ نظر۔
- ۴۳۳۔ فلسفی نقطہ نظر۔
- ۴۳۶۔ چند ازواجی دستور میں اسلام کا کردار۔
- ۴۳۶۔ محدودیت۔
- ۴۳۷۔ عدالت۔
- ۴۴۲۔ عدل و انصاف کا خوف۔
- ۴۴۳۔ حرم سرائیں۔



○ — دوسرے شرائط و لوازمات ۔

۴۴۳

○ — محترم قارئین !

۴۴۵

○ — آج کا مرد اور تعددِ ازواج ۔

۴۴۵

## فہرست :

۴۴۹

● — فہرست آیات ۔

۴۵۱

● — فہرست احادیث ۔

۴۵۲

● — فہرست اشعار ۔

۴۵۴

● — فہرست اسماء و امالین ۔ (اعلام)

۴۵۵

## حرفِ اوّل

○ — مصنف

○ — کتاب

○ — ترجمہ



## حرفِ اول

### مصنف :-

اللہ، اللہ! کہتے زمین انسان اس نے پیدا کیے ہیں وہ تند و تیز بوجس کے یک جہز سے  
تندرخت اڑ جاتے ہیں، وہ تندر و سیلاب جو فلک بوس یوانوں کو بہا لے جاتے ہیں، وہ ش  
نشان دھماکے جن سے پہاڑوں کے کیلے پھٹ جاتے ہیں۔ انسان کے یکاشار سے آدم زو  
کے ایک کرشمے میں موجود ہیں۔ اللہ نے ابن آدم کو تسخیر کائنات کی قوت عطا کی ہے، ہم نے یہ  
آدمی دیکھے ہیں جنہوں نے، فضا، ماوراء فضا اور ستاروں پر ہاتھ ڈالے اور قدم فرسائی کی ہے۔  
علم، آدم کی میراث ہے اور معاشی کے کو باغ و بہار بناتا ہے، تسخیر کائنات ہو یا تسخیر قلب  
و نگاہ بشر دونوں کے لیے علم درکار ہے۔ علم جلال بھی پیدا کرتا ہے، جمال بھی۔ علم کا ایک نام  
قرآن ہے دوسرا نام نبی آخر الزمان ہے۔

ہمارے آپ کے نزدیک ہی علم، یہ بھی لکھ جاتا اور اسی سے اللہ تک رسائی ہوتی ہے۔  
اس راستے پر چنے کے آداب اور اس راستے کے رہنما امام اور ان کے دبستان سے سند فضل  
و شرف لینے والے علما ہیں۔ کتاب و سنت کے عالموں میں ایک عالم تھے۔

شیخ مرتضیٰ مطہری، ابن شیخ محمد حسین مطہری، صوبہ خراسان یزان کے باشندے،  
فریمان دیہات کے رہنے والے، دیہات سے نکل کر شہر مقدس مشہد، وہاں سے شہر قم،  
وہاں سے تہران آکر آباد ہو گئے۔ فریمان میں الف بے پڑھی، مشہد میں متوسلہ کادرس  
یا، قم میں "اجتہاد" کا مرتبہ حاصل کیا۔ قم کے متعدد اکابر کے حضور حاضر ہوئے، جن میں  
خصوصی اساتذہ یہ تھے :-



آیت اللہ سید حسین بروجرودی۔

آیت اللہ سید محمد محقق۔

آیت اللہ سید محمد حجت۔

آیت اللہ صدر۔

آیت اللہ سید محمد حسین صابانی، مفسر فلسفی۔

آیت اللہ سید روح اللہ موسوی خمینی۔

جناب مستطری، روشن فکر، دقیق نظر، انداز ذہن، دلکش گفتگو اور علمی درجے کی تقریر و تحریر کی بہت رکھتے تھے، انھوں نے غنی و حدیث، فقہ و علوم میں جو کچھ پرجہ سے تصانیف تصانیف سیاسیات، قانون، معاشرتی علوم و جدید سائنس کے عوہل، و عمیق مطالعات میں سمویا اور قوم کے دانشوروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی، وہ مغربی فکر کو مشرقی نہیں بلکہ مشرقی فکر کو مغربی فلسفے کی روشنی میں لوگوں تک پہنچانے اور دونوں کے درمیان میں بنانے والوں میں تھے۔

تیس سال کی عمر میں (۱۹۵۲ء) وہ تہران آگئے، تہران میں ان کا معاشرتی و علمی متاثرہ پھیل گیا، جو ان صبا ان کے گرد جمع ہو گئے وہ آیت اللہ خمینی مدظلہ اعلیٰ سے قریب ہوتے گئے۔ آقائی مستطری نے بہت اپنی مصروفیت کے سہارے یونیورسٹی تک رسائی حاصل کر لی، وہ دانشور، ہیئت میں یکچہرے، سینے لگے اور عصب پران کا فکری دباؤ بڑھنے لگا، مرکزی تہران ہونے کی وجہ سے وہ بین الاقوامی سرگوشیوں کو قریب دیکھنے کے موقع حاصل کر سکے اور جدید مسائل نیز اسلام کے خلاف زیر زمین اور اندرون موشرہ، خفیہ و علانیہ تحریکوں کے سامنے آنے لگے، جینیہ اشاد ان کو مورچہ تھا اور تہران یونیورسٹی و پریس ان کی جنگاہ۔ وہ اساتذہ و طلبہ کے ذہنوں پر چھا گئے، وہ جوان نسل کے دلوں میں سمگے، اسد می نمود و عمل کے پرچارک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اسد می نقاب کے سپاہی بھی تھے وہ ہر وقت دفاع کے لیے تیار اور ہر جملے کا جواب

دینے کے لیے آگے نظر آتے تھے، جینیہ اشاد کے بعد مدرسہ سپہ سالاران کا ہیڈ کوارٹر ہو جے بعد میان کی یاد میں مدرسہ عالی شہید مہتری کا نام دے دیا گیا۔

۱۹۶۳ء - ۱۹۶۴ء - ۱۹۶۹ء تک وہ عمدہ ورکار و پختیار کر چکے تھے، وہ سیاسی قائد اور فکری رہنما بن کر بھرپور شخصیت کی صورت میں سبک سامنے تھے۔ مہم منی مدظلہ کے نامی اور نقاب اسد می کے دشمنی قرار پائے، وہ جیگتے حکومت کے عذاب اور شاہ پرتول کے نشانے پر رہنے لگے۔ انقلاب اپنے شباب پر آیا، وہ ہر انقلاب عرق سے فرانس پہنچے تو جناب مرتضیٰ مہتری، مرجع اسد می و قائد انقلاب اسد می سے مذکرت کرنے پیرس تشریف لے گئے۔ مہم منی مدظلہ نے گھے لگے، ہدایت دیے۔ جناب مرتضیٰ مہتری نے واپس آکر تہرانی انقلابیوں کی قیادت سنبھال لی۔

۱۱۔ فروری ۱۹۷۹ء کو انقلاب اسد می کا یاب ہوا، اور شیخ مرتضیٰ مصطفیٰ مجلس شورے انقلاب کے کن و روح و روان بنائے گئے۔ وہ انقلاب کی اس رفتار، سمت اور بہاؤ کے انکرن تھے، وہ تختہ مزاج کے کوہ صفت رہنا تھے، وہ سمندر کی طرح نرم، گہرے مگر نہایت چٹنے والی کشتیوں کی غرقابی کے اقتدار سے بہرہ ور تھے۔

انقلاب دشمن، انقلاب و انقلاب کے خواہشمند افراد اور قائد انقلاب کو ذہنی، ذہنی، پہنچنے کی نیت رکھنے والوں نے ۲۴ جمادی الثانیہ ۱۳۹۹ھ / ۱۵ مئی ۱۹۷۹ء کو انھیں شہید کر دیا۔ وہ راہ خدا میں جاں بحق ہو گئے، وہ انقلاب اسد می پر قربان ہو گئے اور زندہ جوانوں کو ستھامت کا خون عطا کر کے، تاریخ کے زندہ، بہادر علماء دین کی صف میں کھڑے ہو گئے ان کی تاریخ پیدائش ۱۳ جمادی الاول ۱۳۳۸ھ / ۲۰ مئی ۱۹۵۲ء تھی۔

ان کی بہت سی یادگاریں ہیں۔ وردے، قوم کے جوں سپاہی ہیں، مدرسے میں مسجد و ممبر سے ہیں ورنہ ان کی منت تحریریں ہیں۔



## کتاب :-

### نظام حقوق زن در اسلام

شہید مرتضیٰ مہرزی رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی ہمت آئینہ ہے۔ ان کا فکری فوق بلند اور روشن تھا۔ ان کے اندازت کا ذریعہ وسیع ورنہ ان کا نصب عین اسلام تھا۔ وہ عقلی و منطقی ہے ورنہ متمدن ہاں میں ہاتھ کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے مجموعے دوران کی کتابوں کے نام دیکھیے، آپ خود سمجھیں گے کہ منفرد معیار اور کس سطح کا رہا ہے۔

تعداد غلبہ شہید مہرزی :-

- نور فسطیہ و روشنیہ ریسم - پانچ جلد -
- ذرات مقابلہ سد و یرن -
- حدیث بھی -
- پیام مہر قی -
- ختم نبوت -
- سیرت نبوی -
- امامت -
- جاذبہ و دفعہ علی -
- حماسہ کربلا -
- قیام و عقاب مہر قی -
- شناخت قرآن -
- تفسیر سورہ حمد و بقرہ - تین جلد -
- سیری در تاریخ اسلام -

- دلا و لایتما -
- بست گنار -
- دہ گنار -
- عدل گرایش بہ مادی گماری
- امداد مادی غیبی در زندگی بشر -
- انسان و سر نوشت -

جہاں بینی اسلامی، بین الاقوامی میں اسلام کی نظر سے متعلق کتابیں :-

- انسان و ایمان -
- جہاں بینی توحیدی -
- وحی و نبوت -
- انسان در قرآن -
- جامعہ و تماریح -
- زندگی جاوید یا حیات خروید -
- کتاب سوزی ایران و مصر -
- انسان کامل -
- عرفان حافظ -
- نہفتہائے سدی و صد سالہ خیر -
- پیرمونی انقلاب اسلامی -
- علوم اسلامی کا تعارف :-
- فقہ و اصول فقہ

● کلام و عرفان

● منطق و فلسفہ

## تعلیم و تربیت :-

● داستانِ راستان -

● منظوم -

● ہمدرد -

● تہمید -

## خواتین کے لیے :-

● اخلاق جنسی -

● مسئلہ حجاب -

● نفاذ حقوقِ زنان در اسلام — اسی کتاب کا ترجمہ آپ پڑھیں گے۔

مرد کی طرح عورت بھی مختلف علوم و فنون میں موضوع بحث ہے، ادب، تاریخ، نفسیات، فزیکس، بیومن سائنس، موشیہ اور قانون میں اس کی ذات اور اس کی حیثیت پر کئی زویدوں سے گفتگو ہے۔ پھر مذہب و ادیان بجا آئے خود ایک باب ہے۔ مشرق و مغرب عورت کی تمیز در دو گاہ ہیں اور دونوں طریقے سے جوئے حاضر بحث ہیں۔ عورت کے حقوق، اسلام میں کیا ہیں، اس کا درجہ اسلام نے کیا بتایا ہے؟ اس کا فرض کیا ہیں؟ اس کے حقوق یعنی قوانین کیا ہیں؟

مسئلہ اول یہ سورت ہوتے ہیں چونکہ مسلمان اپنے دین کو کامل و مکمل سمجھتے ہیں ہذا نہیں بھی جواب دینا چاہیے۔ ابتدائی دور، یعنی زمانہ نزولِ قرآن، عہدِ سنت نبوی،

وردور تمدن و احباب میں یہ سورت اٹھتے تھے اور جواب بھی دیے گئے تھے۔ لیکن زمان و مکان، زبان و بیان کے ساتھ کچھ تبدیلیاں آنے ضروری تھیں۔ کچھ نہ کچھ بات بدلتی ہے نئے حریف کھڑے ہو جاتے ہیں، منطق و استدلال کے نئے مدعی ابھرتے ہیں، سائنس، فزیکس، بیومن سائنس آف، پھر قانون کے شعبے، شخصی قانون، قومی قانون، بین الاقوامی قانون، اس کے بعد قانون، انشراحات قانون، سفارشات جیسی فلسفہ، موٹو گنیاں آج کی باتیں ہیں، مغرب کے سامنے قوموں کی سپر نڈنگلی، اپنی ذات، اپنی تاریخ، اپنی ہندیاں اپنی فکری شکست کا قریب دراصل بارادہ و اختیار بدقیامت یا بڑے سستے دموں بلا وجہ اپنے آپ کو پیچھے کا غلط اقدام ہے۔ آزادی کے بجائے غلامی، زندگی کے بجائے موت، دور موت کے بعد بے نام و نشان رہنے کی تیاری ہے۔ جو بعد مغرب آئے تھے ورنہ سب دور پڑے؟، خود داری، غیرت اور اپنے وجود کے احساس سے دست برداری کے یہ سویرے تھے اہل دانش و پیش کو ایک نظر نہیں بجاتے، سیاسی و سماجی مفکر اس پیش قدمی کو اقدام خودکشی جیسا جہم جانتے ہیں۔

کچھ سرمایہ دار، اپنی شان و شوکت میں سرخاب کا پرگانے کے لیے یورپ کی یا ترک کرتے ہیں وہاں سے آکر یورپ میں تو حریفوں کا پرچار، پھران کے نظام کی وکالت اور پٹنہ کی مٹی مفت کو پیشہ بناتے ہیں۔

بدنام اگر بولے، تو کیا نام نہ ہوگا

دور پہ رزادی یا فکرو نصر کی غلامی کے نتیجے میں مسلمان سوچ، سدھی قانون پر کبھی زبردست حصے ہوتے ہیں کبھی شب خون مارتے ہیں درپردہ پیگندے کی یک مہم یعنی سرد جنگ تیز کر دیتے ہیں؛

عورت کا مرتبہ - عورت کے حقوق - زن و مرد میں مساوت - نکاح، صدق، میراث، پردہ، شہادت و... کے چھوٹے بڑے مسائل پر آؤں گے اٹھانے



مرزا کا فرار۔ جیسے غلامین پر گفتگو آپ کو ملے گی۔

کتاب کا اسلوب اور زبان :-

شبیدہ مہرشی متھری نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور لوگوں کے اعتراضات و سوالات کے جواب لکھے۔ اس بحث و جدل کا میدان "تہران کا مجلہ" - "زین روز" تھا، زیرِ نظر کتاب شبیدہ کے تین مضامین کا مجموعہ ہے۔

فدا نہ، اندھوں - فریڈ - بریڈ رسل - اقوام متحدہ کے منشور میں حقوقِ نسوان کا ذکر نہیں۔

زن و مرد کی مساوات - عورت کا استثناء - عورت سے اس کا گھر چھیننے کا مسئلہ -  
مرد کا جسمی جنون، شادی کے قابل لڑکیاں - شادی کے قابل لڑکے - عائلی ذمہ داری کی

## ترجمہ کیوں؟

اس کتاب کا عربی و انگریزی میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ سی

ضروری تھا کہ باریک دیکھ زبان میں۔ خواتین کا بنیادہ شعریہ کرم ہے۔ ہماری زبان میں  
سدم و رن کے قیامت پر چھ خاصہ ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرے میں خواتین کے مطالعے، تعلیم  
ذہنی نشو و نما و فہم و بصیرت کے مجموعے کی فراوانی ضروری ہے۔

تقدیب سدامی نے خواتین کو نیا کردار دیا ہے۔

تقدیب سدامی نے ان کے، سدامی نظام فکر و عمل کے متعدد نئے پہلو نمایاں  
کیے ہیں۔ ورس میں شہید مطہری کی تعلیم و تربیت و دعوت کا کچھ بھی تھا۔ ہندوستان اور  
دو خون جو ناکوں و سرخیوں کے لیے۔ خصوصاً۔ خواتین کے لیے ان کی زبان میں  
ان کی ضرورت کے لیے ان کے مفاد و معومات اور سدامی نظریات کی توضیح و تفسیر کی  
خاص کتاب ہدیہ کی جا رہی ہے۔

سید مرتضیٰ حسین

صدر ان فاضل

تہران۔ ۷، شوال ۱۳۵۷ھ

مقدمہ

ان :-

شہید مطہری



بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارے عہد کے تقاضے، بہت سے مسائل پر دوبارہ نظر کرنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ یہ مسائل پرانی قدروں کے بجائے نئی قدروں کے طلب گار ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ ہے۔

”خاندانی ذمہ داریاں اور نظام حقوق خواتین“۔

آج فرض کیا جا چکا ہے کہ موجودہ ماحول میں اصل موضوع ہے: ”آزادی نسوان“ اور قانونی مساوات زن و مرد۔ باقی مسائل انہیں دونوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس پر زور دینے کے سبب واصل پر گفتگو آگے ہوگی۔

”نظام حقوق خاندان“ کے ضمن میں ہمارے نقطہ نظر سے اصل بنیادی۔ یا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ”عالمی نظام“، نظام نائے معاشرت میں کوئی جدگانہ نظام ہے؟ اس کا منطقی یا اس کا معیار دوسری منطقوں اور معیاروں سے کسی خصوصیت کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے؟ وہ عقلی دلائل جو معاشرے کے بہت سے اداروں میں کارآمد ہیں، یہاں ان کی حیثیت بدلتی ہے؟ یا اس معاشرتی گروپ میں دوسے گروپوں سے کوئی اختلاف نہیں ہے؟ اس یونٹ میں وہی منطق اور وہی معیار کام آتے ہیں جو دوسرے معاشرتی اداروں میں یونٹ میں بروئے کار ہیں؟

اس پریشانی کی اصل یہ ہے کہ ایک تو اس کے ادارے دور کنی، ”دو جنسی“ ہیں۔ دوسری طرف ولیدین و اولاد کا نسلی تسلسل ہے۔ کارخانہ خلقت نے اس یونٹ کی وضع ”باہمی مشابہت کے فقدان“ اور ”عدم یکسانیت“ پر رکھی ہے۔ ان دونوں کے کیفیات میں

تشریف موجود ہے۔

خاندانی معاشرہ "عربی"۔ باہمی مفاہمت کا موثر ذریعہ ہے۔ ورد و موثراتی  
یونٹوں کی درمیانی کڑی ہے۔ جسے شہید کی مٹی اور مٹی کی جن کے تمام قانون بقاعدے پر ہے  
وہمیت کی بہت سے مہین ہیں۔ ان سے سب سے زیادہ ممکن نہیں۔ اور ایک مفاہمتی معاشرتی یونٹ  
جیسے انسانی مدنی معاشرہ اس میں طبیعی و جہلی پہلو کا دخل کم ہے۔

چند چہرے پر جانتے ہیں۔ ہاتھی بید کے فلسفہ خاندانی فلسفہ نیات کو حکمت عملی کا ایک  
مستقل باب بناتے تھے۔ ورنہ عقیدت تھے کہ س یونٹ کی منصفی و معیار انسانی زندگی کے  
دوسرے شعبوں سے مختلف ہے۔ مذہبوں نے اسے "تہوریت" اور "سٹونے" کتاب پرست  
اور ایسی سینات کتاب شفا میں "مونیو" کو اسی زوے سے دیکھا ہے۔

معاشرے میں "حقوق زن" پر گفتگو میں بھی بعضی طور پر یہ بحث ہے کہ طبیعی و انسانی بہت  
سے مرد و زن کے حقوق یکساں و ہم آہنگ ہیں؟ یا ایک دوسرے الگ الگ و ہم آہنگ  
سے دوسرے؟ یعنی "نہت و نہت" نے جو حقوق انسان کو عطا کیے ہیں وہ حلقہ ایک جنسی ہیں یا دونوں؟  
آیا حقوق و تفریق معاشرے میں۔ "مرد لگی" اور "نوائیت" کا عمل دخل ہے؟ یا کوئی تفریق  
کی منطق میں دونوں طبیعی زاویے سے ایک جنس ہیں؟



مغربی دنیا نے سترھویں صدی عیسوی کے بعد علمی و فلسفی تحریکیں شروع کیں جس کے  
نتیجے میں "حقوق بشر" کے نام سے معاشرتی میدان میں بھی ایک تحریک نے جنم لیا۔ سترھویں  
تھ۔ ویریں صدی میں منکروں و ردیوں نے اپنی فکری اثاثہ غوم میں تقسیم کر کے انسان کے ناقابل  
سلب انتقال فطری حقوق کی بحث غم کر دی۔ اور قبل تعریف محنت کی۔

جان جوک روسو۔ والٹیر۔ مان ٹسکو۔ اسی گروپ کے مفکر و ادیب تھے۔ ان لوگوں  
کا انسانی معاشرے کی تعلیم و تربیت پر حق بھی ہے۔ یہ دعویٰ کرنا ہے کہ انسانی

معاشرے پر ان کا حق ان لوگوں سے کم نہیں جنہوں نے دنیا میں اہم ایجادات و انکشافات کیے ہیں۔  
ان لوگوں کا مرکز خیال یہ تھی کہ انسان فطرتاً اور حقیقت و طبیعت کی بنیاد پر کچھ حقوق  
اور کچھ آزادیاں رکھتا ہے۔ یہ آزادیاں اور یہ حقوق کوئی فرد یا جماعت یا قوم کسی بھی عنوان و  
نام سے کسی فرد یا قوم سے نہ چھین سکتی ہے نہ صاحب حق کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتا  
ہے۔ تمام انسان، حاکم و محکوم، سفید و سیدہ، سرایہ دار و غریب، سب آزادی و حقوق  
انسانی "مساوی" ہیں۔

یہ فکری و معاشرتی تحریک بھری اور اس کے نتائج پہلے انگلستان پھر امریکہ کے بعد  
فرانس میں انقلاب کی صورت میں برآمد ہوئے۔ انقباض آئے، نظام بدست، قرار و دل  
پر دستخط ہوئے پھر دنیا کے دوسرے نقاط پر اس کا اثر پڑنے لگا۔

انسانی حقوق کے فلسفے نے انیسویں صدی میں کچھ نئے فکری زاویے پیدا کیے۔ ان کا  
تعلق اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی مسائل سے تھا۔ ان افکار نے حالات میں مزید تبدیلی  
پیدا کی جس کی ایک شکل ہے سوشلزم۔ مزدور طبقہ کا نفع پرست تھاق۔ سرمایہ داروں  
سے مزدوروں کے حامیوں کو حکومت کا انتقال۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں "انسانی حقوق" پر جو بحث علمی  
اقدامات ہوئے تھے۔ ان میں سے کثیر حکومت کے مقصد میں قوم پرستی کا رخا دار کے  
مقابلے میں محنت کش طبقے سے مربوط تھی۔ بیسویں صدی میں "مردوں کے حقوق" ورن کے  
مقابلے میں "عورتوں کے حقوق" کا مسئلہ تھا۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ عظیم دوم کے بعد جب  
دارلہ قوم متحدہ "قوم و اتوا" میں مساوت حقوق مرد و زن کا کھد منشور شائع کیا۔  
یورپ کے تمام معاشرتی انقلابوں میں۔ سترھویں صدی سے موجودہ صدی تک  
اسی محور دو تھے:

آزادی۔ مساوات۔ اور بس۔ بات اس سے آگے نہیں بڑھی۔ اس کا



کہ تحریک حقوق زن مغرب میں دوسری تحریکوں کے زیر اثر تھی اس کے علاوہ یہ تحریک اس کے مزاج سے موافق نہ تھی، اس وجہ سے اس تحریک میں آزادی اور مساوات کے عنوان کے گے بات نہ بڑھی۔

انقلابی رہنماؤں نے یہ طے کر لیا کہ آزادی نسواں اور اس کے حقوق کی مردوں سے یکسانیت جس کا پرچم سترہویں صدی سے شروع ہوا تھا اسی نکتہ پر ختم ہو گیا۔ انھوں نے کہا جب تک عورت کی آزادی اور اس کے حقوق مرد کے برابر نہیں مانے جاتے۔ آزادی اور حقوق انسانی۔ پر بحث ہے۔ تمام خاندانی مشکلات صرف اس لیے ہیں کہ عورت نہ آزاد ہے نہ اس کے حقوق مرد کے برابر ہیں۔ اس پہلو کو روشن کر دیا جائے تو خاندانی مشکلات حل ہو جائیں گے۔

اس تحریک میں جس کو ہم نے "نظام حقوق خاندان کا بنیادی مسئلہ قرار دیا یعنی آیا فطری طور پر لڑکے کوئی مستقل نظام ہے؟ کیا اس کی منطق اور اس کے معیار دوسرے سماجی اداروں سے جدا ہیں؟ لیکن یہ سوں فکر فلاسفے دور رہے۔ ان کا فکر و نظر کا رخ ایک طرف رہا وہ ہے۔ "اصل آزادی" اور "اصل مساوات" زن و مرد۔

دوسری لفظوں میں، حقوق نسواں کے موضوع بحث کا زاویہ یہ کلیہ رہا۔ "طبعی و فطری حقوق جو چھینے نہیں جاسکتے" اسی مرکز پر سارے دائرے بنتے رہے۔ انسانیت میں عورت مرد کی شریک ہے۔ عورت ایک مکمل و معیاری انسان ہے۔ اس لیے اسے مرد کی طرح ان حقوق سے بہرہ ور ہونا چاہیے جو "فطرت نے انسان کو دیے ہیں" اور وہ چھینے نہیں جاسکتے۔

"طبعی حقوق" کی دریافت کن مصادر سے ہوتی ہے؟ ہم نے اس کتاب کے ابواب و فصول میں نسبتاً کافی و مستفی بحث کی ہے۔ ہم نے ثابت کیا کہ خود طبیعت "طبعی و فطری حقوق" کا حشر و ماخذ ہے۔ یعنی اگر انسان کو ایسے حقوق حاصل ہیں جو گھوڑے

و بکری یا مرغ و ماہی کو حاصل نہیں تو اس کی تہ میں طبیعت و خلقت کا ہاتھ ہے۔ اور اگر تم دمزدہ جمعی حقوق میں مساوی ہیں اور سب کو آزاد زندگی حاصل ہے تو یہ فرزانہ متن خلقت سے صادر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری موجود نہیں ہے۔ مساوات و آزادی کو فطری حق ماننے والے دانشوروں کے پاس بھی صرف یہی دلیل ہے۔ "نظام خاندان کے بنیادی مسئلہ میں بھی طبیعت کے علاوہ کوئی ماخذ و مصدر نہیں۔"

"نظام حقوق خاندان" میں ہم جسے بنیادی مسئلہ مانتے ہیں، اس پر مفکرین کی توجہ نہ ہونے کا سبب کیا ہے؟ آیا موجودہ علوم نے ثابت کر دیا ہے کہ زن و مرد کا اختلاف چند اعضا کا معمولی سا اختلاف ہے؟ اس سے جسمانی ڈھانچے اور ان نفسیات میں کوئی فرق نہیں پڑتا جن سے حقوق تعلق ہے؟ اور اس سے ذمہ داریاں قبول کرنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ موجودہ معاشرتی فلسفے میں اسی وجہ سے کوئی نیا گوشوارہ حساب نہیں کھلتا؟

خاتما معاملہ برعکس ہے۔ حیاتیاتی و نفسیاتی علوم کی ترقی نے جو انکشافات کیے ہیں ان سے دونوں جنسوں کے فرق نمایاں اور بہت زیادہ روشن ہوئے ہیں۔ ماہرین حیاتیات، فیزیولوجی، اور سائیکالوجی جاننے والوں کے تحقیقات کا حوالہ آگے دیا جائے گا۔ حیرت ہے کہ ان باتوں کے باوجود ایک بنیادی مسئلہ زینت حلقہ نسیاں کر دیا گیا۔

اس نفیست و بے توجہی کا شاید یہ سبب ہو کہ تحریک تیزی سے ابھری مند جہاں اس نے عورتوں کی بہت سی بدبختیوں کو دور کیا وہیں کچھ مجبوریاں اور بد نفسیاں اس کو تحفہ میں دیں اور انسانی معاشے کو بھی اس پیٹ میں سے لیا۔ آئندہ ابواب میں مد نظر کیجیے گا کہ یورپ کی عورت بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک معمول اور روزمرہ کے حقوق سے بھی محروم تھی۔ اسی زمانے میں بل مغرب کو مافی افاغیت کا خیال آیا۔

مساوات و آزادی کے نام سے متعدد تحریکیں وجود میں آچکی تھیں، انھیں میں مسئلہ زیر بحث بھی تھا۔ آزادی و مساوات، دو لفظوں سے معجزہ آفرینی کی امید گانے والے سب

مسائل نہیں سے حل کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھول گئے کہ مساوات و آزادی کا رشتہ خود انسان کے بحیثیت انسان کے زاویے سے پیدا ہونے والے تعلقات کا پابند ہے۔ منطقی زبان میں مساوات و آزادی انسانی حق ہے اس حیثیت سے کہ وہ انسان ہے۔ عورت چونکہ ایک حیثیت سے انسان ہے۔ ہندوستان کی طرح آزاد پیدا ہوئی ہے اور مساوی حقوق کی مالک ہے۔ لیکن عورت چند مخصوص کیفیات کی حامل انسان ہے۔ عورت و مرد انسانیت میں برابر ہیں۔ لیکن یہ دو طرح کے انسان ہیں۔ ان کی خصائص دو الگ الگ طرح کی ہیں۔ ان کے نفسیات دو قسم کے ہیں۔ وہ دوئی جغرافیائی، تاریخی یا معاشرتی بنیاد پر نہیں بلکہ ان اس عین تخلیق کے اندر رکھی گئی ہے۔ اس دوئی سے طبیعت کا ایک مقصد وابستہ ہے اور جو عمل طبیعت و فطرت کے خلاف ہوگا اس کے عوارض ناپسندیدہ رونما ہوں گے جس طرح ہم نے آزادی اور انسانوں میں مساوات۔ ان میں سے عورت مرد کا مسئلہ۔ طبیعت کے سرچشمے سے حاصل کیا ہے۔ اسی طرح کیفیتوں کی اکائی یا دوئی میں عورت مرد کے حقوق کا سبق حاصل کرنا ہوگا۔ یونہی خاندانی معاشرہ۔ کم از کم ایک نیم طبیعی چیمبر ہے یا نہیں؟ اس کا جواب بھی طبیعت و فطرت سے پینا چاہیے۔ کم از کم یہ مسئلہ بھی قابل بحث ہے کہ حیوانات کی دو جنسی جن میں سے ایک جنس انسان ہے، اتفاقی عمل ہے یا تخلیقی منصوبہ کا حصہ ہے؟ یا دونوں جنسوں کا تعلق صرف سادہ عضوی اختلاف ہے یا بقول الکسیس کارل انسانی جسم کے سنجینے میں اس کی جنسیت کے علامات موجود ہیں؟ کیا منطق و زبان فطرت میں مرد و زن دونوں کے الگ الگ فرض ہیں یا نہیں؟ کیا حقوق قانون بھی یک جنسی ہیں یا دو جنسی؟ اخلاق و تربیت دو جنسی ہے یا ایک جنسی؟ سزاؤں کے بارے میں کیا رویہ ہے؟ اور ذمہ داریوں اور فرائض کی صورت کیا ہے؟

اس تحریک میں یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ مساوات و آزادی کے علاوہ بھی کچھ مسائل ہیں۔ مساوات و آزادی ایک لازمی شرط ضروری ہے مگر فقط یہی کافی نہیں۔ قانون و

حقوق کی مساوات اپنی جگہ اور دونوں میں مشابہت بھی تو کوئی حقیقت ہے۔ عورت مرد کے حقوق میں برابری و روحانی طور پر ایک بات ہے اور دونوں میں مماثلت اور صورت میں مشابہت دوسری بات ہے۔ اس تحریک میں عمداً یا سہواً "مشابہت" کی جگہ "مساوات" اور "مماثلت" کی جگہ "برابری" کو مان کر ایک بنا دیا گیا۔ "کیفیت" "کیئت" کے تحت شعاع میں آگئی۔ عورت کا ان "ہونا" سے عورت ہونے کو نظر انداز کرنے کا سبب بن گیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس بے توجہی کو فقط ایک ایسی فلسفی غفلت کا ہم نہیں دینا چاہیے جو بحیثیت کی بنا پر ہوئی۔ اس میں دوسرے عوامل بھی تھے جو آزادی اور مساوات زن کے ذیل میں قابل استفادہ تھے۔

اس مہم کے پس پردہ سرمایہ داروں کے منافع بھی کام کر رہے تھے۔ کارخانہ دار جو عورت کو گھر سے کارخانے میں لانا چاہتے تھے۔ وہ اس سے اقتصادی فائدے اٹھانے کی فکر میں تھے۔ ان لوگوں نے نعرہ لگایا۔ عورت کے حقوق۔ عورت کی اقتصادی آزادی۔ عورت کی آزادی۔ مرد و عورت کے حقوق مساوی ہیں۔ ان لوگوں کی بدولت مطالبات نے قانونی صورت اختیار کی۔

ویل ڈیورنٹ "لذت فلسفہ" نویں فصل میں۔ ارسطو، نطشے، شوپن ہاور اور یہودیوں کی مقدس کتابوں سے عورت کے بارے میں حقارت آمیز سرے نقل کرتا اور کہتا ہے۔ انقلاب فرانس میں عورت کی آزادی کا مسئلہ موجود تھا لیکن کوئی عملی تبدیلی نہیں ہوئی۔ نیمویں صدی تک عورت کے پاس ایک قانون تھا جس کی رو سے مرد کو عورت کے قلم کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں عورت کے حالات میں تبدیلی آنے کے سبب و عمل سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے۔

عورت کی آزادی صنعتی انقلاب کی بدولت ہے..... عورتیں، سستی مزدور تھیں۔ کارخانہ دار سرکش اور گراں قیمت مزدوروں پر انھیں



تزیج دیتے تھے۔ ایک صدی پہلے انگلستان میں مردوں کو کام ملنا مشکل تھا۔ لیکن مردوں سے اشتہاروں میں درخواست ہوتی تھی کہ بچوں اور عورتوں کو کارخانوں میں بھیجیں۔ آزادی خواتین کے لیے پہلا قدم ۱۸۸۲ء کا قانون تھا جس نے۔ عظیم برطانیہ۔ کی عورت کو وہ اعزاز دیا جس کی مثال پہلے موجود نہ تھی۔ یعنی عورت جو روپیہ کما لے گی وہ اسے اپنے لیے محفوظ رکھنے کا حق رکھتی ہے۔ اس اعلیٰ اخلاقی قانون کو انگلستان کے مجلس عوام کے کارخانہ والوں نے وضع کیا اور اس طرح انگلستان کی عورتوں کو کارخانوں میں بھیج لیا اس سال سے اب تک جان لیوا محنت کی مزدوری نے ان کو گھر بار کے جھنجٹ سے چھٹکارا دلادیا اور دوکانوں اور کارخانوں میں خون پسینہ بہانے کا عادی بنا دیا۔

مشینی دور کی روز افزوں ترقی، صنعتی پیداوار میں ضرورت سے زیادہ اضافہ پھر مصنوعات استعمال کرنے اور خریدنے والوں کو ہزار افسوں و نیرنگ سے مائل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کی خاطر سمعی بصری، فکری و جذباتی، ذوق و ہنر، فن اور آرٹ حتیٰ کہ جنسی عوامل درکار تھے جو گاہکوں کو بلا ارادہ چیریں خریدنے پر مجبور کریں۔ یہ نئی ضرورت

لے ڈاکٹر علی شایگان: شرح قانون مدنی ایران ملتے میں ہے:

عورت اپنی ملکیت پر جو حق رکھتی ہے اور شیعہ فقہ نے اسے شروع ہی میں تسلیم کیا وہ کچھ عرصہ پہلے اکثر قوانین ممالک میں تسلیم نہیں کیا گیا تھا اس میں یونان۔ روم۔ جرمن۔ بھی داخل ہیں، کہیں اس حق کا نام و نشان نہ تھا۔ یعنی نابالغ، دیوانے اور مجبور و جس کی املاک زیر تحویل حکومت ہو، اس کی صرح اپنی دولت خرچ کرنے کا حق نہ رکھتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے عورت کی شخصیت، شوہر کی ذات میں فنا تھی۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۲ء میں "نکیت زن" کے نام سے دو قانون بنے اور عورت کی ملکیت سے کسٹوڈین ٹپ ختم ہوئی۔

مجبور کر رہی تھی کہ سرمایہ دار عورت کے وجود سے فائدہ اٹھائے۔ اس مرحلے میں عورت کو استعمال کرنے کا انداز کچھ اور تھا۔ اب عورت جسمانی قوت، کام کرنے کی صلاحیت، معمولی کاری گری پیداوار میں مرد کا شریک مساوی کی حیثیت سے نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ اس کی جا ذہنی، مفاد پسندی، کشش، فکر و خیال کو قابو میں لانے کی قوت، اردے بدل دینے کی طاقت و کرامت رہن رکھنے، آبرو بیچ ڈالنے کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کا زویہ سامنے آیا۔ اب پیداوار، صارف کے سر تھوپنے کی بات تھی۔ موٹی سی بات ہے اس کا رد بار کے لیے۔ آزادی اور مساوات مرد و زن۔ کارآمد مہم تھی۔

سیاست بھی اس عامل کو استعمال کرنے سے غافل نہ تھی۔ اخبارات میں روزانہ ایسے قیسے آپ بھی پڑھتے اور دیکھتے ہوں گے۔ یہ سب عورت کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی مہم ہے۔ اور مرد اپنے مختلف مقاصد کے لیے اسے استعمال کر رہے ہیں مگر آزادی و مساوات کے پردے میں۔

ظاہر ہے، بیسویں صدی کا جوان اس قیمتی لمحے سے غافل نہیں۔ شادی کے بارے میں وہ خاندانی رسم و رواج سے فرار کرنا چاہتا تھا اور مفت، کم قیمت، سکا رہا تھو آئے تو اسے خسار دیکھا ہے۔ جوانوں نے عورتوں کی آزادی و مساوات کی خاطر اس کی منظوری اور حقوق ملنے پر سب سے زیادہ مگر مچھ کے آئو بہائے۔ وہ اس جہاد مقدس میں آگے تھا اس کام کے لیے اپنی شادی کو چالیس سال پیچھے ڈھکیل دیا۔ کبھی کبھی تو اس نے مجرور زندگی گزارنے کی ٹھکان لی۔

بے شک ہماری صدی نے عورت سے بد نصیبوں کا ایک طومار واپس لے لیا۔ لیکن یہ بات بھی ضرور ہو گئی کہ اسے نئی بد بختیوں کا تحفہ پیش کیا۔ کیوں؟ آیا عورت باندہ ہے اسے دو میں سے ایک بات ماننا ہوگی؟ یا وہ کسی کی پابند نہیں، اسے اختیار ہے وہ اپنی پرانی بد نصیبیاں بھی دور کر سکتی ہے اور نئی بد بختیوں کو بھی روندنے کا

تخیر رکھتی ہے ؟

حقیقت تو یہ ہے کہ عورت پر کوئی جبر نہیں ہے۔ پرانی بد نصیبیاں تو اس علت سے پیدا ہوئیں کہ عورت کا انسان ہونا بھلا دیا گیا تھا اور نئی بد بختیاں اس سبب پیدا ہوئیں کہ عورت یا سہوؤ۔ اس کا عورت ہونا، اس کی صبی، فطری، ذمہ دار نہ حیثیت، مرکزیت، اندنی تقاضے، خصوصی صلاحیتیں طاق نسیاں پر رکھ دی گئیں۔

عجیب بات ہے، جب مرد و عورت کے فطری اور طبعی اختلاف کی بات چھڑتی ہے تو ایک گروپ سے عورت کے نقائص اور مرد کے امتیازات کا قصہ بے بیجا ہے آخر کار عورت کی محرومیوں اور مرد کی کامرانیوں پر تان ٹوٹتی ہے۔

محرومی و کامرانی، نقص و کمزوری، کارخانہ قدرت نے ایک کو ناقص دوسرے کو کامل، ایک کو کامیاب و کامران دوسرے کو محروم و ناکام نہیں پیدا کیا۔

یہی گروپ اس منطقی و فلسفی مفروضے کے بعد کہتا ہے۔ اچھا، فطرت نے تو عورت پر یہ ظلم ڈھایا، وہ ناقص و کمزور پیدا ہوئی، تو کیا ہم بھی ایک نیا سبب نہیں اور ظلم پر ظلم کا اضافہ کریں؟ اگر عورت کی صبی حالت کو بھلا دیں تو کیا زیادہ انسانی عمل نہیں ہوگا؟

اتفاق معاملہ برعکس ہے، عورت کی فطری و طبعی وضع سے بے توجہی اس کے حقوق پائمال ہونے کا بڑا سبب بنی۔ گرم مرد محاذ لگائے اور عورت سے کہے: ہم تم برابر۔ کام کاج، ذمہ داریاں، فائدے، نتائج، سزائیں سب ملتی جلتی ہوں گی۔ بھاری اور مشکل کاموں میں شریک ہو، برابر کھڑی ہو، اپنی طاقت کے مطابق کام کرو اور اسی کی بنیاد پر مزدوری۔ ہم سے حترم و گنجائش کی توقع نہ رکھو۔ اپنے روزمرہ اخراجات خود مہیا کرو۔ اونا دے کے اخراجات میں اپنا حصہ دو۔ خصرے میں اپنی حفاظت خود کرو۔ ہم تم خرچ

کرتے ہیں تم ہم پر اپنے پیسے خرچ کرو۔ . . . . تو عورت، معرکے میں پھنس جلتے گی کیونکہ اس کی قوت کار کردگی طبعی طور پر کم اور روپے کا خرچ زیادہ ہے۔ ماہواری

دک زمانہ حمل کی بے چینی، وضع حمل کی سختی، ششیر خوار کی دیکھ بھال، عورت کو ایسی صورت میں سے دوچار کرنے والی چیزیں ہیں جہاں اسے مرد کی سربراہی درکار ہوتی۔ ذمہ داریاں، ذمہ دار نہی زیادہ چلتی ہے۔ یہ سب کچھ انسان ہی میں نہیں جوڑے جوڑے زندگی بسر کرنے والے بر جاندار کا معاملہ یہی ہے۔ تمام حیوانات میں غریزہ و فطرت کے زیر اثر وہ کی حمایت کر کے فریضہ ہے وہ مادہ کی حفاظت پر کمر بستہ و مصروف رہتا ہے۔

مرد و زن کی طبعی و فطری ساخت کو سامنے رکھا جائے۔ انسان ہونے میں مساوی سمجھا جائے۔ انسانی حقوق کو مشترک مانا جائے، تو "عورت" کو نہایت مناسب مقام مل سکتا ہے، ایسا مرتبہ جہاں نہ اس کی ذات کچلی جائے نہ اس کی شخصیت کو نقصان پہنچے۔

زن و مرد کی فطری و طبعی حیثیت کو فراموش کرنے، اور صرف آزادی و مساوات پر گفتگو کرنا، نتائج سے آگاہی کے لیے کچھ اخباری جانزویتے ہیں، در یہ جائزہ بھی ان کا جو ہم سے پہلے اس راستے سے گزرے بلکہ منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ دیکھیے وہ کیا کہتے در کیا کہتے ہیں؟

رسالہ "خواندنیہا" شمارہ ۷۹، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، ۰، ۱۹۷۹ء کا شمارہ "شہربانی" کا مقالہ ہے۔ "سرگزشتہای از زنان کارگردار جامعہ امریکا" امریکی معاشرے میں محنت کش عورتوں کی سرگزشت۔ رسالہ کرنٹ کے مضمون کا ترجمہ۔

مقالہ پڑھنے کے قابل ہے، شروع میں ایک خاتون کا درد دل نقل ہے، نینر زن و مرد کی مساوات کا تذکرہ اور ان رعایتوں کا بیان جو گزشتہ زلزلے میں مزدور عورتوں کو دی جاتی تھیں۔ مثلاً:-

۱۔ ہونٹ سے زیادہ وزن نہ اٹھائیں جبکہ مردوں کو یہ رعایت حاصل نہ تھی۔

۲۔ آج عورت اس رعایت سے محروم ہے۔ صوبہ ہالیوڈ و کثاب "جنسز موٹر"۔

عورتوں کی سزا کا مرکز کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ ڈھائی ہزار خواتین یہاں کام کرتی ہیں۔



یہ خاتون ایک بڑے گیس پلانٹ کی دیکھ بھال پر متعین اور کبھی انھیں ایک جھٹی کی صفائی کرنا پڑتی ہے یہ فولادی جھٹی ۲۵ پاؤنڈ کی ہے جسے قوی ہیکل مرد نے ہیٹ کیا ہے۔ خاتون زیر لب کہتی۔ میں اندر سے چوراہا اور باہر سے زخمی ہونے لگی۔ میرا کام تھا کہ ہر لمحہ ایک ہتھوڑا اٹھاؤں جس کا حوالہ پچیس سے پچاس انچ تک اور وزن پچیس پاؤنڈ ہے یہ ہتھوڑا ایک کھٹے میں شکانا پڑتا تھا میرے ہاتھوں پر ہمیشہ دم اور ہڈیوں میں درد رہنے لگا۔

مضمون میں ایک درختوں کا درد دل پر لٹنی دہچھنی کی داستان ہے۔ اس کا شوہر بحریہ میں تھی تھا۔ ایک مرتبہ بحریہ کے افسر علی نے مردانہ ہماز میں کچھ عورتوں کی بھڑک کا اعلان کیا۔... کہتی ہے، ان دنوں بحریہ کے ایک جہاز میں چالیس عورتیں اور چار سو اسی مرد دیوٹی پر بھیجے گئے۔ جب یہ جہاز اپنے پہلے مخطوط سفر سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ قتل کی بیویوں کا خوف دہر سبے جا نہ تھا کیونکہ انھیں تھوڑی سی مدت میں معلوم ہوا کہ یہاں خالی خونی عشق کی داستانیں ہی نہیں بلکہ ہر عورت کئی کئی اشخاص کے ساتھ جنسی آمیزش میں ملوث ہوتی ہے۔

مقالہ نگار لکھتا ہے۔ ”فور میڈ میں آزادی کے بعد بیوہ عورتوں کو عجیب پریشانیوں کا سامنا ہے۔ یہاں قانون کے مطابق ہر بیوہ کو پانچ سو ڈالر تک ٹیکس معاف تھا، ایک ”نچ“ ٹامس لٹاؤ نے اس قانون کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ اور کہا کہ یہ قانون مردوں کے حق میں مداخلت کرتا ہے (اور صرف عورتوں کو رعایت دیتا ہے)۔

آگے لکھتا ہے: ”منر میک ڈنلڈ کے ہاتھوں میں سوزش (جلن) تھی، منر اسٹون (جن کے شوہر قتل تھے) اضطراب اور تشویش سے دوچار ہوتی ہے، صوبہ فلوریڈا میں بیوہ عورتوں پر نقد جرم نہ ہوا ہے۔ اب ہر ایک آزادی کا مزہ چکھے گی۔ بہت لوگوں کے ذہن میں یہ سوال آ رہا ہے کہ خواتین نے جن حقوق سے فائدہ اٹھایا تھا کیا اس سے زیادہ نقصان برداشت نہیں کر رہی ہیں؟ خیر یہ بحث بے فائدہ ہے کیونکہ کھیل شروع

ہو چکا۔ تم شانی اپنی اپنی کرسیاں حاصل کر کے بیٹھ چکے اب کی سڑک ہو ا ہے کہ امریکہ کے آئین کا ستائیسواں ”ترمیم شدہ پیرا گراف“ منظور ہو جس کے مطابق جنسی اختلافات کی ہر برتری خلاف قانون قرار پائیں۔..... اور یوں ان بیانات کی تصدیق ہو جائے جو ہارورڈ یونیورسٹی کے استاد قانون رسکو باؤنڈ نے دیے تھے۔ ”امریکہ میں عورتوں کی آزادی عورت کے قانونی خصوصیات کی بنا پر افسوسناک نتائج کا باعث ہے۔

کیرویلین شمالی کے سینٹر ”جی ایروین“ نے امریکہ کے معاشرتی مطالعے کے بعد تجویز کی تھی..... خاندان سے متعلق قوانین مکمل طور پر بدل دیے جائیں۔ اب مرد کو قانونی طور پر خاندان کے اخراجات کا ذمہ دار نہ ہونا چاہیے۔

یہ رسالہ لکھتا ہے۔ ”منر خاٹم میکڈنلڈ“ کے بقول، ایک خاتون بھاری بوجھ اٹھانے کی وجہ سے سیدان خون کی سکت میں مبتلا ہے۔ ہم اپنی پرانی صورت حال میں واپس جانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مرد عورتوں سے عورتوں کا سوک کریں، مزدور جیسا نہیں۔ آزادی نسوان کے حامیوں کی نظر میں یہ بات بہت معمولی ہو گئی کہ اپنے شاندار ڈرائیونگ روم میں بیٹھ کر کہیں۔ عورت مرد برابر ہیں۔ ان حضرات نے اب تک کارخانوں کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ انھیں خبر نہیں کہ اس ملک کی اکثر مزدور خواتین کارخانوں میں کام کرتے کرتے جان پر کھیل رہی ہیں۔ یہیں یہ برابری نہیں چاہیے، ہم سے مردوں کے کام نہیں ہوتے مرد جسمانی لحاظ سے ہم سے زیادہ مضبوط ہیں۔ اگر یہ سب ہو جائے کہ ہم ان کے مقابلے میں کام کریں اور ہمارے کام کا ان کے کام سے موازنہ ہو، تو ہم اپنی حد تک مستغنی ہیں۔ صوبہ ہائیڈ میں مزدوروں نے قانون تحفظ حقوق سے جو کچھ پایا ہے، اس سے زیادہ کھویا ہے۔ ہم نے اپنی نسوانی شخصیت ضائع کر دی۔ ہمیں آزادی کے بعد نہیں معلوم کہ فائدہ کیا ہوا ہو سکتا ہے۔ گنتی کی چند عورتوں نے بہتر حالات دیکھے ہوں لیکن ہم بہتر حال میں نہیں ہیں۔“

یہ تھا اس مقالہ کا خلاصہ۔ مضمون کے اندراجات سے صاف نظر آتا ہے کہ خواتین کی آزادی و مساوات کے نام سے جن مشکلوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوئیں اس کے نتیجے میں انہیں ان دونوں لفظوں سے چڑھ ہو گئی۔ وہ بھول میں ہیں ان دونوں لفظوں کا گناہ کوئی نہیں۔ زن و مرد، دو الگ الگ اداروں کے دو ستارے ہیں۔ دونوں کو اپنے اپنے مدار اور اپنے اپنے دائروں میں گردش کرنا چاہیے۔

”لا الشمس لیھا ان تدرك القمر.....“ سورج کو حق نہیں کہ چاند پر جا پکڑے اور نہ رات دن سے آگے جاسکتی ہے ہر ایک اپنے اپنے فلک میں گردش کر رہا ہے۔ ”مرد و زن کی اصل سعادت اسی میں ہے کہ وہ انسانی معاشرے میں دو جنس رہ کر اپنے اپنے دائرہ کار میں سفر جاری رکھے۔ آزادی و برابری کا فائدہ اسی وقت حاصل ہوگا جب ہر ایک اپنی فطری و طبعی راہ پر چلتا رہے۔ معاشرے میں خلفشار پیدا ہونے کا سبب فطرت و طبیعت کے فرمان سے سربا ہونا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں۔ ”نظام حقوق خواتین“ انا نڈان اور موشرے میں ہم مدعی ہیں کہ مسئلہ اس کی مسئلہ ہے اور اس پر نئے سے نظر کرنا چاہیے۔ گزشتہ اقدار پر اکتفا نہ کی جائے، از سر نو قدر دریافت ہوں۔ اس بارے میں سب سے پہلے طبیعت و فطرت کو رہنما اصول بنائیں۔ دور کے مرحلے میں گزشتہ دور موجودہ عملیوں کے تلخ و شیرین تجربے سامنے رکھیں ورنہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اس وقت تحریک حقوق خواتین صحیح معنی میں کامیاب نہ ہو پرتگے بڑھ سکے گی۔

قرآن کریم۔ دوست، دشمن دونوں کے نزدیک ”حقوق خواتین“ کا احیا

۱۔ سورہ یسین کی ۱۳۰ ویں آیت ہے: ”لا الشمس یمنی لھا ان تدرك القمر ولا اللیل سابق النہار وکل فی فلک یسبحون“

نے والا۔ مخالفین کم، زکم اتنا تو قرار کرتے ہی ہیں کہ زمانہ نزول میں قرآن نے خواتین کے ”فائدے“ و ”حقوق انسانی“ کے لیے بڑے بڑے قدم کیے۔ لیکن قرآن مجید ”زن“ کے عنوان سے ”احیاء زن“ اور اسے مرد کی شریک نہایت و حقوق انسانی کے نام عورت کے عورت ہونے اور مرد کے مرد ہونے کو طاق نسید کے سپرد نہیں کیا۔ دوسرے لفظوں میں:-

قرآن مجید نے عورت کو اسی زاویے سے دیکھا جو اس کی جبلت و طبیعت کا زاویہ ہے۔ لہذا فرمان قرآن و فرمان طبیعت میں ہم آہنگی ہے۔ قرآن میں جو عورت ہے وہی عورت طبیعت میں ہے۔ اللہ کی یہ دو بڑی کتابیں۔ ایک کتاب تکوین دوسری کتاب تدوین۔ ایک دوسرے پر منطبق ہیں۔

مقالات کے اس سلسلے میں اگر کوئی مفید بات دکھائی دے گی تو وہ اسی سبق و ہم آہنگی کی توضیح ہوگی۔

○  
مختصر ناظرین کے سامنے مقامات کا ایک مجموعہ جو ایک خاص موقع پر درج ہے (مطابق ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء) کے ”رسالہ زن روز“ کے لیے لکھے گئے تھے۔ موضوع تھا ”قانون اسلام میں خواتین“ (زن و حقوق اسلامی)۔ مقالات نے بڑی مقبولیت حاصل کی جن حضرات کو گزشتہ معاملات سے رابطہ نہیں یا اس ماجرے میں موجود نہ تھے۔ ان کو حیرت ہوگی۔ یہ مقالات پہلی مرتبہ اس رسالے میں چھپے تھے! میں نے مقالات کے اس سلسلے کے لیے اس رسالے کو کیسے منتخب کیا؟ وہ رسالہ بھی جس چھاپے کے واسطے کیونکر آمادہ ہوا؟ اس بنا پر ”شان نزول“ مقامات کا بتا دینا ضروری ہے۔

۱۔ ”نور شیدی“ (۱۹۶۳ء) میں ”قوانین مدنی“ کا ”حقوق خانودگی“ تہذیب



وانہا تھا، رسائل کی سطح پر، خصوصاً، خواتین کے رسائل مسئلے کو لے اڑے، چونکہ اکثر تجاویز جوتھے وہ کھم کھلا آیات قرآن کے برعکس تھے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانانِ ایران میں کچھ فتنی دوڑ گئی۔ مرحوم ابراہیم مہدوی زنجانی، حج اس ہنگامے میں سب سے زیادہ خاک اڑا اور گرمی دکھا رہے تھے۔ موصوف نے چالیس نکاتی منشور "تیار کیا، اور مجلہ زن روز" میں شائع کیا۔ مذکورہ رسالے نے جدول وار صفحات میں۔ اس دور کی زبان میں "کوین" بنا کر۔ چھاپا، اور اپنے پڑھنے والوں سے ان نکات پر رائے طلب کی۔ ادھر قانونی منشور لکھنے والے نے مخاف رائے دینے والوں کا جواب لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ انہی دنوں، تہرن کے ایک عالم جلیل و محترم نے مجھے ٹیلیفون کیا ادارہ کی جان وادارہ اطلاعات کے مدیر حضرات سے انھوں نے ملاقات کی اور ان دونوں اداروں سے نکلنے والے زمانے میں جو مضامین چھپے ہیں۔ ان پر اظہار خیال فرمایا۔ دونوں حضرات نے کہا کہ اگر آپ رائے دیں تو ہم سے بعینہ چھاپنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ موصوف محترم نے واقعہ بیان کرنے کے بعد مجھ سے فرمایا کہ اگر وقت اور فرصت اجازت دے تو یہ کام انجام دوں۔ یعنی ہر شمارہ پڑھوں اور ضروری نوٹ لکھوں۔ میں نے کہا کہ اگر میری بات پر اسے میں جوابی حاشیہ نہ لکھا جائے تو میں تیار ہوں لیکن جناب مہدوی نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ رسالہ "زن روز" میں اپنے چالیس نکات کی حمایت کے سلسلے میں اسی رسالے کے لیے مقالات لکھیں گے، میں بھی تیار ہوں کہ اسی مجلہ میں مقابل کے صفحے پر بحث کروں یوں دونوں نظریوں کے دلائل افکار عوام کے سامنے آجائیں گے۔

موصوف مکرم نے کچھ دن کی مہلت مانگی، وہ ان لوگوں سے دوبارہ رابطہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد مجھے ٹیلیفون پر رسالے کی طرف سے میری پیش کش منظور ہونے سے مطلع فرمایا۔ اس واقعے کے بعد میں اس رسالے کو خط لکھا جس میں

"قوانین مدنی" جہاں تک فقہ اسلام کے مطابق ہوں گے میں ان کا دفاع کروں گا مگر میرے جناب مہدوی کے مقالات آمنے سامنے اور برابر برابر اسی رسالہ میں شائع ہوں۔ ضمنی نوٹ پر یہ بھی لکھا تھا کہ اگر مجلہ کو میری تجویز منظور ہے تو میرا اصل خط مع غلامت منظوری سے میں شائع کر دوں۔ رسالے نے یہ بات منظور کر لی اور متین خط شمارہ ۸۷، مگر یہ نمبر ۸۷ میں شائع ہو گیا۔

مطالعات کے دوران "حقوق زن" پر مہدوی صاحب کی کتاب پڑھ چکا اور ان کی منتیق و نظائریے باخبر تھا۔ اس کے علاوہ مجھے بذاتہ "اسلام میں عورت کے حقوق" کے موضوع سے گہری دل چسپی تھی اور بہت سی یادداشتیں کچھ رکھی تھیں۔ مہدوی صاحب کے مقالات اور یہ مقالات آمنے سامنے چھپنے لگے۔ ظاہر ہے میں نے بات و بیش شروع کی جہاں سے موصوف نے بات چھپیری تھی۔ ان مقالات کے سلسلے میں موصوف کو سخت مشکل میں ڈال دیا۔ ابھی چھ ہفتے سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا اور جو آویسی سے فراغت مل گئی۔ ان چھ ہفتوں میں یہ مقالات اپنی زہ نکاں چکے تھے۔ دل چسپی رکھنے والے حضرات نے مجھ سے اور مجلہ سے مقالات کے تسلسل کو برہ راست جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔ اور میں اس خیال سے متفق ہو گیا۔ اور تینیس قسطوں تک یہ سلسلہ جاری رہا ان مقالوں کی تحریر کا یہ پس منظر تھا۔

میرے پیش نظر مسائل تھے ان میں سے کچھ مباحث ان تینیس مقالوں میں لکھے گئے۔ ان سے زیادہ متعلق لکھنا باقی ہیں۔ لیکن میں اپنی تھکن اور مصروفیات کی بنا پر انہیں لکھنے کا مناسب کرنے سے رکھا۔ اور دلچسپی رکھنے والے حضرات کا مطالبہ اس وقت سے

اب تک ہی رہا کہ انہیں دوبارہ کتابی صورت میں چھاپا جائے۔ میں وقت کا منتظر تھا کہ اس کام کو مکمل طور پر "سدم" میں عورت کے حقوق کے نام کیجا چھپواؤں، لہذا مکرر اشاعت پر تیار نہ ہوا۔ آخر کار جب یہ محسوس ہوا کہ اب مجھ سے خود مجھے یہ امید رکھنا نہیں تو جو کچھ موجود تھا، اسی کو کافی سمجھا۔

سلاوا ریفارٹ میں جو مکمل زیر بحث آئے ہیں ان کی سرخیال :-

نوشتر گری (منگنی) - ازدواج موقت (متعہ) - عورت اور معاشرتی استقلال اسلام اور زندگی میں جدیدیت - قرآن میں عورت کا درجہ - حیثیت و حقوق انسانی - خاندانی حقوق کی صیغی بنیادیں - زن و مرد میں فرق - مہر و نفقہ - میراث - طلاق - تعدد ازواج -

جو مکمل رہ گئے اور یادداشتیں تیار ہیں :

خاندان میں مرد کا حق حکومت - حق پرورش اولاد - عذہ اور اس کا فلسفہ - عورت اور اجمہاد و فتویٰ - عورت اور سیاست - عورت عدالتی ضوابط - عورت اور سزا کے دستور - عورت کے اخلاق و تربیت - عورت کا لباس - جنسی اخلاق - غیرت - عفت - جہاد وغیرہ - ماں کے مراتب - عورت اور باہر کے کام کا ج نینر دوسرے مواد -

اگر خدا نے توفیق غایت فرمائی تو یہ حصہ بھی جمع و تدوین کے بعد جلد دوم کی صورت میں پچھے اور شائع ہوگا -

میں اللہ سے توفیق و ہدایت کی دعا کرتا ہوں -

۲۸ شہریور - ماہ ۱۳۵۳ ہجری شمسی

مصدق ۲۰ رمضان مبارک ۱۳۵۳ ہجری قمری

(۱۵ ستمبر ۱۹۳۵ء)

مرتضیٰ مطہری

## پیش گفتار :-

● — عائلی روابط کے بین الاقوامی مشکلات

● — آزاد رہیں یا مغرب کی تقلید کریں -

● — تاریخ کا جبر -

● — ایرانی معاشرے میں مذہبی رجحانات -

خلاصہ از مؤلف



مجھے خوشی ہے۔ رسالہ "زین روز" نے میری خواہش قبول کی اور سالے میں شائع شدہ، عدالتی قوانین کے بارے میں چالیس نکاتی منشور پر میرے ان مقالات کو شائع کرے گا جو "قانون مدنی ایران" میں ترمیم و ترمیم سے مربوط ہیں۔ میں نے ایک خط میں اپنی آمادگی کی جو شرط لکھی تھی، رسالے نے خط کی اشاعت کے ساتھ اسے منظور کر لیا ہے۔

میں یہ موقع غنیمت سمجھتا ہوں، اس طرح میں اسلام کے فلسفہ معاشرہ کا ایک گوشہ جوانوں کے سامنے لاؤں اور ان کے ذہن میں یہ بات واضح کروں کہ اسلام خاندانی (عائلی) روابط کے مسائل پر کیا روشنی ڈالتا ہے۔

میں نے اپنے خط میں یاد دلایا ہے، میں "قانون مدنی" کا دفاع کرنا نہیں چاہتا نہ یہ کہنے کے وہ قانون جامع و کامل و مکمل اور سو فی صد قانون اسلام اور صحیح معاشرتی اقدار کے مطابق ہے۔ بلکہ مجھے بھی اس پر اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ نیز میں اپنے عوامی اکثریت کا رویہ بھی صحیح و مطابق انصاف نہ جاننے کی بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ان باتوں کے برخلاف خاندانی تعلقات میں بد نظمی و سبکی بہر حال دیکھ رہا ہوں، اور اس سلسلے میں اس کی اصلاحات کا قائل ہوں۔

"کتاب اتقا و برقوانین اساسی و مدنی" اور "پیمان مقدس یا میثاق ازدواج"

۱۔ منوچہریز، بانو مہرنگیز۔ "اتقا و برقوانین اساسی و مدنی، ایران"۔

۲۔ زنجانی، ہریم ہمدوی۔ "پیمان مقدس یا میثاق ازدواج"

نام بتاتا ہے کہ مصنف عیسائی فکر سے متاثر ہے اور اسلام کے فلسفہ کو نظر انداز کر رہا ہے۔

جیسے مصنف کی طرح ایرانی مردوں کو سو فی صدی بری نہیں سمجھتا، نہ ساری قانون مدنی کے ذمے لگاتا ہو، نہ اس میں اصلاح کی ضرورت ہے، قانون مدنی کے دفاع کی ممکن تبدیلیاں میرے نزدیک قانون مدنی، فقہ مذہم کے زیر ہونا کوئی عیب ہے۔ اور یہ صحیح ہے کہ قانون مدنی کے دفعات کی تبدیلی کے مدوہ صدر کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ میں تو نہیں اسلام کے ان دفعات پر گفتگو کروں گا جس کا معنی "مقوق زن و شوہر" ہے اور ان کے روابط یا اولاد یا باہر کے افراد سے تعلقات پر اثر تو لوں گا۔ جہاں جہاں اشارہ کیا اور ان کی تبدیلی کی تجویز رکھی گئی ہے میں ایک مسئلے کے ان مقالات میں زیر بحث لاکر ثابت کروں گا کہ یہ قوانین گہری نظر ڈالنے سے فیصلہ کی طبیعتی و معاشرتی تقاضوں کے مطابق ہیں اور عورت و مرد کی حیثیت اور انسانی حریت کا ان میں سجاد رکھا گیا ہے۔ اگر ان پر عمل کیا جائے اور اچھی طرح افذ کیے جائیں تو خاندانی روابط میں خوبیوں کے ضامن ہیں۔

محترم پڑھنے والوں کی اجازت سے بحث میں داخل ہونے سے پہلے چند نکتے پیش

رہیں گے:-

## عائلی روابط کے

## بین انسانی تعلقات کی مشکلات

خاندانی اور عائلی تعلقات کی مشکلات کا حل انسانی نہیں

ہے کہ جیسے آج کل رُکے رُکے یوں کو سونامی دے دیتے

ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ ایسے سمینار منعقد کیے جائیں جو ہم روز نہ دیکھتے سنتے رہتے ہیں

اور ان کی فکری صحیح معلوم ہے۔ پھر یہ کہ ان مسائل کا حل ہمارے ہی ملک کا کام نہیں ہے

بلکہ اس کا بھی حل نہیں کر سکتے ہیں، نہ کسی تحقیقی حل کا کسی نے دعویٰ کیا ہے۔

میں "ڈیورنٹ" تاریخ تمدن پر مشہور فلسفی و مصنف کہتا ہے: فرض کریں ہم

۱۔ "زین روز" میں کیوں کیا جائے۔ مترجم۔

ہیں ہیں۔ درعلوم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ربع اول تک بڑا واقعہ کیا ہوا تھا؟  
 اس وقت میں اندازہ ہوگا کہ وہ واقعہ جنگ یا انقلاب روس نہیں، بلکہ بڑا واقعہ خواتین کی زندگی  
 میں تبدیلی ہے۔ ایسا جتنک لگے والا واقعہ اور وہ بھی مختصر سی مدت میں تاریخ نے بہت  
 کم دیکھ ہوگا۔ ہمارے مقدس گھر جو ہمارے معاشرتی نظم و ترتیب کا بنیادی پتھر تھا  
 درمہ برہم ہو گیا۔ یہاں بیوی کا وہ رویہ نہ رہا جو ہوس رانی و رانی ہیت کی تبدیلی کے لیے  
 رکاوٹ تھا۔ وہ پیچیدہ اخلاقی ضابطے ختم ہو گئے جنہوں نے ہمیں جنگی زندگی سے تمدن  
 و ادب معاشرت سے آگاہ کیا تھا۔ اور اب کھلم کھلا ہم اس خدق کو چھوڑ کر ابے عالم  
 میں منتقل ہو چکے ہیں۔ یہاں زندگی کی صورت و شکل اور فکر و ذہن سب کچھ ایک شکنجہ  
 میں ہے۔

خاندانی نظم و نسق کی برادری، ازدواجی رشتہ کی کمزوری، جوانوں کا شادی کے بوجھ  
 اٹھانے سے فرار۔ مادری رشتے سے نفرت۔ اولاد سے ماں باپ کے رابطے کی نا استواری  
 خصوصاً مادری تعلق کے نقطہ عروج، آج کی عورت کا شرافت سے دست بردار ہو کر گھٹیا قسم  
 کی عشق بازی پر ترسنا۔ روز افزوں شلاق کا زور، میاں بیوی میں خلوص و محبت کی کمی  
 اس صدی کے ہماری ربع میں بڑے زور و شور کے ہنگامے اور فریادیں سنائی دے  
 رہی ہیں۔

آزاد رہیں  
 یا مغرب کی تقلید کریں!

افسوس کی بات ہے۔ کچھ بے خبر لوگوں نے  
 یہ سمجھ رکھا ہے کہ گھریلو زندگی کے مسائل آج ہی ہیں  
 جیسے میکسی بس، ٹریفک کنٹرول، وائپرپ

بجلی کی کٹ کا کام، مدت ہوئی یورپ میں ختم و آسان ہو چکا ہے اسی صرح یہ مسائل بھی  
 ہماری نالائقی کی وجہ سے حل نہیں ہوئے۔ ہیں یورپ کی تقلید و پیروی کر لینا چاہیے۔

در اصل یہ فیہم خیالی ہے۔ یورپ و اس کے ان مسائل میں زیادہ مجبور، زیادہ جکڑے ہوئے  
 ان کے سمجھ و ادراک کی طرح سے چنچ رہے ہیں، تعلیم و نسوان کے مسائل سے کر  
 در مدت میں ان مغرب کی پریشیاں ہم سے کہیں زیادہ ہیں، اور گھریلو خوش نصیبی  
 ان میں غیب ہی نہیں ہے۔

### تاریخی جبر

کچھ لوگ سمجھتے ہیں، گھریلو زندگی میں بدظمی و کمزوری اور اندرونی  
 بددلتی کا باعث عورت کی آزادی ہے، اور خواتین کی آزادی نتیجہ ہے، عدم تمدن  
 و ترقی، اور صنعتی ترقی کا۔ یہ ایک تاریخی جبر ہے جسے برواشت کرنا پڑے گا۔ بد نظمی  
 و برے زمانے کی خاندانی خوش حالی سے رخ موڑنے پر تیار ہونا چاہیے۔  
 اگر ہماری یہ سوچ ہے تو بڑی سطحی اور گھٹیا سوچ ہے۔ ٹھیک ہے صنعتی زندگی ہر  
 حقیقت پر اثر انداز ہوئی ہے اور یہ اثر پڑتا رہے گا۔ لیکن یورپ کے اندر خاندانی  
 زندگی ٹوٹ پھوٹ میں دو اور چیزوں کا دخل ہے۔

ایک وہ رسم و رواج جو ظالمانہ قانون اور جاہلانہ ضابطوں کے طور پر اس  
 صدی کے پہلے ان کے یہاں رائج تھے، اور انھیں با مادستی حاصل تھی، جدید ہے کہ عورت  
 کی مزید مکتبت کے حق سے انیسویں صدی یا بیسویں صدی کے اوائل میں بہرہ مند  
 ہوئی یورپ میں اسے مالک ماننے کا زمانہ اب آیا۔

دوسری بات اصلاح احوال کی ہے۔ جو لوگ خواتین کے مسائل میں بہتری  
 کے لیے تھے وہ ایسی راہ چلے جو آج کل ہمارے روشن خیالوں نے اختیار کر رکھی  
 ہے۔ اس کا نمونہ چائیس نکاتی قانونی منشور یا مسودہ ہے۔ یہ لوگ قانون کی



بھویں بنانے سنوارنے اٹھے اور اس کی آنکھیں پھوڑ بیٹھے۔

مشیختی زندگی کی ذمہ داری سے زیادہ ذمہ داری اور اس تباہی بربادی کا بوجھ یورپ کے پرانے قوانین اور پھر جدیدیت پرست لوگوں پر ہے جنہوں نے نئے اصولاں کا ڈھونگ چاہا۔ لہذا مشرق کے رہنے والوں کو اس کی ضرورت ہی نہیں کہ ہم بھی اسی راستے پر چلیں جو وہ وہیں چکے ہیں اور جس دلدل میں وہ پھنسے ہم بھی پھنسیں۔ ہمیں یورپی زندگی کا مخالف بری پوشیداری سے کرنا چاہیے۔ علوم صنعت تکنیک اور معاشیاتی ضابطے جو بھی قابل تہذیب ہوں، انہیں فوراً دیکھیں۔ انہیں قبول کرنے، ان کی تقلید کرنے اور ان کے رسم و رواج اور قانون قاعدوں کو اپنانے میں ان ہزاروں ہذیبیوں پر بھی نظر رکھیں جسے اہل یورپ دوچار ہیں۔ خود قانون مدنی ایران، اور گھریلو تعلقا پر یورپ کے قوانین کا انطباق بھی قابل احتیاط ہے، ہم کو اہل یورپ کی تقلید سے بہت احتیاط کرنا چاہیے۔

اساسی قانون اور ہم

۲۔ اس سے قطع نظر کہ یہ تجاویز فائدہ مند نہیں، اور نفیاتی، غیبی و معاشی تقاضوں سے ان کا جوڑ بھی نہیں۔ تفصیل آگے لکھیں گے۔ خود اساسی قانون کے ان کی تطبیق کیسے ہوگی؟ دستور میں تو یہ ہے کہ جو قانون شریعتِ اسلام کے خلاف ہوگا اسے "قانونیت" ہی حاصل نہ ہوگی۔ وہ اسمبلی میں پیش ہی نہیں ہو سکتا۔ اور ان تجاویز کے اکثر دفعات، واضح طور پر مخالف قانونِ اسلام ہیں۔ کیا مغرب کے باشندے اسی طرح اپنے آئین سے کھیلتے ہیں جیسے ہمارے مغرب زدہ ان کی مذہبی تقلید میں ان کے پیچھے دوڑ لگانا چاہتے ہیں؟

مذہب سے قطع نظر ہر ملک کا قانون اساسی اس ملک والوں کے لیے مقدس ہوتا ہے۔ ایران کا قانون اساسی بھی ہم ملت ایران کے لیے قابل احترام ہے۔

مذہب و دنیا، سوانح مولیٰ کی اشاعت، اور اسمبلی کے ممبروں کی اٹھک بیٹھک سے ان ساری کوریورنڈا جاسکتا ہے؟

## ہم انی معاش کے مذہبی رجحانات

۳۔ تجویزوں کے عیوب و رن کی قانون اساسی کے خلاف ہونے کو نظر انداز کرنے کے بعد، ہر چیز کا نکار ممکن ہے مگر یہ بات جھٹلاتی نہیں جاسکتی کہ ملت ایران پر جس حجاب و سانس کا قبضہ حکومت ہے ان میں سے سب سے بڑا جذبہ مذہبیت اسلامی ہے۔ ان بعد و دسے چند کو چھوڑیے جنہوں نے سب کچھ چھوڑ رکھا ہے۔ ہر چیز کی پابندی سے آزاد اور ہر شور و شر کے طرفدار ہیں۔ ہمارے عوام کی اکثریت مذہبی اصولوں پر پابند ہے۔

پیش بندی کے باوجود، تعلیم اور تعلیم یافتگی سے یہ نہ ہو سکا کہ وہ عوام اور اسلام کو الگ الگ کر دے۔ اس کے برعکس مجمع قسم کی مذہبی تبلیغ کمزور ہونے کے باوجود کابھوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ جوان مذہب کی طرف دن بہ دن زیادہ مائل ہو رہے ہیں۔ حالانکہ استعماری طاقتیں مذہب کے خلاف زیادہ سیڑھیں دیو گنڈے میں مصروف ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس قسم کے نفیاتی ماحول میں۔ جو بہر حال بن چکا ہے۔ کیسے مزید ان کو کا کہ رائج الوقت قانون ایسا بنایا جائے جو عوام کے نزدیک شریعتِ اسلام سے مطابقت نہ رکھتا ہو؟ ایسے سوال، اسے کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے؟ غرض کریں، غصے اور اختلاف کے نتیجے میں ایک عورت عدالت سے رجوع کرے تو ہر کی رضا کے برعکس طلاق حاصل کر لیتی ہے۔ اور کسی دوسرے کے عقد میں جاتی ہے۔ رائج قانون کے مطابق وہ میاں بیوی کہلاتے ہیں، مگر ان کے

مذہبی وجدان کی گہرائی کو بھی دیکھیے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو غیر سمجھتے۔ وہ جنسی عمل کو غیر شرعی جانتے اور اپنی اولاد کو زنا زودہ اور مذہبی نقطہ نظر سے گردن زنی فرض کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں ذرا غور تو کریں کس قدر سنگین اور نفسیاتی سی خط سے پریشان کن شکل میں وہ گرفتار ہوں گے۔ ان کے مذہبی دوست اور رشتے دار انھیں کس نظر سے دیکھیں گے؟ ہم وضع و قانون سازی کے ذریعہ لوگوں کے مذہبی احساسات کو نہیں بدل سکتے۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے کثرت بلکہ قریب قریب سب ہی لوگ مذہبی احساسات سے مشروط و متاثر ہیں۔

گر آپ بیرون ملک سے کسی ماہر کو بلا کر مشورہ کریں، ان سے پوچھیں کہ ہم اس قسم کے قوانین وضع کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمارے عوام کا مذہبی ماحول یہ ہے۔ اور ان کے نفیٰ یہ ہیں۔ پھر دیکھیے وہ ایسے ماحول میں آپ کے حق میں رائے دیتا ہے؟ وہ یہ نہ کہے گا کہ اس اقدام ہزاروں روحانی اور سماجی پریشانیوں پیدا کرنے کا سبب ہوگا؟

اس قسم کے قوانین کا، قوانین سزا سے مقابلہ غلط ہے۔ اس کے نتائج بہت برے نکلیں گے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قوانین سزا کی ترمیم منہج سے علاج کا ایک حصہ تھا۔ اور اسی پر چوٹ پڑتی ہے۔ منحرف گروہ جبری ہو جاتا ہے۔ لیکن "میاں بیوی کے رشتے" اور ولادت کی نجی زندگی سے متعلق قوانین کی نوعیت یہ نہیں۔ اس سے فرد اور افراد کی نجی زندگی کا تعلق ہے۔ یہ بات براہ راست آدمی کے شخصی مذہبی جذبے سے جنگ ہے۔ اس طرح کے قانون یا اس لیے بے اثر ہو جائیں گے کہ مذہب مذہبی رجحانات کا غلبہ ہے۔ یا خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے ان قوانین سے بدامنی پیدا ہوگی۔ پھر یہ تو یہ قانون عملاً بے کار ہو جائیں گے یا اندرونی وجدانی و نفسیاتی انکسار کے بعد مذہبی طاقت کو کمزور بنا دیں گے۔

## آغاز کتاب

### پہلا حصہ:

## خواستگاری

- کیا مرد کی طرف سے خواستگاری، عورت کی توہین ہے؟
  - مرد کی فطرت، طلبہ نیاز۔ عورت کی فطرت جلوہ و ناز ہے۔
  - مرد خریدار و سال ہے۔ عورت کا خریدار نہیں ہے۔
  - حیثیت و احترام خواتین کے تحفظ کا دانشمندانہ اور نفس طریقہ منگنی ہے۔
  - قانون مدنی کے چالیس نکات کے مستفاد کی غلط فہمی۔
- خلاصہ از مولف —



دفعہ مذکور باوجودیکہ کوئی پابندی بیان نہیں کی گئی ہے۔ لیکن ”ازدواج“ کے معنی جوتے ہیں، مرد کا ”عورت لینا“ مرد خریدار و مشتری کی حیثیت پر اور اس کے مقابل عورت کو ایک ”سودا“ ظاہر کیا ہے۔ مدشرقی قوانین میں ایسی تعبیر تہائی ناگوار اور برے تاثرات پیدا کرتی ہے۔ قانون <sup>نظام</sup> میں زن و مرد کے تعلقات پر خاص طور سے برا اثر ڈالتی ہے۔ اس میں مرد کو ”آقائی“ اور مالکیت، عورت کو مملوک یا کنیز کا درجہ دیا گیا ہے۔

س گہری نفسیاتی نظر کے بعد! تجاویز کے مرتبہ سے "خواستگاری کے ذیل  
ن جو دفعات لکھے ہیں۔ ان میں "خواستگاری" کو خواتین اور مردوں کے لیے یکساں  
قرار دیا ہے۔ تاکہ "عورت لینا" جو ایک طرفہ بات ہے اسے ختم کر دیں۔ "زن گرفتار"  
کے مقابلے میں "مرد گرفتار" بھی ہونا چاہیے۔ یا پھر نہ "عورت لینا" کہہ جائے نہ "مرد  
لینا"۔ اچھا، اگر "عورت لینا" کہیں، یا لڑکی کا رشتہ مانگنا مرد کا فریضہ قرار دیں تو  
یہ عورت کی حیثیت گرا دی، اور اسے قابل خرید و سود بنا دیا۔

اتفاقاً بڑی غلط فہمیوں میں سے ایک غلط فہمی یہ بھی ہے۔ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ زیرِ نظر

نکاح ویز میں "مہر و نفقہ" کو ختم کر دیا گیا ہے۔ مہر و نفقہ پر تم نفیس سے بحث کریں گے۔  
عہد قدیم سے مرد، عورت کے گھر جاتے اور لڑکی کا رشتہ مانگتے ہیں۔ یہ رسم  
ثبیت و محترم عورت کا بہت بڑا سبب۔ فطرت نے مرد کو صلب و عشق و تقاضا کا  
منظر بنایا اور عورت کو مصلوب و مدعا، اور معشوق۔ عورت کو فطرت نے گل۔  
مرد کو بلبل، عورت کو شمع، مرد کو پروانہ پیدا کیا۔ یہ حکیمانہ تدبیر اور خلقت کا شاہکار ہے۔  
مرد کی طبیعت (غریزے) میں طلب و نیاز، اور عورت کے غریزے میں جنود و ناز

ہم نئی گفتگو کا آغاز "پالیس" نکات میں اسی نقطے سے کر رہے ہیں جو اس پیش نہاد میں حرفِ آغاز ہے، "قانونِ مدنی" کی ترتیب کے مطابق پہلی بات سے منگنی اور نام زدگی۔

باوجودیکہ قانونِ مدنی میں خواستگاری (منگنی) اور نام زدگی کا تذکرہ ہے لیکن چونکہ اس کا تعلق برہ رست اسلام سے نہیں ہے، یعنی "نص" اور صریح حکمِ اسلام اس سے مربوط نہیں ہیں پہنچا ہے اور قانونِ مدنی نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ اسلام کے قواعد کلیہ سے ایک استنباطِ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش ہے۔ اس بنا پر ہم "قانونِ مدنی" کے دفاع کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ہم تجویزیں پیش کرنے والے کے جزئیاتِ نظر سے بحث میں حصہ نہیں لیں گے حالانکہ تجویز کنندہ اس بارے میں بڑی بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ موصوف چند سادہ دفعات کے صحیح مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔

ہاں، دو مقصد ایسے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

کا بیان ہے :

”ہمارے قانون ساز نے موجودہ دفعات درخواست نگاری و نامزدگی میں بھی اپنے رجعت و غیر نسانی نکتے کو نہیں بھولا کہ مرد و اصل ہے اور عورت اس کی ضمن۔ اسی خیال کے زیر اثر دفعہ نمبر ۱۰۳۲ کو کتاب نکاح و طلاق میں ”پہلی دفعہ قرار دیا اور یوں لکھا ہے۔“ دفعہ ۱۰۳۲ موانع نکاح سے خالی عورت کی درخواست نگاری ہو سکتی ہے۔“ آپ نے ملاحظہ فرمایا بموجب

قراردیا۔ عورت کی جسمانی کمزوری، مرد کی قوت جسمانی کے اس پہلو سے ہموار کر دی۔  
عورت کا مرد کے پیچھے دوڑنا اس کے وقار و شخصیت کے خلاف ہے۔ مرد کسی عورت  
کے بارے میں منگنی کو جائے اور لڑکی والے رشتہ ٹھکرا دیں تو مرد برداشت کر سکتا ہے  
وہ دوسرے گھر وروہاں سے تیسرے گھر جا کر درخواست کر سکتا ہے تا آنکہ اس کی درخواست  
قبول ہو۔ اور کوئی خاتون اس کی رفیق زندگی بننے پر تیار ہو۔ عورت جو محبوب و معشوق  
بن کر رہتی ہو اور مرد کے دل میں جگہ حاصل کر کے مرد کے پورے وجود پر حکومت  
کرتی ہے اس عورت کی فطرت میں یہ نہیں ہے کہ ایک مرد سے شادی کی درخواست  
کرے ورنہ اتفاقاً کسی میں جواب سن کر دوسرے مرد کے سرخ میں نکلے۔

مشہور امریکی فلسفی "وینیم ہینر" کے خیال میں: حیا اور حسین خود داری عورت کی فطرت  
میں نہیں ہے۔ جو کئی بیباں پورے تاریخ سے یہ سیکھتی رہی ہیں کہ مردوں کے پیچھے نہ  
دوڑنے میں ان کی عزت و احترام ہے، وہ اپنے تئیں نہ گرائیں اور مردوں کی دسترس  
سے دور رہیں۔ خواتین نے تاریخ سے یہ سبق سیکھا اور اپنی بیٹیوں کو یاد کرایا۔  
جنس انسان کی خصوصیت نہیں، دوسرے جانوروں کا رویہ بھی یہی ہے۔ نر  
کی جنس پابند ہے کہ وہ جنس مادہ کے لیے نیاز و دیوانگی کا اظہار کرے۔ جنس مادہ کو  
فطرت نے پابند کیا ہے وہ اپنے حسن، دل کشی، لطف اور خود داری اور ہر لطف  
بے نیازی کا اظہار کرے، اور سخت دل ہم جنس کو جتنا زیادہ ہو سکے، اپنے قابو میں لے  
تا کہ وہ قلبی جذبات اور اپنے ارادہ و اختیار سے خدمت گزاری کے لیے تیار ہو۔

## مرد خریدار وصال ہے عورت کا خریدار نہیں

تجربہ ہے۔ فرماتے ہیں:۔ قانون مدنی نے  
ایسا ہیچ کیوں اختیار کیا جس سے یہ معلوم ہو کہ مرد

عورت کا خریدار ہے؟۔ پہلے تو اس کا تعلق قانون مدنی سے ہے نہیں۔ یہ تو قانونِ نجی

متعلق بات ہے۔ دوسرے ہر خریداری، چیزوں کی مالکیت و ملکیت ہی کے لیے ہو  
نہ ہر دوسرے ہنرور کا خریدار ہوتا ہے۔ کیا اس کی تعبیر ملکیت سے ہو سکتی ہے؟  
مسل کا نام مالکیت رکھا جائے؟ اور عالم و صاحب فن کی حیثیت کے خلاف قرار دیں؟  
روصاں زن کا خریدار ہے۔ اس کی ذات کا کابک نہیں ہے۔ کیا سچ محی آپ حافض شیریں  
تھیں، حافظ کو، اہانت جنس خواتین کا مجرم سمجھتے ہیں؟ وہ کہتا ہے:

شیراز معدن لب عمل است و کان حسن  
من جوہری نفس زباں روشوشم  
شہریت پر کرشمہ و خوبان ز شش بہت

چیز غم نیت ورنہ خریدار ہر ششم  
شیراز خزانہ لب لعلیں اور مرکز حسن ہے، وہ خود شیراز کا جوہری ہے، مگر نفسی  
نہ بیا پر تشویش ہے کہ شہر کی شش بہت میں حسین ہیں اور ناز و انداز۔ بٹے، اس کے  
کچھ نہیں ورنہ وہ چھ کی چھ تھیں خرید لیتا۔ حافظ کو حسرت ہے، اس کے ہاتھ خالی ہیں  
ورنہ وہ سب کچھ مینوں پر قربان کر دیتا، ان کی نگاہ التفات حاصل کر لیتا۔ یہ مرتبہ تشویش  
ی تو بین ہے؟ یا زندہ و جذبات دل میں عورت کے بندی مرتبہ کا اظہار؟ کہ مرد لگی و دیری  
کے باوجود بارگاہ حسن و جمال خاتون میں عاجزی و انکساری کا اظہار کر رہا ہے۔ خود  
بے نیاز و اسے بے نیاز بنا رہا ہے۔

عورت کی ہر بندی کی انتہا یہ ہے کہ وہ جہاں اور جس جگہ بھی ہے، مرد کو اپنے  
ستارے پر بندے۔

عزیزا اپنے حقوق خواتین کے نام سے عورت کے کتنے بڑے اعزاز و شرف  
کی حیثیت کو داغدار کیا جاتا ہے؟

یہی بات میں نے کہی تھی کہ محترم حضرات بے چاری عورت کی بھوڑوں کو



آرستہ کرنے کے بہانے اندھا بنانا چاہتے ہیں۔

**حیثیت و احترام خواتین کے تحفظ کا دانشمندانہ و فیس طریقہ منگنی ہے۔**

میں نے عرض کیا، قانون تخلیق میں مرد کو منظر نیاز و طلب قرار دیا گیا ہے عورت منظر مطلوبیت و جواب بنائی گئی ہے۔ یہی نکتہ، عورت کی حیثیت و احترام کی ضمانت مہیا کرتا ہے جو مرد کی قوت جسمانی کے مقابلے میں اس کی کمزور تخلیق کو متوازن کرتا ہے۔ اسی سے مشترک زندگی میں توازن و برابری پیدا ہوتی ہے۔ یہ جذبہ ایک قسم کا طبعی امتیاز ہے جو عورت کو عطا ہوا ہے اور ایک قسم کا تقاضا ہے جو مرد کے حوالے کیا گیا ہے۔

جب انسان قانون بنانا چاہیں۔ دوسری لفظوں میں جب قانونی انتظامات کی ضرورت ہو تو عورت کے اس امتیاز کو عورت کے لیے اور مرد کی اس ذمہ داری کو مرد کے لیے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ زن و مرد کی یکسانیت پر مبنی قوانین میں، ذمہ داری و ادب کے زاویے خواستگاری کا دستور۔ عورت کے نفع اور احترام کو نقصان نہ پہنچائے اور دونوں میں برابری کے معنی یہ ہیں کہ دونوں میں توازن رہے، چاہے دیکھنے میں مرد کی رعایت ہو لیکن حقیقت ظہر میں کی بھلائی پائی جائے۔

اس میں دیکھنا چاہیے نکات پیش کرنے والے نے جو دفعہ عورت کو خواستگاری کا پابند کرتی ہے، بے وزن ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں اس سے انسانی معاشرے کو نقصان پہنچے گا۔

**چالیس قانونی نکات مرتب کرنے والے کو قانون مدنی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی!**

اس پیرا گراف میں جس دوسرے نکتے پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ جناب مہدی

کی غلط فہمی ہے۔ موقوف نے، زن روز کے شمارہ نمبر ۸۶ صفحہ ۲ پر لکھا ہے:

”دفعہ نمبر ۱۰۳ کے بموجب جن دو کے درمیان رشتہ طے ہو جائے۔ اس بعد معقول سبب کے بغیر اسے توڑ دیا جائے تو فریق متعادل یا اس کے والدین یا تیس افراد نے رشتے کی بنیاد پر جو تحفے اور سوغاتیں دی تھیں، واپس کرنا ہوں گی۔ اور اگر اصل تحفے یا ہدیے اتفاقاً ضایع ہو گئے ہوں تو ان کی قیمت ادا کریں۔ مذکورہ دفعہ کی توضیح کے بعد۔ ہمارے قانون بنانے والے کی نظر میں۔ نامزدگی بھی وعدہ نکاح کی صریح قانونی طور پر مؤثر نہیں، نہ اسے اجراء کی ضمانت حاصل ہے۔ اور طرفین میں اس سے کوئی معاہدہ کی شکل نہیں دی جاسکتی۔ صرف اتنا اثر پڑتا ہے۔ انکار کرنے والا فریق۔ بقول قانون ساز۔ ”معقول وجہ“ کے بغیر رشتے کو توڑنے پر اصل قیمت اس فریق کو واپس کرے جس نے بہ امید نکاح وہ چیزیں دی تھیں۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تحفوں کی لین دین میں نکاح ہونے کا خیال پیش نظر نہیں ہوتا۔ ان غیر معمولی اخراجات کا سبب تو براہ راست ”نامزدگی“ کی تقریب ہی ہوتی ہے۔“

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ جناب مہدی کی اس ”دفعہ“ پر اعتراض یہ ہے کہ دفعہ نامزدگی کے کوئی قانونی اثر نہیں مرتب کرتی، اور اس کے جہاں کی ضمانت نہیں دیتی۔ اس کا اثر صرف اتنا ہے کہ رشتہ توڑنے والا اصل تحفے یا ان کی قیمت دوسرے فریق کو واپس کرے۔ لیکن نامزدگی کے سلسلے میں اس شخص کے نقصانات اس کے علاوہ ہیں مثلاً جشن و شادی وری، نامزد کو لے کر پھرنا اور سلسلے میں بھاری اخراجات۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس میں ایک وراعتراض بھی ہو سکتا ہے۔ قانون کہتا ہے کہ ”رشتہ توڑنے والا“ اگر معقول وجہ کے بغیر رشتہ توڑ دے تو اصل کردہ اصل تحفے یا ان کی قیمت دوسرے فریق کو دے۔

فرض یہ ہے کہ قاعدہ کے مطابق اگر رشتہ توڑنے والا معقول وجہ کی بنا پر بھی رشتہ توڑے جب بھی اسے کم از کم فریق ثانی کے مطالبے پر سمجھے تو واپس کرنا ہی چاہیے۔

حقیقت میں دونوں اعتراض ٹھیک نہیں ہیں۔ قانون مدنی کی دفعہ ۳۶۱ ہے: "وہ نامزد افراد میں رشتہ کی منظوری کے بعد کوئی فرد" علت موجبہ "معقول سبب کے بغیر رشتہ توڑ دے حالانکہ فریق متقابل یا اس کے والدین یا دوسرے افراد کا حوصلے کی خیال میں دمغور ہوں انھوں نے اخراجات بھی کیے تھے۔ تو جس فریق نے رشتہ توڑا ہے وہ نقصان کی تلافی کرے گا مگر یہ تلافی عام دستور کے اخراجات کی بنیاد پر ہوگی۔"

اس دفعہ نے اسی بات کی پیش بندی کر رکھی ہے جس کے بارے میں جناب مہدی کے بقول "قانونی پیش بندی نہیں کی گئی" دفعہ میں "بدون علت موجبہ" کی شرط ہے۔ معقول وجہ کے بغیر۔ اس دفعہ کی رو سے رشتہ توڑنے والا فریق ثانی کے اخراجات بضمن نامزدگی ہی کا دینا نہیں بلکہ والدین یا دوسرے افراد کے اخراجات کا بھی دینا قرار پاتا ہے۔

اس دفعہ میں "مغور شدہ" (فریب میں مبتلا) کا جملہ قانونی کلیہ "غور"۔ فریب۔ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس کے علاوہ قانون مدنی میں "تسبب"۔ ایک ہے فریب دینا، نقصان پہنچانا۔ دوسرے فریب یا نقصان کے اسباب فراہم کرنا۔ یعنی تسبب نقصان مہیا کرنے پر بھی جبری ضمانت مہیا کی گئی ہے۔ دفعہ نمبر ۳۳۲ تسبب متعلق ہے، یہ دفعہ بھی منحرف فریق کے خلاف قابل استفادہ ہے۔

بنابرین قانون مدنی یہی نہیں کہ "خسارت" بے نامزدگی و نامی زدگی کے ضمن میں ہونے والے نقصانات کے بارے میں خاموش ہے بلکہ اس نے اس بات کو دو دفعات

سمجھتا ہے۔

"خسارت بے نامزدگی" کو منظور رکھنے والے نے "خود نامزدگی" سمجھ لیا۔ ؟  
قانون مدنی کی دفعہ ۱۰۳۷ ہے:

"ہر ایک نامزد کو تین بے کے منظور شدہ رشتہ کو توڑ دینے والے دڑ کے پار کی سے منظوری رشتہ کے موقع پر اپنی طرف سے یا اپنی والدین کی طرف سے دیے جانے والے تحفے واپس مانگے اگر اصل تحفے موجود نہ ہوں تو مطالبہ کرنے والا قیمت کا حق دار ہوگا مگر بطور رسم ایسے تحفے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ چیزیں کسی کو تباہی کے بغیر فریق ثانی سے مف ہوتی ہوں یہ دفعہ ان چیزوں سے متعلق ہے جو فریقین ایک دوسرے کو دیتے ہیں یا اپنے

بچے کہ اس دفعہ میں کسی قسم کی قید نہیں ہے کہ ایک فریق بغیر علت موجبہ "معقول سبب" سے رشتہ کو توڑ دے۔ "بدون علت موجبہ" ایک بے جا استثناء ہے جس کے مرکب مہدی صاحب ہوں۔ "تسبب" جو لوگ قانونی سادہ فقرات (دفعات) سمجھنے سے مغرور ہیں۔ ان میں یہ دیکھ کیے پیدا ہو گیا کہ وہ ان آسمانی قوانین کو بدل دیں جن میں ہزاروں بار یکساں اور تکرار کیا گیا ہے۔ یہ صاحب وہ ہیں جن کی زندگی انھیں قانونی نکات سے گزرنے میں گزری ان کا کام ہی یہ رہا۔ اسی فنی مہارت کے نام سے موصوف نے ملک کے ایک بخت صاف کیا ہے۔

کے بھی واضح رہے کہ جناب مہدی پانچ سال پہلے تک کہ جب "پیمان مقدس" مشاق و واج کی تالیف میں مصروف تھے۔ اس جملے "بدون علت موجبہ" کو بدلتا ہوا دیکھتے ہیں "چنانچہ مذکور کتاب میں ایک ہی فصل سی و دو فریاد مہدی نے بے کیا دنیا میں کوئی کام بے علت و سبب بھی ہوا ہے۔ لیکن بہت حد تک یہ ایک برسوں یہ جملہ غلط پڑھا کیے۔ اصل عبارت "بدون علت موجبہ" تھی۔



نواستگاری کے ضمن جو مزید اعتراضات "منشور" لگانے کیے ہیں ہم ہر دست  
ان سے قطع نظر کرتے ہیں۔

## دوستِ راحۃ:

# نکاحِ موقت (مستعد)

- — متع اور آج کی زندگی۔
- — آیا نکاحِ موقت رہبانیتِ عملی ہے؟
- — کونسا طریقہ؟ موقت رہبانیت، جنسی کیونزیم یا نکاحِ موقت؟
- — آج کے جوان کچھ عمری میں شادی نہیں کر سکتے، لہذا بونع اور جنسی پہچان میں کیا کریں؟
- — اگر متعہ کا منصوبہ یورپ آیا ہوتا تو جدت پسند اسے سب سے زیادہ ترقی یافتہ قانون سمجھتے۔
- — آج کی زندگی میں کل سے زیادہ متعہ ضروری ہو چکا ہے۔
- — آزمائشی شادی۔
- — متعہ کے بارے میں رسل کا نظریہ۔
- — خواتین کی راہ میں بیسویں صدی کے مرد کے جاں
- — بیسویں صدی کی عورت کی شرفیت یورپ امریکہ کی سربز داری کی خدمت میں۔

— کونسی عورت کرلیے کی عورت یا اس کی اس کی؟

— قرآن، عورت کا سچا حامی اور حق گو ہے۔

— متعدد اعتراض اور جواب۔

— متعدد مسئلہ آبادی حرم سرا۔

— بیویں مدی کے مردوں نے خواتین سے لذت اندوزی کے مقبلے ہارون

رشیہ و فضل بر مکی سے سیکھے ہیں۔

— بیویں مدی کے مردوں نے صرف بے بہادری لٹائی ہے۔

— "لذت پرست" مرد، اسلام میں ملعون سمجھا گیا ہے۔

خداوند از مخالف مرحوم

## نکاح مؤقت

(۱)

بہت سے افراد کے برعکس، اسلامی مآل میں لوگوں کے شکوک و شبہات بجا کرنے کے بجائے تکلف محسوس نہیں کرتا۔ باوجودیکہ میر تمام تر رابطہ و عقائد صرف اسلام سے ہے۔ میں اپنے دل سے خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے، اور زندگی میں تجربہ و مشاہدہ کیا ہے کہ پرانی مقدس آئین، وہ ہے جس کے محاذ پر بہ شدت حملہ آور سے مضبوط تر بنادیتے ہیں جس رنج پر حملہ کیا جائے۔ اس رنج پر زیادہ طاقت، سر بلندی و جلوہ نمائی اور زیادہ آب و تاب آجاتی ہے۔

حقیقت کی خوبی یہی ہے کہ شک اور تردد اس سے روشن کرنے اور چمکانے میں زیادہ مدد دیتا ہے۔ شک یقین کی ہمید اور تردید تحقیق کی سیڑھی ہے۔ "زندہ بیدار" نامی رسالے میں، مغز کی "مینر ان العمل" سے نقل ہے کہ:

"جو ری گفتگو کہہ ہی فائدہ بہت ہے کہ مجھ تمہارے موردی اور پرانے عقائد کے بارے میں مبتلائے شک کر دیا، کیونکہ شک تحقیق کی اساس ہے۔ جو شک نہیں کرتا، وہ صحیح طور پر توجہ نہیں دے رہا ہے، جو شخص با یک بین نہیں ہے وہ اچھی طرح دیکھتا ہے یا ایسا آدمی اندھے پن اور مرگردانی میں گزارے گا۔"

آزادی دیجیے، لوگ بولیں، لکھیں، سمیٹا کر لیں، اعتراض کریں، نتیجہ میں ان کی خوش بینیں اسلام کے منظور ہونے کا وسیلہ بنیں۔

سردم کے تابناک قوانین میں سے، نگاہ فقہ جعفری میں شادی دو طرح کی ہے۔



دائمی اور موقت -

مذہب بعضی ہی ہمارے ملک کا رسمی مذہب ہے۔ نکاح موقت و نکاح دائمی چند باتوں میں یکساں اور چند معاملات میں علیحدہ ہیں۔

سب سے پہلی جگہ جہاں یہ دونوں الگ ہوتے ہیں وہ زن و مرد کا معین وقت کے لیے نکاح کرنا، جب مدت معین ختم ہو جائے اور دونوں متعلق ہوں تو مدت بڑھ سکتے ہیں اور اگر دونوں متعلق نہ ہوں تو الگ ہو جاتے ہیں۔

دوسری بات شرائط کی ہے، متعہ میں دونوں کو زیادہ آزادی ہے، جو شرائط و معاہدہ چاہیں کریں، مثلاً نکاح دائمی میں مرد بہر حال روزانہ کے اخراجات، پوشاک، مکان کا ذمہ دار ہے، اس کے علاوہ بیوی کے دوسرے ضروریات، جیسے دوا، علاج، معالج وغیرہ کا انتظام بھی شوہر کرے گا۔ لیکن نکاح موقت - متعہ - ان ذمہ داریوں اور آزادیوں کا تعلق معاہدہ پر ہے ممکن ہے مرد نہ چاہے یا اخراجات ادا کرنے کے قابل نہ ہو۔ یا عورت اپنے شوہر کی دست سے فائدہ نہ اٹھانا چاہے۔

نکاح دائمی میں، بیوی بہر حال شوہر کو سردار و خاندان ماننے کی پابند ہے۔ اور گھر کو بھلائی کی حد تک مرد کے احکام کی تعمیل کرے گی۔ لیکن نکاح منقطع میں باہمی معاہدہ کے مطابق عمل ہوگا۔

نکاح دائمی میں میاں بیوی بہر حال ایک دوسرے کا ترکہ پائیں گے۔ نکاح منقطع میں یہ نہیں ہے۔

دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نکاح منقطع، حدود اور پابندیوں سے آزاد ہے، برسرِ قید طرفین کے معاہدے سے وابستہ ہے، فریقین جس قرار داد پر راضی ہوں گے وہی عمل میں آئے گی حتیٰ کہ زمانے کی پابندی میں دونوں کو آزادی ہے اور مدت نکاح بھی طرفین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے۔

نکاح دائمی میں، میاں بیوی ایک دوسرے کی رضامندی کے بغیر مانع حل کوئی گم نہیں کر سکتے۔ لیکن نکاح منقطع میں ایک دوسری کی رضامندی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی زن و شوہر کو آزادی دی گئی ہے۔

اس شادی کے نتیجے - یعنی اولاد - اور نکاح دائمی کے نتیجے میں کوئی فرق نہیں۔ مہر، نکاح دائمی میں بھی ضروری ہے اور نکاح منقطع میں بھی لازم ہے۔ فرق یہ ہے کہ نکاح منقطع میں اگر مہر کا ذکر نہ ہو تو عقد باطل ہوگا۔ اور نکاح دائمی میں مہر کا ذکر نہ کرنے سے نکاح باطل نہیں ہوتا مگر مہر شریعت میں جو کہ (مہر شریعت سے مراد وہ مہر ہے جو بیوی کی قربت و اخواتین کا مہر تھا وہی مہر خاتونِ قریبہ کی جس طرح عقد دائم میں، شوہر پر بیوی کی مال اور بیٹی اور بیوی پر شوہر کے باپ اور

بیٹے حرام ہیں، اسی طرح عقد منقطع میں بھی یہی صورت ہے۔ جیسے دائمی زوجہ سے دوسری درخواستِ شادی حرام ہے اسی طرح متاعی بیوی سے رشتہ کی درخواست بر شخص پر حرام ہے۔ یا دائمی زوجہ سے زنا کرنے والے پر وہ عورت ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ یہی حکم متاعی زوجہ کے لیے ہے۔ طلاق کے بعد دائمی نکاح والی عورت عدہ رکھنے کی پابند ہے۔ متاعی بیوی بھی مدت نکاح معاف یا ختم ہونے کے بعد عدہ کی پابند ہے۔ البتہ عدہ کی مدت میں اختلاف ہے۔ نکاح دائمی والی بیوی تین ماہ واری تک اور متاعی بیوی دو ماہ واریاں یا پینتالیس دن کا عدہ رکھے گی۔ نکاح دائمی میں دو بہنوں کو بیک وقت بیوی نہیں بنایا جاسکتا، متعہ میں بھی یہی حکم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ازواجِ موقت یا نکاح منقطع کے نام سے شیعوں فقہ میں مذکور ہے۔ یہ ان کے قانون مدنی میں بعینہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم اس قانون کے ان خصوصیات کے ساتھ حامی ہیں۔ رہا یہ کہ ہمارے افراد نے اس قانون سے ناجائز فائدے اٹھائے اور اٹھاتے ہیں۔ اس کا قانون سے کیا تعلق ہے؟ اس قانون کے بدلنے سے ناجائز فائدے نہ اٹھائے جانے کی ضمانت کون دے سکتا ہے؟ منسل بدل جائے گی۔ بلکہ قانون کے مسترد کرنے سے سینکڑوں فساد اور پیدا ہوں گے۔

مگر عوام کی اصلاح اور انکو آگاہ نہ کر سکیں تو اپنی ناتوانی اور عوام کی اصلاح نہ کرنے کی بات کو ہمیشہ قانون کی خرابی پر ڈھکنا غرض انسان کو بری الذمہ قرار دینا اور قوانین کو ذمہ دار ٹھہرنا مناسب ہے۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ نکاح دائمی کے ہوتے ہوئے ازدواج موقت کے نام قانون بنا کی ضرورت کیا ہے۔ آیا بقول مضمون نگاران رسالہ ”زن روز“ متعہ خواتین کی نسوانی شہیت اور اعلامیہ حقوق بش کے خلاف ہے؟ کیا متعہ کی ضرورت تھی بھی تو پرانے زمانے میں تھی آج کی زندگی اور آج کے جدید معاوضے اس سے ہم آئنگ نہیں ہیں؟ ہم اس موضوع کو دو عنوانوں سے زیر بحث لائیں گے:

الف — متعہ اور آج کی زندگی۔

ب — متعہ کے نقصانات و عیوب۔

## متعہ اور آج کی زندگی

ہم مذکورہ بالا گفت گو سے یہ سمجھ چکے ہیں کہ

نکاح دائمی میاں بیوی کے لیے بہت سی

ذمہ داریاں اور فرائض پیدا کرتا ہے۔ اسی دلیل کی بنیاد پر لڑکی یا لڑکا، طبعی بلوغ کو پہنچنے ہی جنسی جذبات سے مغلوب ہونے کے باوجود نکاح دائمی پر تیار نہیں ہوتا۔ عہد جدید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے طبعی بلوغ اور معاشرتی بلوغ (خاندان کی تشکیل کے امکان میں فاصلے بڑھا دیے ہیں۔ اگر گزشتہ صدی کے سادہ زمانے میں ایک کم سن لڑکا اوائل بلوغیت تک کسی کام میں لگا دیا جاتا تھا تو زندگی بھر سے انجام دیتا تھا۔

مگر آج کی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک کامیاب لڑکا، اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے امتحانات پاس کرتا ہے، کبھی اسے اعلیٰ ترین سند کے لیے کچھ مدت یونیورسٹی میں گزارنا پڑتی ہے پچیس سال میں دانگہ سے فراغت ہوئی، یقینی طور سے تین چار سال اس فکر میں گزارنا ہیں کہ تھوڑی بہت آمدنی اور کچھ سروسامان ہو تو نکاح دائمی کی موچی

کی مثال اس لڑکی کا ہے جو تعلیمی دور مکمل کرنا چاہتی ہو۔

## آج کا جوان اور بلوغ

### ہجران جنسی کا عہد

جنسی پہچان میں آئے۔ آج کے کسی اٹھارہ سالہ لڑکے سے شادی کی بات کر کے دیکھئے۔ وہ آپ پر تنے گا۔ وہ ہی رد عمل سولہ برس کی لڑکی دکھائے گی۔ عملاً ممکن نہیں، اس طبقے کے لوگ سن سولہ میں نکاح دائمی کر کے اس بوجھ تلے نہیں آسکتے جس میں ایک دوست کی ذمہ داریاں سمایا پڑتی ہیں اور کچھ دن بعد ہونے والی اوماد کا مسئلہ اس پرستندوبن جاتا ہے۔

## وقتی رہبانیت، آزمائشی شادی

### یا نکاح موقت (متعہ) کون بہتر ہے؟

ہم آپ سے پوچھتے ہیں، اس صورت حال میں اس منزل اور اس خمیر کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیے؟ آج کی دنیا میں، زندگی کے حالات ہیں سولہ اور اٹھارہ برس کی عمر کی لڑکی کی اجازت نہیں دیتے، کیا فطرت بلوغ کا دور آگے بڑھا سکتی ہے؟ درجہ بہت ہی کمی زمانہ مکمل نہ ہو جنسی جذبات ہم سے دست بردار ہو سکتے ہیں؟

”وقتی رہبانیت“ — ترک دنیا، ترک لذات — کا چلہ کھینچنے کے لیے آج کے جوان تیار ہیں؟ کچھ عمر ریاضت کریں اور شادی کے امکانات حاصل ہونے تک ذرا سختی میں لیں؟ فرض کر لیا کہ ”وقتی“ رہبانیت کے لیے کچھ عواں تیار ہو گئے۔ کیا ان کا خمیر بھی ختمی ہے؟ کیا ان میں خطرناک نفسیاتی بیماریاں پیدا نہ ہوں گی؟ یہ بیماریاں ان کی جنسی خواہشات کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں، ان کا سرخ آج کے ماہرین نفسیات لگ چکے اور ان کی حقیقت بتا چکے ہیں۔ کیا اس پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے؟

اب دوراں سے ہیں، جوانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ان کے معاوضے کو سامنے نہیں ہی نہیں۔ ایک لڑکے کو چھوٹ دے دیں کہ سولہ لڑکیوں سے کام نکالے۔ ایک



لڑکی کو ڈھیل دے دیں وہ جائے اور دس لڑکوں سے ناجائز طریقے پر تعلقات قائم کرے اور کئی مرتبہ متحفظ کرے۔ یعنی علی طور پر جنسی کیونرم قبول کر لیں ہم لڑکے لڑکی کو برا بری دے ہی چکے ہیں، "منشور حقوق انسانی" کی روح سے خوشی ہو چکی ہے۔ آخر بہت سے کوتاہ خیال افراد کی نظر میں "اعلامیہ حقوق بشر" کی روح یہ ہے کہ اگر مرد و زن جہنم کے کسی درجے میں داخل ہونا چاہیں تو دوش بدوش اور ہاتھ میں ہاتھ ملا کر، خلاصہ یہ کہ برابر برابر گریں۔

سوچیے، ایسے لڑکیاں جنہیں طالب علمی میں اتنے زیادہ تعلقات حاصل ہو چکے ہوں مستقل شادی کے بعد مرد زندگی اور خاتون خانہ بننے کے قابل رہیں گے؟ کیا متعہ بہتر ہے؟

دوسرا راستہ ہے، ازدواج موقت و آزاد۔ متعہ پہلے مرحلے میں عورت کو پابند کرتا ہے کہ بیک وقت دو مردوں کی بیوی نہ بنے۔ صاف سی بات ہے، جب عورت ایک مرد کی پابند ہوگی تو مرد کو بھی خواہ مخواہ ایک عورت کا پابند رہنا پڑے گا۔ جب ایک عورت ایک معین مرد کی پابند ہوتی ہو تو مرد بھی مجبوراً اسی ایک عورت کا ہو رہے گا۔ سوائے اس کے کہ عورتیں (لڑکیاں) فرواں ہو (اور ان کی طرف سے لڑکوں پر دباؤ زیادہ ہو)۔

یہی ایک راستہ ہے جس میں وقتی رہبانیت اور اس کے نقصان دہ اثرات سے بچا جاتا ہے اور جنسی کیونرم میں بھی نہیں چھسنا پڑتا۔

**آزمائشی شادی:** زمانہ طالب علمی ہی نہیں، دوسرے حالات میں بھی ضرورت پیش

آسکتی ہے، اصولاً ممکن بھی ہے کہ "زن و مرد نکاح دائمی کرنا چاہیں مگر باہمی اعتماد اور مکمل محرومی کے واسطے آزمائشی طور پر کچھ دنوں کے لیے عقد کر لیں، اس مدت میں اعتماد حاصل ہو جائے تو نکاح دائمی سے منسلک ورنہ مدت ختم ہو جائے اور دونوں جدا ہو جائیں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں: اہل مغرب کا رواج عورتوں کی معین تعداد کو شہر میں حکومت کی کمرانی میں رکھنے کو لازم اور ضروری سمجھتے ہیں، اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ بے شادی شدہ افراد جو دائمی شادی نہیں کر سکتے، کو فائدہ دے اور گھریلو زندگی بسر کرنے والوں کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔

**رسل اور نظریہ ازدواج موقت:** "برنزینڈرسل" مشہور انگریز فلسفی نے، اخلاق اور خانگی تعلقات زن و شوہر میں لکھا ہے:

"... سنجیدگی سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ فاحشہ عورتیں، ہماری گھریلو زندگی، ہماری خواتین اور عصمت دختران کی حفاظت کرتی ہیں۔ ملکہ وکٹوریا کے زمانے میں "لکی" نے یہ بات کہی تو اخلاق کے طرفدار بہت ناراض ہوئے، وہ اس کی علت سمجھنے اور "لکی" کے نقطہ نظر کی غلطی ثابت کرنے میں ناکام رہے، اخلاق پرست طبقے کی زبان حال اور استدلال تھا۔ "اگر عوام ہمارے تعلیمات کو قبول کرتے تو فحاشی ناپید ہو جاتی۔ لیکن وہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ انکی بات پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔"

فرنگیوں کا یہ فارمولا، ان مردوں، عورتوں کے لیے ہے جو نکاح دائمی نہیں کر سکتے، وہ تھا فارمولا جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے، اگر فرنگی فارموسے پر عمل کیا جائے اور کچھ بد نصیب عورتیں اس معاشرتی ذمہ داری کے لیے مخصوص کر دی جائیں، تو کیا عورت کا حقیقی رتبہ اور اس کی انسانی حیثیت برقرار اور اعلامیہ حقوق انسانی کی کج

نہ۔ بیوی مدی میں حکومت کی طرف سے لائسنس دار فاحشہ عورتوں کے اڈے مغربے یران میں آئے اور پہلوی تختے کی بڑے پیمانے پر سرپرستی و ہمت افزائی کی۔

نہ۔ رسل کی کتاب کا نام ہے: "MARRAGE AND MORALS"

خوش ہو جائے گی؟

برنڈز نے اپنی کتاب میں "آزمائشی شادی" کے عنوان سے ایک باب الگ لکھا ہے اس کی رائے ہے:

جسٹس یڈز نے جوڈینور کے ٹول ایفانجج تھے موصوف نے اپنے مشاہدات اور مطالعہ تعاقب کے بعد تجویز رکھی تھی کہ "فرنیڈشپ میٹرچ" - ازدواج رفاقتی کا پروگرام شروع کیا جائے۔ افسوس، انھیں اپنی سرکاری ملازمت امریکہ میں چھوڑنا پڑی۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ وہ نوجوانوں کی خوش حالی اور سعادت کی فکر کو ان میں سیادہ کاری کی حس کو بیدار کرنے سے زیادہ حامی تھے۔ کیتھولک اور کالوں کے مخالف گروپوں نے حج صاحب کو برطرف کرنے کی مہم چلا دی۔

فرنیڈشپ میٹرچ کی مقلد تجویز ایک دانشمند نے کی ہے۔ وہ جنسی روابط میں استحکام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یڈز سے سمجھ گیا کہ شادی کی راہ میں بنیادی رکاوٹ نفسی ہے، پیسے کی ضرورت صرف اولاد کے ہونے پر ہی نہیں، اصل بات بیوی کا معاشی سہارا نہ دینا ہے۔ لہذا، رفاقتی شادی جوانوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ اس میں عام شادی سے عین اختلاف ہے، ۱۔ شادی سے بچے پیدا کرنا مطلوب نہ ہوں گے۔

۲۔ عورت جب تک مان نہ بنے گی، حاملہ نہ ہوگی، طرفینے طلاق پر رضامندی آسان ہوگی۔

۳۔ طلاق کی صورت میں عورت کو اپنے آذوقے کے لیے کچھ امداد کی ضرورت ہوگی۔

..... میں یڈز کی تجویز کے مفید و موثر ہونے میں کوئی شک نہیں رکھتا۔ اگر قانون اسے منظور کر لیتا تو اخلاقی فلاح و بہبود میں اچھا

اضافہ ہوتا۔

یڈز نے اور رسل جسے "ازدواج رفاقتی" کہتے ہیں اگرچہ اسلامی "ازدواج مؤقت" سے اس میں کچھ فرق تو ہے لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ مفکرین اس نکتہ کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ تنہا "ازدواج دائمی" تمام معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں۔



## نکاح موقت

قانون متعہ کے خصوصیات اس کے وجود کی ضرورت اور فقط نکاح دائمی تمام انسانوں کی ضرورت پوری نہیں کرتا۔ خاص کر موجودہ زمانے میں۔ یہ تھے وہ نکاحات جن پر بحث و تحقیق کی گئی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ متعہ کے ممکنہ نقصان کیا ہو سکتے ہیں۔ تمہید میں ایک بات یاد دلاتے چلیں :

**تاریخ عقائد نویسی :** انسان جن موضوعات و مسائل و مباحث پر اظہار رائے کرتا چلا آ رہا ہے، ان میں تاریخ علوم و عقائد اور رسم و رواج اور انسانی آداب (جیسے موضوعات سب سے زیادہ نامفہوم اور مشکل ہیں) چنانچہ کسی موضوع پر انسان نے اس موضوع سے زیادہ بے معنی باتیں کی ہیں۔ اتفاق سے کسی اور موضوع پر اظہار رائے کا اتنا شوق بھی نہیں رہا۔

مثال کے طور پر اگر کسی کو اسلامی فلسفہ و تصوف و عرفان و علم کلام سے واقفیت ہے اور اس نے آج کے مصنفین کی تحریریں پڑھی ہیں۔ یہ تحریریں عموماً یا بیرونی مصنفین سے ماخوذ یا اصل گفتگو کی نقل ہیں۔ بہر حال ان سے باخبر حضرات میری بات کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ یعنی اورینٹلسٹ ان کے پیروکار اور دم چھلے ان مسائل پر گفتگو فرمائی جتنے میں لیکن براہ راست موضوع کو شاید ہی گہرائی کے ساتھ جانتے پہچانتے ہیں۔

اسلامی تصوف کے ایک مسئلہ کو لیجئے "وحدت وجود" اب یہ مسئلہ زبان زد ہے کیا کیا باتیں نہیں کہی گئی ہیں۔ بس ایک بات تشبہ گفتگو ہے اور وہ ہے "وحدت وجود" کیا ہے اور اسلامی تصوف و عرفان کے بڑے بڑے مفکر جیسے محی الدین ابن عربی اور

سید مرتضیٰ شیرازی کا تصور وحدت وجود کیا ہے ؟

رسالہ "زن روز" میں چھپنے والے مضامین، جن میں نکاح منقطع پر اظہار رائے کی گئی ہے، وقت مجھے مسئلہ وحدت وجود یاد آ رہا۔ یہ محسوس ہوا کہ سب باتیں زیر بحث تھیں لیکن اصل روح مسئلہ جو یہ قانون بناتی ہے اور قانون ساز نے اس کو پیش نظر رکھا ہے تشبہ بحث ہے۔

در اصل یہ قانون چونکہ "مشرقی ترکہ" ہے لہذا بے توجہی کا متحمل ہے اور اگر یہی مغربی تحفہ "ہوتا تو بحث یوں نہ ہوتی۔

یہ قانون سرزمین مغرب سے آیا ہوتا تو آج اس پر کانفرنسوں اور سیمیناروں کا سلسلہ جاری ہوتا، قراردادیں پاس ہوتیں کہ بیسویں صدی کے آخری پچاس سال میں ماحول تبدیل کیا ہے کہ فقط نکاح دائمی کو شادی قرار دینا مطابق حالات نہیں ہے۔ موجودہ نس نکاح دائمی کے فرائض برداشت کرنے کی قوت سے محروم ہے۔ آج کا جوان ان ذمہ داریوں کو نہیں اٹھانے سے آزادی چاہیے۔ آزاد زندگی میں آزاد نکاح کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ آزاد نکاح میں آج کا جوان لڑکا اور لڑکی کی آزادی سے شیطاں طے کرتی ہے..... اور اسی دلیل کی بنیاد پر مغرب کے ایک زمزمہ اٹھا کہ "دوستانہ شادی" وقت کی ضرورت ہے ورنہ بڑے بڑے "سل" جیسے مفکر اس میں شریک ہو گئے۔ حالات بتاتے ہیں کہ مستقبل میں اسلام کی صوابدید کو مغرب نے پسند کریں گے اور ہم از دواج دائم کے خلاف ہمہ کد دفاع اور اس کا پروپیگنڈہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔

## اعتراضات و جوابات

متعہ پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کی نوعیت

یہ ہے :

۱۔ شادی کی بنیاد دوام پر ہونا چاہیے۔ میاں بیوی جب یہ بندھن قبول کریں تو

ہمیشہ کے لیے پابند رہیں اور جذباتی کا خیال ذہن میں نہ آنے دیں، اور متعہ میاں بیوی میں دولہی قوں وقصر یہی نہیں ہندو مت کا بھی نہیں۔

ازدواج کو مستحکم بنیاد نہ ہونے کی بات بہت صحیح بات ہے لیکن متعہ پر اعتراض اس وقت ہو سکتا ہے جب نکاح دائم کو منسوخ کر کے متعہ کو اس کی جگہ رکھ دیا جائے۔ بے شک فریقین دائمی نکاح پر متفق ہوا دونوں کو مکمل طہینان ہو، دونوں پکا ارادہ کریں تو نکاح دائمی کا قانون ہے۔

زور دے وقت کا قانون تو بننا ہی اس لیے ہے کہ فقط ازدواج دائم ہر حالت یا ہر صورت حال اور ہر وقت ممکن نہیں انسان ضرور تباہ کا پورا کرنا نکاح دائمی کے دائرہ کار میں ہے۔ ایک ہی نکاح کی مدت نے فرد کو جزوقتی رہبانیت یا جنسی کیونزیم قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سائنس کی بات ہے جڑ کی اور لڑکے میں دائمی نکاح کی زمین ہموار ہو تو وہ ہرگز نکاح منقطع پر تیار نہ ہوں گے۔

۲۔ ایرانی عورتوں اور لڑکیوں نے نکاح منقطع کو پسند نہیں کیا، حالانکہ وہ شیعہ ہیں، ان کے خیال میں یہ توہین کی بات ہے۔ اسی بنیاد پر شیعہ مرد بھی اسے مسترد کرتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ عورتوں میں متعہ کی ناپسندیدگی ہوس پیشہ مردوں کے غلط رویہ سے ہے، تو ان کو اس رویے پر بند باندھنا چاہیے۔ ہم اس قانون کے غلط استعمال پر گے بحث کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ متعہ کے بارے میں اس پسندیدگی کی توقع جو نکاح دائمی کے بارے میں ہے۔ غلط ہے، کیونکہ قانون متعہ ہی اس موقع کے لیے جب فریقین نکاح دائم کے لیے تیار و متفق نہ ہوں۔

۳۔ نکاح منقطع، عورت کی شخصیت و احترام کے خلاف ہے، اس کے معنی ہیں انسان کو کریم پر لینا، یا جسم فروشی کا شرعی جواز، عورت کی شخصیت اور انسانی حیثیت سے گری ہوئی بات ہے کہ مرد سے کچھ پیسے لے کر اپنا وجود اپنا جسم اس کے حوالے کر دے۔ یہ اعتراض سب سے زیادہ تعجب خیز ہے۔

۱۔ ازدواج موقت کے بارے میں جو امتیازات ہم گزشتہ سطور میں لکھ چکے۔

ن کے ہوتے ہوئے اجارے اور کرایے کا ربط کیا ہے، آیا مدت ازدواج کی محدودیت نے نکاح ازدواج کی صورت سے خارج کر دیا اور کرایہ و اجارہ کی ہیئت دے دی؟ مہر کے قطعی تین کی وجہ سے کرایہ و اجارہ کی شکل بن گئی ہے، یعنی اگر مہر کے بغیر جو مرد کوئی چیمبر عورت پر بچھاو نہ کرے تو عورت اپنی انسانی حیثیت واپس لے لیتی ہے؟ مہر کے بارے میں آگے گفتگو کریں گے۔

اتفاقاً، علماء فقہ نے تصریح کر دی اور قوانین مدنی نے اسی بنیاد پر اپنے دفعات مرتب کیے ہیں کہ ازدواج موقت و ازدواج دائم دونوں میں معاہدے کی حیثیت ایک ہی ہے ان میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے نہ کوئی فرق کرنا چاہیے۔ دونوں ازدواج میں، دونوں مخصوص الفاظ CODE WORDS سے ازدواج کی صورت حاصل کرتے ہیں۔ اگر نکاح منقطع اجارہ و کرایہ کے مخصوص صیغوں سے پڑھا جائے تو باطل ہے۔

۲۔ انسان کا اجارہ و کرایہ کب اور کس تاریخ سے کینسل ہوا ہے؟ درزی، جھام، ڈاکٹر اور تمام ماہرین اور ملازمین سکر۔۔۔ وزیر اعظم سے لے کر چیرا سی تک تمام کاری گروہ کا خا کے سب کارکن کرائے کے انسان ہیں۔

جو عورت اپنے ارادہ و اختیار سے کسی معین مرد سے عقد ازدواج موقت کرتی ہے، کرایہ کی آدم زاد نہیں بنتی۔ نہ اس نے انسانی حیثیت و شرافت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہے۔ اگر آپ کو کرائے کی عورت دیکھنا، اور اگر آپ عورت کی فروخت اور کینزی کا جائزہ لینا چاہیں تو یورپ اور امریکہ چلے جائیں۔ وہاں ایک مرتبہ فلم کمپنیوں کو دیکھ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کرائے کی عورت کیا ہوتی ہے؟ کمپنیاں، عورت کی ایک جسمانی حرکت، اس کی نسوانی ساخت نسوانی عادتیں، اس کے جنسی آرٹ، کس کس طرح نیچے جاتے ہیں، بیٹھا اور تھپڑ کے ٹوکت آپ خریدتے ہیں دراصل وہ عورتوں کے اجارے اور کرائے کے پیسے ہیں۔ غور تو کیجیے، بد نصیب عورت صرف دولت کے لیے اپنا جسم کیونکر پیش کرتی ہے؟ تجربہ کار سفر



سے "ZAST" حصول لذت کی ٹرپ، جنسی شک تھڑک سیکھتی ہے، اپنا جسم روح اور شخصیت ایک سرمایہ دار کمپنی کے حوالے کرتی ہے، مقصد ہے اس کمپنی کے خریدار زیادہ بنائے اور اس کے لیے پیسے زیادہ فراہم کرے۔

کیمرے اور ہوٹل بھی دیکھیے، عورت نے کیا شرافت و عزت حاصل کی ہے، تھوڑی سی مزدوری، تھوڑا سا معاوضہ، اور وہ بھی دمالک (سرمایہ دار کی جیب میں مزید سرمایہ انڈیلنے کے لیے اپنی شخصیت و شرافت کا مہمانوں سے سودا کرتی ہے۔

کرائے کی عورتیں وہ مانجن۔ تنخواہ دار خواتین دیکھیے جو "شاپنگ سنٹروں" سے اقوامی کمپنیوں میں خریداروں کا دل موہنے اور گاہکوں کی بھیڑ جمع کرنے کے لیے، ٹیلوٹرن پر رنگا رنگ چہرے بناتی ہیں۔ ان کا کام کسی تجارتی سامان (مصنوعات) کی شہرت کا باعث بن کر سرمایہ دار کی جیب بھریں۔

کون نہیں جانتا، آج امریکہ اور یورپ میں عورت کا حسن، عورت کی دل کشی، عورت کی جنسی کشش، عورت کی آواز، امریکہ اور یورپ کے سرمایہ داروں کی خدمت گزاری کا عام اور حقیر وسیلہ ہے؟ افسوس ہے کہ، پائنتیانا دانستہ طور پر ایران کی شرافت و معزز خواتین کو مذکورہ بندھنوں میں جکڑنا چاہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک عورت آزادانہ و شریفانہ شرائط کے ساتھ "زواج موقت" کرنے کے بعد اسے کرائے کی عورت کہا جائے اور ایک گلوکارہ، کسی کی شادی، یا محفل سب میں ہزاروں لاپچی مردوزن کی آنکھوں کے سامنے فقط ان کی جنسی حس کو آسودہ کرنے کے لیے اپنا گلا بھاڑتی اور ایک ہزار ایک نغمے اپنی اور طے شدہ مزدوری لیتی ہے۔ کرائے کی عورت، شمار نہیں ہوتی؟

وہ اسلام، جو عورت سے مرد کو اس قسم کے فوائد حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو عورت کو اس جال میں پھنسنے سے روکتا اور اس اسیری اور اس روزی سے روکتا ہے، کیا وہ اسلام عورت کا مقام گراتا ہے، یا بیسویں صدی کا نصف دوم کا یورپ؟

جس دن عورتوں کو یہ حقیقت معلوم ہوئی اور وہ خواب غفلت سے بیدار ہوئیں، اور انھیں یہ نظر آیا کہ بیسویں صدی کے مردوں نے ان کے رستے میں کیسے کیسے جال بچھائے ہیں، اسی دن وہ انقلاب کا نعرہ بلند کریں گی اور یہ بھی مانیں گی کہ فقط قرآن ان کی پناہ گاہ، ان کا واقعی حامی اور ان کے سامنے میں تکی گوئے۔ یقیناً وہ دن دور نہیں انقلاب اسلامی یا وہ دن الایا خواتین نے آقائے مہتری کی پیش گوئی سچ کر دکھائی،

رسالہ "زن روز" شمارہ ۷۷ صفحہ ۸ میں ایک رپورٹ مارچپی ہے، عنوان ہے "زن کی مرضیہ و رضانا می دو کردار ہیں۔ مرضیہ نے عورتوں میں محرومیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

رضا کا بیان ایک لڑکی سے منگنی پر شروع ہوتا ہے۔ فارمولامبر ۴۰ کے مطابق پہلا قدم ہوا، اور لڑکی، لڑکے سے شادی کی خواہش ظاہر کرنے لگی۔ واضح ہے، جب خواہش لڑکی لڑکی سے شروع ہوگی تو انجام داستان اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا۔

مرضیہ کے اہلکار کے مطابق، ایک ہوس ران، سنگ دل مرد نے نکاح دائمی کا نام لے کر بات کی، اس کے بچوں کی نگہداشت اور سرپرستی کا وعدہ کیا، پھر ان باتوں کے برخلاف نصیب عورت کی اطلاع میں لائے بغیر اس سے متو کیا اور اپنا مطلب نکلانے کے بعد اس سے اپروٹی شروع کر دی۔

اگر اس عورت کا اہلکار دعویٰ صحیح ہے، تو نکاح بطل تھا جس سنگ دل مرد نے یک صورت کو شرعی و عرفی قانون سے بے خبری کی بنا پر دست درازی کا نشانہ بنایا، ہند اس کے سزا ملنا چاہیے۔

"رضا" جیسوں کو سزا ملنے سے پہلے، تربیت ملنا چاہیے اور رضا جیسوں کی سزا تربیت سے پہلے مرضیہ جیسی خواتین کو باخبر بنانا چاہیے۔

مرد کی سنگ دلی اور عورت کی بے خبری و غفلت کے ہاتھوں رونما ہونے والا جرم، دنوں سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ جو رسالہ "زن روز" میں رضا کو حق پر بتانا اور اپنی تہوار

قانون پر سیدھی کرتا ہے۔ کیا اگر قانون ازدواج موقت نہ ہوتا تو، سنگ دل رضا، بے خبر غافل  
مرضیہ کو نماوش چھوڑ دیتا؟

عورتوں کی تربیت اور ان کو باخبر بنانے کی ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کیوں ہے،  
مرد و زن کے حقوق و فرائض شری کو چھپاتے ہیں۔ عورتوں کو غافل بنا کر اس قانون کا بطور  
دشمن تعارف کراتے ہیں جو تنہا، عورت کے بارے میں حق گو اور ان کا حامی ہے۔ کیوں اس  
قانون کو خواتین کے ہاتھوں کچلونا چاہتے ہیں جو ان کی پناہ گاہ ہے؟

۴۔ نکاح منقطع، چوں کہ تعدد زوجات کی قسم ہے اور تعدد زوجات غلط ہے، لہذا  
نکاح منقطع غلط چیز ہے۔

نکاح منقطع کس قسم کے افراد کے لیے ہے؟ ہم اسی موقع پر اور تعدد ازدواج  
بات - بامداد خدا - الگ اور تفصیل لکھیں گے۔

۵۔ نکاح منقطع، چونکہ ناپائیدار ہے، لہذا ان بچوں کے لیے ناموزوں اشیاء ہے جو  
اس نکاح کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں، یہ بچے، حمایت پذیری اور سرپرست سے محروم، اور  
مادری سرگرمیوں سے بے نصیب رہتے ہیں۔

یہ اعتراض، رسالہ "زن روز" کا وہ نکتہ ہے جس پر پورا زور صرف کیا گیا ہے۔ ہم نے  
جو توضیحات پیش کیے ہیں، ان کے بعد کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہوگی، ہم گذشتہ مقالے  
میں ازدواج دائم و ازدواج موقت کے فرق بتائے ہیں اور کہا ہے کہ ایک فرق تولید نسل سے متعلق  
ازدواج دائمی میں زن و شوہر باہمی رضامندی کے بغیر ضبط تولید نہیں کر سکتے۔ ازدواج  
موقت اس کے برخلاف ہے، یہاں میاں بیوی دونوں اس معاملے میں آزاد ہیں۔ متعد  
ہیں عورت، مرد کو استمتاع سے تو نہیں روک سکتی مگر مرد کے اس حق میں رکاوٹ ڈالنے  
بغیر مانع حمل عمل ضرور بجا لاسکتی ہے۔ اس دور کے مانع حمل و ضبط تولید کے منصوبوں سے  
نکاح منقطع ہم آہنگ ہے۔

اس بنا پر، متعد میں، میاں بیوی دونوں چاہیں تو بچہ پیدا کریں اور ہونے والے بچے کی  
نکاح شد و تربیت کی ذمہ داری اٹھائیں تو بچہ پیدا کریں۔ ظاہر ہے۔ جذباتی و فطری لحاظ  
سے، نکاحی اور عائلی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔ بالضرر اگر ایسا عمل کیا جائے تو قانون پابند و  
بجور کرے گا، اور حقوق اولاد تلف کرنے سے روکے گا۔ ہاں، اگر تولید فرزند نہ چاہیں اور  
ان کا مقصد نکاح منقطع جنسی سکین حاصل کرنا ہو تو ضبط تولید کریں۔

ہمیں معلوم ہے، کلیسا مانع حمل عمل کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ لیکن اسلام کی نظر میں اگر  
زن و شوہر پہلے ہی سے ضبط تولید کی بات کریں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر نطفہ قائم  
ہو جائے اور بچہ کی پہلی تخلیقی منزل شروع ہو جائے تو اسلام اسے ضایع ہونے کی بالکل  
اجازت نہیں دیتا۔

شیخ فقہا جو کہتے ہیں کہ ازدواج دائم کا مقصد تولید نسل اور ازدواج موقت کا مقصد  
استمتاع اور جنسی سکین کا حصول ہے اس سے اسی قانونی نکتے کی تشریح ملتی ہے۔

**اتفاق - چالیس نکات پر** چالیس نکاتی منشور دتجاویر کے مصنف

نے "زن روز" کے شمارہ ۸۷ میں نکاح منقطع کو نشانِ نقد و نظر قرار دیا ہے؛  
پہلے فرماتے ہیں: "موضوع قانون نکاح یا ازدواج منقطع اس قدر تکلیف دہ ہے  
خود قانون کے واضعین بھی اس کی شرح و تفصیل نہ لکھ سکے۔ جیسے وہ اپنے کام سے  
خوش نہیں تھے جو کچھ کیا ظاہر داری کے لیے تھا۔ دفعات ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱



مقررہ مقالہ نگار اس کے بعد قانون مدنی کے اس نقص کو خود دور فرماتے ہیں اور نکاح منقطع کی تعریف کرتے اور کہتے ہیں: "نکاح مذکور کے معنی ہیں۔ بے شوہر عورت، بمعنی اجرت و مزدوری۔ معلوم معین اور محدود وقت کے ساتھ۔ خواہ چند گھنٹوں یا گھنٹوں کے لیے ہو۔ جنسی خواہش اور تناسل اور جنسی عمل کے لیے مرد کے حوالے کر دے۔"

پھر فرماتے ہیں: "نکاح مذکور میں یجاب و قبول کے خاص عربی الفاظ ہیں، جو یہ کتب فقہ میں درج ہیں۔ قانون نے مدتوں سے ادھر توجہ نہیں کی، جیسے قانون ساز کی نظر میں جو لفظ بھی مدعا، مذکور پر دست کرے (یعنی مفہوم و معنی) کو ایہ و مزدوری کے معنی دے چکا وہ عربی نہ بھی۔ نکاح منقطع واقع ہو جاتا ہے۔"

**مضمون نگار کی نظیریں:** الف - قانون مدنی، نکاح منقطع کی تعریف نہیں کرتا، اور شرائط کی توضیح نہیں دیتا۔

ب - نکاح منقطع کی ماہیت یہ ہے کہ عورت اپنے تئیں، معین مزدوری کے لیے مرد کو کرایہ پر دے۔

ج - قانون مدنی کی روشنی میں، عورت کے لیے کرایہ (اجارے) کے معنی دینے والے الفاظ، یجاب و قبول، نکاح منقطع کے لیے کافی ہیں۔

میں مصنف کو دوسری مرتبہ "قانون مدنی" پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں۔ مگر ذرا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ رسالہ "زن روز" کے محترم مطالعہ کرنے والوں سے بھی درخواست ہے، درج ذیل کر کے "قانون مدنی" کی ایک کاپی حاصل کر کے مطلوبہ حصوں پر نظر ڈالیں۔

قانون مدنی، چھٹی فصل، کتاب نکاح، نکاح منقطع کے بارے میں مخصوص ہے اس میں صرف تین سادہ جملے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ نکاح وقتی "منقطع" ہے، یہ معین مدت کے لیے واقع ہوتا ہے۔

دوسرا یہ کہ نکاح منقطع کی مکمل طور پر مدت معین ہونا چاہیے۔ تیسرا یہ ہے کہ مہر و میراث میں نکاح منقطع کا وہی قانون ہے جو مہر و میراث سے مربوط فصلوں میں بیان ہوا ہے۔

چالیس نکات کے محترم مصنف کا خیال ہے کہ کتاب نکاح کی پانچ فصلوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نکاح دائم سے مربوط ہے اور نقطہ یہ ہیں دفعات نکاح منقطع کے بارے میں ہیں۔ اور یہ بھول گئے کہ پانچوں فصلوں کے تمام قانونی دفعات، بجز تصریح شدہ مقامات کے جیسے دفعہ ۱۰۶۹ یا اطلاق سے متعلق بات، نکاح دائم و نکاح منقطع میں مشترک ہے مثلاً دفعہ ۱۰۶۲ ہے:-

"نکاح واقع ہوتا ہے ان الفاظ کے ذریعے یجاب و قبول سے جو صاف صاف ارادہ ازدواج کے معنی بتائیں"

یہ دفعہ نکاح دائم سے مختص نہیں ہے، دونوں نکاح اس کے ضمن میں ہیں۔ عقد کرنے والے، عقد یا میاں بیوی کے بارے میں جو شرائط مذکور ہیں، ان کا تعلق بھی دونوں نکاحوں سے ہے۔ اگر قانون مدنی میں نکاح موت کی تعریف نہیں تو اس کی وجہ تعریف کی ضرورت نہ ہوتی ہے۔ نکاح دائم کی تعریف بھی اسی بنا پر موجود نہیں ہے۔ اسے تعریف سے کیا سمجھا گیا ہے۔ "قانون مدنی" میں ہر اس لفظ کو موثر مانا گیا ہے جو نکاح دائمی اور منقطع کے معنی وضاحت سے ادا کر دے، لیکن اگر زوجیت کے لیے کسی لفظ کا مفہوم کے علاوہ دوسرے معنی دے، جیسے معاوضہ، لین دین، اجارہ اور کرایہ تو وہ لفظ غلط ہے، نکاح دائم اور نکاح منقطع دونوں کے لیے کافی نہیں۔

اس مضمون میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر چند فاضل جج صاحبان اور واقعی تجربہ کار قانون دان نے خوش قسمتی سے ایسے حضرات عدالتوں میں کثرت سے ہیں۔ یہ کہہ میں کہ مذکورہ غرض قانون مدنی کے نفع کے جاسکتے ہیں، تو میں آج ہی سے "زن روز" میں اپنے تمام انتقادی مضامین روک لوں گا۔

## نکاح موقت اور حرم سرا

(۳)

مشرق کے خلاف، مغرب کے پاس ایک شوٹ ہے جسے بار بار دکھاتا فلم بناتا اور تھیں کرتا ہے وہ بات ہے حرم سرا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مشرق کی سرزمین پر حرم سراؤں کے نمونے کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔

مشرقی خلفاء و سلاطین میں کچھ لوگوں کی زندگی ان داستانوں کا بھرپور نمونہ تھی۔ ان کی حرم سرا سازی، ان کی ہوس رانی و ہوس پرستی کی تصویر تیار کرتی ہے۔

کہتے ہیں۔ متعہ کو جو نہ سمجھنا، حرم سرا بنانے کی اجازت ہے۔ یورپ کے مقابلے میں ایشیا کا کمزور پوائنٹ ہے۔ متعہ کا جواز، ہوس رانی کا جواز، ہوس رانی کا جواز، اور ہوس پرستی و ہوس رانی جس شکل و صورت میں، خلاف اخلاق و ترقی ہے۔ ذلت و تباہی کا باعث۔ تعدد ازدواج کے بارے میں بھی یہی بات دہرائی جاتی ہے۔ یہ تو ایوانِ عشرت و حرم سرا بنانے کا جواز ہے۔

تعدد ازدواج کی بحث ہم آگے کریں گے۔ درست تو ازدواج موقت ہی ہے بحث کرنا اس موضوع کا دو طرح سے جائزہ لینا چاہیے، ایک اس زاویے سے کہ حرم سرا کی تشکیل کا عامل معاشرتی لحاظ سے کیا تھا؟ کیا قانون ازدواج موقت تشکیل حرم سرا و مشرق میں کوئی موثر ہے یا نہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ "قانون ازدواج موقت" کے بنانے کا مقصد ضمنی طور پر ہوس رانی، اور چند افراد کے لیے حرم سرا بنانے کا جواز مہیا کرنا تھا، یا نہیں؟

حرم سرا سازی کے معاشرتی اسباب پہلا حصہ۔ حرم سرا کی ایجاد دو عوامل کا نتیجہ ہے:

۱۔ حرم سرا سازی کا پہلا عامل، خواتین کی پاکدامنی و تقویٰ ہے۔ یعنی ماحول کے اخلاقی ضابطے اور معاشرتی اصول ایسے ہوں جہاں عورت کو اجازت نہ دی جائے کہ جب کسی مرد سے جنسی رابطہ پیدا کر لے تو دوسرے مردوں سے تعلقات قائم کریں۔ معاشرے کے اس دباؤ کی بنیاد پر عیاش آدمی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ عورتوں کا ایک ٹولہ جمع کرے اور حرم سرا تعمیر کرے۔

سادہ سی بات ہے۔ اگر اخلاقی و معاشرتی نقطہ نظر سے عورتوں پر پاک دامنی و تقویٰ کی پابندی نہ ہوتی اور عورت مفت یا بلا زحمت اپنے میس مرد کے سپرد کر سکتی اور مرد بھی ہر وقت ہر عورت سے ہوس رانی کر سکتے، تو مردوں کی مذکورہ صنف لمبی چوڑی حرم سرا میں نہ بناتے اور ان کے بھاری اخراجات اور انتظامات نہ کرتے۔

دوسرا عامل۔ اجتماعی عدالت کا فقدان۔ جب اجتماعی عدالت معدوم ہو۔ ایک سمندر میں ڈوب رہا ہو، نعمت و دولت کے سمندر میں۔ دوسرا کشتی میں پھنسا ہو۔ فقر و افلاس، معذوری و بے چارگی کی کشتی۔ مردوں کی وافر تعداد خاندان سازی و نہ دی سے محروم رہتے ہیں، اس سے غیر شادی عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس میں منظر میں حرم سرا کی تعمیر کے لیے زمین ہموار ہو جاتی ہے۔

اگر اجتماعی عدالت ہو، خاندان کی تشکیل ممکن ہو، وسائل موجود ہوں اور ہر شخص شادی کر سکتا ہو تو لازمی طور پر ہر عورت کے لیے ایک مرد ہوگا، اور عیاشی و ہوس رانی و حرم سرا کی عیسوی ماحول نہ بننے پاتا۔

عورتوں کی تعداد مردوں سے کتنی زیادہ ہوگی، یعنی اگر تکمیل بالغ مرد شادی کریں، اس کا امکان کہاں رہتا ہے کہ ہر آدمی حرم سرا بنوائے یا ہر دولت مند آدمی ایک حرم سرا بنوائے؟

تاریخ اپنی عادت کے مطابق درباروں اور خلفاء و سلاطین کی حرم سراؤں



کا تذکرہ کرتی ہے، ان کی کامرانیوں، عیش و عشرت کی تفصیل لکھتی ہے۔ اور محلوں کی دیوار تلے ناہ میوں، محرومیوں، مردہ حسرتوں، ور زروں کے ساتھ مرنے والوں کا ذکر نہیں کرتی۔ ان کے بارے میں پپ رتبی ہے جن کو معاشی کے تقاضوں نے رفیق حیات ڈھونڈنے کی مہلت نہیں دی۔ بیسیوں اور سینکڑوں عورتیں حرم سرا میں زندگی بسر کر چکی ہیں مگر ایسی عورتوں کی تعداد بھی کم نہیں جن کو فطری حق سے محروم رکھا گیا اور انہیں ایک شوہر بھی نصیب نہ ہوا۔ وہ پیچاریاں تنہا زندگی کے دن کاٹ کر گذر گئیں۔

طے شدہ بات ہے، اگر معاشی پر پائے منی کار اچ ہو، عورت کے لیے تقویٰ کی پابندی لگتے، جنسی کامیابی کا کیڑہ نکاح بنا دیا جائے (دام ہو یا منقطع) اور کوئی صورت ممکن نہ رکھی جائے۔ اقتصادی عدم توازن اور معاشی ناہمواری ختم کر دی جائے، مزایع شخص، ان کی طبیعتی حق یعنی رفیق حیات حاصل کرنے کا اہتمام ہو تو حرم سرا کی تشکیل محال نہ ممکن بن جائے۔

تاریخ پر سری نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ قانون ازدواج موقت کا ذریعہ برابر بھی دخل حرم سرا کی تعمیر و تشکیل میں نہیں تھا۔ عباسی خلفا یا عثمانی سلاطین جو اس ضمن میں سب سے زیادہ بدنام ہیں کبھی شیعہ مذہب کے و بستر نہ تھے کہ قانون ازدواج منقطع سے استفادہ کرتے۔ شیعہ سنی باوجودیکہ اس قانون سے فائدہ اٹھا سکے اور نکاح موقت کر سکتے تھے، مگر وہ سنی و شیعہ دونوں سرگرم حدود و حالات کے برابر نہیں پہنچ سکے۔ یہ قصہ بھی خاص حالات اور خاص معاشی رتی رتی کی بنا پر ہے۔ صاحبان دانش اس کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔

کیا ازدواج موقت ہوس رانی کے لیے جواز مہیا کرتا ہے؟ بحث کا دوسرا حصہ۔ آدمی ہر چیز میں شک کر سکتا ہے مگر اس بات میں کوئی شک و تردید نہیں کہ آسمانی مذاہب ہوس رانی کے خلاف ہیں، مذاہبے خواہش پرستی کے خلاف محاذ لگایا ہے۔ اکثر ادیان و مذاہب کے لوگ

ترب ہوس و مرکب خواہش کے لیے بڑی بڑی ریاضتیں چھیلتے ہیں۔

اسلام کے واضح اور مسلم اصول میں ایک بنیاد خواہشات کی پرستش سے مقابلہ ہے، قرآن مجید نے خواہش پرستی کو بت پرستی کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اسلام میں وہ شخص ملعون و ر خدا کا قبول نفرت انسان سمجھا گیا ہے جس کا مقصد ہی رنگہ رنگ عورتوں سے لذت حاصل کرنا ہو۔ "ذواق"۔ طلاق پر بحث کے ضمن میں اس موضوع پر کچھ سادہ مصادرو مدارک نقل کریں۔ متعدد شریعتوں کے مقابلے میں اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اسلام، ریاضت و رہبانیت کو مسترد کرتا ہے۔ ہوس رانی کو جائز قرار دینے کے لیے نہیں، بلکہ اسلام کی نظر میں تمام مافی جیس طبیعتی تقاضے، جنسی ہوں یا غیر جنسی۔ تقاضے کی حد میں رہیں اور طبیعت کی ضرورت بڑی حد تک پوری ہو جائے، ہاں، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ غرائز و جبلتوں کو ہوا دے اور انہیں نہ بچنے والی روحانی پیاس بنالے۔ لہذا، جو چیز بھی عیاشی، حرم سرا سازی اور ہوس ران افراد کی ہوس پرستی کا وسیلہ ہو، جس سے ایک عورت در بدر اور بچے لاوارث بنیں وہ غیر اسلامی ہے۔

انہیہم السلام کی طرف سے ازدواج موقت کی تشویق و ترغیب پر احادیث کی رو سے کا ایک فلسفہ ہے جس پر عن قریب گفتگو ہوگی۔

آج کی دنیا میں حرم سرا! یہ بھی دیکھیے کہ آج دنیا میں حرم سرا کے لیے کیا ہوا ہے؟ آج کی دنیا حرم سرا کو منسوخ

چکی ہے۔ آج کل حرم سرا کو منسوخ کیا جا چکا ہے۔ ان دنوں حرم سرا کو ناپسندیدہ دم جلتے ہیں۔ اس کے سبب عامل، وجود کو ختم کر دیا گیا ہے۔ مگر کون سا عامل و سبب؟ یا معاشی ناہمواریوں کو اٹھا دیا ہے اور اب نہ مروتوں شادیاں کرنے گئے، اس لیے حرم سرا بنانے کا عمل ختم ہو گیا؟

نہیں، ایک اور کام ہوا ہے۔ پہلا عامل و سبب یعنی عورت کی پاک و منی و تقویٰ

نے متبادل کیا، اور مرد کے لیے بہت بڑی خدمت انجام دی۔ تقویٰ اور پاک دامن جیسی قدر عورت کو قدر و قیمت بخشی ہے، اس قدر مرد کے لیے رکوت پیدا کرتی ہے۔  
آج کی دنیا نے ایک کام کیا ہے، اس صدی کی عیاش مرد، بڑے بڑے اخراجات برداشت کر کے حرم سرہانے کا محتاج نہیں ہے، اس صدی کے مرد کو مغربی تمدن کی برکت سے ہر جگہ حرم سرہانے ہے۔ اس صدی کا مرد ضروری نہیں سمجھتا کہ، راون رشید و بھی برکتی جیسی دولت کا مالک ہو پھر وہ اس تعداد میں رنگا رنگ عورتوں سے لذت اٹھائے۔

اس صدی کے مرد کو ایک موٹر کار اور ماہانہ دو تین ہزار روپے دن بھی دس بیس ہزار روپے، دیکر ہیں۔ وہ جنس خواتین سے ایسی عیاشی اور لطف اندوزی کر سکتا ہے جو، راون رشید نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ ہوٹل، رستورنٹ اور کافے، حرم کے عوض اپنے یہاں مردوں کو بلارہے ہیں۔

”عادل کو تولی“ جیسے بہت سے مرد اس صدی میں، سینہ تان کر کہتا ہے۔ وہ بیک وقت بائیس حینائیں، مختلف شکل و صورت کی عورتیں، میرے پاس ہیں۔ اس صدی کے مرد کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ اس قرن کا مرد مغربی تمدن کی برکت سے اگر کچھ کھو کا ہے تو وہ وسیع اخراجات اور زحمت و درد کے ساتھ حرم سرا ہے۔

اگر الف لیلا کا میر و قیصر سے نکل آئے اور عیش و عشرت کے وسیع امکانات اور سستی یا بدقیمت ملنے والی ماڈرن عورت کو دیکھ لے، تو کسی صورت میں اتنے زیادہ اخراجات اور مصیبتوں کے ساتھ حرم سرہانے کی جرأت نہ کرے۔ یورپ والوں نے حرم سرا کے انتظامات اور زحمتوں سے اسے معاف کر رکھا ہے۔ وہ اس بات پر ان کا شکر گزار ہوتا۔ تعدد و ازدواج اور نکاح موقت ختم ہے، کیونکہ یہ سب عورتوں کی ذمہ داری اور جواب دہی کا بوجھ ڈالنے والے کام ہیں۔

اگر آپ پوچھیں، کہ آج اور کل اس کھیل میں بازی جیتنے اور کھیل ہارنے والا کون ہے؟

سوس کے ساتھ اس کا جواب یہ ہے کہ آج اور گزشتہ زمانے میں بھی جو بازی باری ہے، وہ ہم اور سادہ دل۔ جنس خاتون۔ ہے۔

## دواج موقت سے خلیفہ کی ممانعت

ازدواج موقت، فقہ جعفری کے خصوصیات میں ہے  
دوسرے فقہی سلسلے اسے جائز نہیں جانتے۔ میں کسی  
مذہب سے بھی شیعہ سنی بحث (جس نے اسلام کو کمزور کیا ہے) میں حصہ لینے کو تیار نہیں ہوں  
مرد مسند کی مختصر تاریخ کی طرف اشارہ کرنا ضروری جانتا ہوں۔

مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہے کہ صدر اسلام میں متعہ جائز تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وآلہ وسلم نے سفر میں ان مسلمانوں کو متعہ کی اجازت دی تھی جن کی بیویاں دور تھیں  
ان پر بھی اتفاق ہے کہ دوسرے خلیفہ نے اپنی خلافت میں متعہ کو حرام کر دیا تھا۔ انھوں نے  
”مشہور جسد فرمایا“، دو چیمبریں زمانہ پیغمبر میں جائز تھیں میں ان دونوں کو حرام قرار  
نہا ہوں، جو بھی وہ دونوں کام کرے گا میں سزا دوں گا۔ متعہ زن۔ اور متعہ حج۔  
ہل سنت کے ایک گروہ کے خیال میں، رسول اکرمؐ نے آخر عمر میں خود، متعہ کو ممنوع  
کر دیا تھا اور دوسرے خلیفہ کی ممانعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تھی۔  
یہ تو عبارت جناب خلیفہ کی طرف سے نقل ہے وہ اس مدعا کے خلاف ہے۔

اس مفہوم کی صحیح تعبیر وہی ہے جسے علامہ کاشف الغطاء نے پیش کیا ہے۔ خلیفہ نجیال  
یہ حق رکھتے تھے کہ وہ اس بارے میں پابندی لگا سکیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں  
کوئی امر کے دائرہ اختیار میں تھا اور جو حاکم و ولی چاہے وہ تقاضائے وقت کے مطابق  
اسم کے اختیارات سے فائدہ اٹھائے۔

تھیل کے لیے دیکھ شیخ عبد حسین امینی مرحوم کی کتاب ”الفہرست جلد ششم“۔



دوسری لفظوں میں خلیفہ دوم کی ممانعت سیاسی تھی شرعی و قانونی نہیں تھی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اپنی قیادت کے زمانے میں صحابہ کے دور دراز علاقوں میں منتشر ہونے کو پسند نہ کرتے تھے، وہ آزادہ مفتوحہ علاقوں میں پھیلتے اور نو مسلم قوموں سے پہلے ملاپ کے بارے میں اپنی پریشانی نہ چھپاتے تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے انھیں مدینے سے باہر پھیلنے سے روکتے رہے۔ لہذا وہ اس بات کو بہت برا جانتے تھے کہ نو مسلم قوم بھی اسلامی جملات کی گہری تربیت سے آراستہ نہیں، ان کے خون سے ان مسلمانوں کے خون کی آمیزش ہو۔ وہ آئندہ نسل کے لیے اسے خطرہ سمجھتے تھے۔ کھلی سی بات ہے کہ یہ مصلحت وقتی تھی۔ چنانچہ اس زمانے کے مسلمان ان کی ممانعت کو ایک سیاسی مصلحت اور وقتی ضرورت سمجھ کر حکم مان گئے۔ نہ کہ دائمی قانون۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ خلیفہ وقت یہ کہے کہ پیغمبر نے یوں حکم دیا ہے اور میں یہ فرمان جاری کرتا ہوں، پھر مسلمان بھی اسے مان لیتے۔

لیکن بعد میں خصوصی واقعات کی وجہ سے "سیرت خلفاء مابقی" خصوصاً پہلے دو خلیفہ۔ یہ اصول بن گیا اور تعصب اس درجہ پہنچ گیا، کہ اس نے قانون کی شکل حاصل کر لی۔ اس صورت حال میں خود ہمارے سنی بھائیوں پر جو اعتراض ہے وہ خود جناب خلیفہ سے زیادہ ہے۔ خلیفہ نے بطور سیاسی اور وقتی ضرورت کے۔۔۔ جیسے ہماری صدی میں سکائرسٹیرز نے شیرازی نے تمباکو نوشی حرام کی تھی۔ نکاح منقطع کو حرام کیا، دوسرے کو یہ حق نہ تھا کہ اسے دوامی قانون بنا لیتے۔

۱۔۔۔ حضرت ابن شہ قچہ نے ریاضی کینی سے یمن میں تمباکو کی پیداوار اور فروخت کے ٹیکے کا معاہدہ کر لیا جو ایرانی عوام و ملک کے لیے تباہی خیز ثابت ہوا۔ وقت مزید، عظیم میرزا محمد حسن شیرازی نے تمباکو نوشی کی حرمت کا فتویٰ دے دیا جو انقلاب اور برطانوی تہذیب کی خلاف ورزی نتیجہ انقلاب پر منتج ہو جس بعد مشرور قائم ہوئی۔

ظاہر ہے کہ علامہ کا شرف لفظاً شیخ محمد حسین کی نظر میں یہ بحث نہیں ہے کہ خلیفہ کا یہ مسئلہ اصلاً صحیح تھا یا نہیں؟ یہ بھی زیر نظر نہیں کہ آیا مسئلہ متوازن مسائل میں ہے بھی جن پر خود نواری ہی دیر کے لیے کیوں نہ ہو مسلمانوں کا شرعی ولی قدغن لگا سکتا ہے یا نہیں؟ زاویہ نظر فرمایا ہے کہ شرعی میں جو بات ہوئی ہے اس کا عنوان یہ تھا، ورنہ یہی سبب کہ مسلمانوں نے اس کی مانعت نہیں کی۔

خلیفہ کی شخصیت اور اثر عوام کا ان کی سیرت و رویہ کو اپنا حکمرانی کے معاملے میں ان کے طور پر تقویٰ کا انداز سبب تھا کہ یہ قانون بھول کی نذر ہو گیا اور یہ دستور جو نکاح دائمی کی تکمیل کا ذریعہ تھا، ہمیشہ کے لیے متروک ہو گیا، نتیجہ میں متعدد مشکلات پیدا ہوئے۔

ائمہ معصومین کو دین مبین اسلام کا محافظ سمجھا جاتا ہے اسی بنا پر ان حضرات نے اسلام کے اس دستور کو فراموشی اور گم نامی سے بچانے کے لیے بڑھ چڑھ کر شوق کی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ایک بات جسے بیان کرنے میں کبھی تقیہ نہ کروں گا، وہ مسئلہ "متعد" ہے۔

اسی نکتے پر "تشریح متعد" کی مصلحت و حکمت ثانوی حکمت اولیٰ سے مل جاتی ہے۔ اور وہ ہے "متروک شدہ دستور" کا احیا۔ میرے نقطہ نظر سے، جہاں جہاں ائمہ اہل بیت نے شریعت کو متروک کر دیا، وہاں "قانون کی حکمت اولیٰ" کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ قانون متعد ان لوگوں کے لیے وضع نہیں کیا گیا جن کو ضرورت نہیں ہے، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے علی بن قہطین سے فرمایا: تمہیں متعد کرنے کی ضرورت کیا ہے، خدا نے تمہیں بے نیاز کیا ہے۔

دوسرے شخص سے فرمایا: متعد اس کے لیے ہے جسے اللہ نے بیوی کے ہوتے ہوئے اس سے بے نیاز نہ کیا ہو جس کی بیوی ہو وہ صرف اس صورت میں متعد کر سکتا ہے جب اپنی بیوی پر ترس

نہ رکھتا ہو۔

جہاں عمومی طور پر ترغیب و تشویق کی بات ہے وہاں اس قانون کی دوسری جہت سامنے رکھی گئی ہے، یعنی ”متروک ستور کی بحالی“ ورنہ فقط ضرورت مند افراد کو ترغیب و تشویق سے مقصد حاصل کافی نہ تھا۔

شیعہ روایات سے یہ مطلب بخوبی واضح ہے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ قانون ساز کے پیش نظر اور ائمہ طاہرین کے سامنے ترغیب و تشویق کا مدعا جانور صفت انسانوں کے لیے ہوس رانی و حرم سرا سازی کا بہانہ مہیا کرنا نہ تھا، یہی نہیں کہ چند ناواقف حال خواتین اور بے سرپرست بچوں کو جبر و مشکلات میں مبتلا کیا جائے۔

**حضرت علی علیہ السلام**  
**کی ایک حدیث**  
زن روز شمارہ ۸۷ میں جناب مہدوی لکھتے ہیں:  
ابو زہرہ کی کتاب الاحوال الشعیہ میں امیر المؤمنینؑ

سے منقول ہے:

”لا اعلم لحدائمتن و هو محصن الا رجمتہ بالجمارۃ“

جناب مہدوی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”جب بھی مجھے معلوم ہوا کہ نااہل آدمی نے متعہ کیا ہے میں اس پر ”زنا محصن“ کی حد، سنگسار کی سزا جاری کروں گا۔“

پہلی بات۔ اگر یہ طے کر لیا جائے کہ حضرت علیؑ کی حدیث کے سامنے ہمیں تسلیم خم کرنا ہی چاہیے، تو حضرت کی اتنی حدیثیں جو شیعہ و غیر شیعہ کتابوں میں درج ہیں اور متعہ کی تائید و تاکید کرتی ہیں انھیں کیوں چھوڑا جائے اور ایک ایسی روایت جس کے راوی علماء اہل سنت کے ایک عالم ہیں۔ قبول کر لی جائے، پھر اس کی بھی سند معلوم نہیں۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کے قیمتی ارشادات میں سے ایک یہ ہے:

”اگر تم آگے نہ بڑھتے اور متعہ کو حرام نہ کرتے، تو بد نصیب افراد کے سوا کوئی زنا نہ کرتا۔“

یعنی اگر متعہ حرام نہ کیا جاتا تو غریزہ کے جبر سے متاثر ہو کر کوئی شخص زنا پر آمادہ نہ ہوتا۔ یکم وہی لوگ کرتے جو قانون شکنی کو ترجیح دینے کے عادی ہیں۔

دوسری بات۔ مذکورہ بالا عبارت کے معنی ہیں:

”جب بھی مجھے معلوم ہوا کہ نااہل آدمی نے متعہ کیا ہے اسے سنگسار کروں گا۔“  
مجھے نہیں معلوم، جناب مہدوی نے محصن کے معنی ”نااہل“ کہاں سے لکھے دیے جبکہ اس کے معنی ہیں ”وہ شخص جس کی بیوی ہو۔“

بنا بریں روایت کا مطلب ہے کہ جن کی شادی ہو چکی، بیوی موجود ہے، انھیں متعہ کرنے کا حق نہیں۔ اگر متعہ یہ ہوتا کہ متعہ کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے، تو ”وہو محصن“ کی قید بے معنی ٹھہری گی۔ خیر۔ اگر اس روایت کی کوئی بنیاد ہے تو اس سے تائید ہوتی ہے اس نظریے کی جو کہتے ہیں:

”قانون متعہ ان لوگوں کے لیے وضع ہوا ہے جو عورت کے محتاج ہے

مجرد ہیں، یا ان کی بیویاں ان کے پاس نہیں ہیں۔“

یعنی یہ روایت ”متعہ“ کے جواز کی دلیل ہے نہ کہ حرمت متعہ کی۔



## تمیہ راحہ :

# عورت اور معاشرتی آزادی

- — پیدا ہونے سے پہلے شوہر۔
- — لڑکیوں کا بادلہ۔
- — حضرت علیؑ کی خواستگاری کے جواب میں آنحضرتؐ کا جواب ”میں فاطمہؑ کے سامنے بات رکھوں گا۔“
- — نوآئین کا اسلامی انقلاب — سفید — تھا۔
- — اسلام کے نزدیک باپ مختار مطلق نہیں ہے.....
- — مرد بندہ خواہشات، عورت اسیر محبت۔
- — اسلام نے عورت کو بے اختیار نہیں کیا۔ اس کو مردوں کی سکا دوستی سے بچایا ہے۔
- — بیٹی پر باپ ولایت — ایک بحث۔

## سرنوشت کے انتخاب میں آزادی

پریشاں و ہراساں لڑکی رسول اکرمؐ کے حضور میں پہنچی :

یا رسول اللہ! اس باپ کے ہاتھوں.....

..... آخر تمہارے باپ نے کیا ہے تجھ سے ؟

— ایک بھتیجی سے، میرے شوہر کے بغیر میری شادی کر دی !

— اب تو وہ کرچکا، تم چپ ہو جاؤ مخالفت نہ کرو، تائید کرو اور چچا زاد کی بیوی

بن کر رہو۔

— یا رسول اللہ! چچا زاد سے مجھے محبت نہیں، ایسے شخص کی بیوی کیسے بنوں جس سے

محبت نہیں کرتی ؟

— اگر میں سے محبت نہیں، کوئی بات نہیں۔ تمہیں اختیار ہے، جاؤ جس سے تمہیں

محبت ہے سے پنا شوہر بن لو !

— اتفاقاً میں اس کو بہت چاہتی ہوں۔ اس کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتی۔

اس کے سوا کسی کی بیوی نہیں بن سکتی۔ بات تو اتنی ہے کہ میرے والد نے مجھ سے رائے

کیوں نہ لی۔ میں جان کر حاضر ہوئی ہوں کہ آپ سے سول جواب کروں اور یہ جملہ سن لوں،

خواتین تہائی کو تباہیوں کے باپ بطور خود متنی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اپنی بیٹیاں جس کو ان کا

دل چاہے اس کے حوالے کر دیں۔

شہید ثانیؒ نے "مسائلک" اور شیخ حسنؒ نے "جوہر الکلام" میں اور دور سے فقہاء اہل سنت کی یہ روایت نقل کی ہے، جاہلیت عرب میں غیر عربوں کی طرح باپ اپنی بیٹیوں، اپنی بہنوں کو بھی تو اپنی ماں کے بارے میں اپنا حق یہی سمجھتے تھے کہ جس سے چاہیں بیاہ دیں، اور خواتین بے اختیار تھیں۔ وہ اپنی پسند اور اپنے اختیار سے شوہر کا انتخاب نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ اختیار ان کے خیال میں باپ کو پھر بھائی اور ان دونوں کی غیر موجودگی میں چچا کو حاصل تھا۔

اختیار کے استعمال کی حد یہاں تک پہنچی کہ لڑکیاں پیدا ہونے سے پہلے، مرد کے رشتے میں دے دی جاتی ہیں، لڑکی کے پیدا ہونے اور بڑی ہونے کے بعد اس مرد کو حق تھا کہ وہ لڑکی کو اپنے لیے لے جائے۔

جنم سے پہلے نکاح | رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری حج تھا، ایک روز آپؐ ہاتھ میں کوڑا لیے سوار جا رہے تھے، ایک آدمی راستہ

روک کر کہا :

— ایک شکایت ہے !

— بیان کرو !

— چند برس پہلے، جاہلیت کے دنوں میں، میں اور طارق بن مرتع ایک جنگ میں شریک

ہوئے، مصروفیات جنگ میں نیزے کی ضرورت پڑی۔ اس نے پکار کر کہا : کوئی ہے جو مجھے

نیزہ پہنچا کر مزدوری لے ! میں آگے بڑھا اور پوچھا کیا ملے دو گے ؟ اس نے کہا : میرے یہاں

۱؎ شہید ثانی، زین الدین بن علی ابن احمد العالمی (۹۱۱ - ۹۶۶ھ) کی کتاب فقہ مفصل کا نام ہے مسائلک۔

شرح مذہبی انہیں کی تالیف ہے۔

۲؎ جوہر الکلام، مشرک الاسلام کی مفصل شرح کے مصنف تھے شیخ محمد حسن نجفی متوفی ۱۲۶۶ھ۔

۳؎ سنی کتابوں میں دیکھیے سنن ابن ماجہ ص ۵۷۸

شیعہ کتابوں میں دیکھیے جوہر الکلام، چاپ بیروت ج ۳ ص ۱۷۷



بوتر کی پیدا ہوگی وہ تمھاری، اسے پال پوس کر جواں کروں گا۔ میں نے عملہ منظور کر لیا اور اپنا  
بیزہ اسے دے دیا۔ قصہ ختم ہوا، جنگ کو کئی برس گزر گئے۔ ایک دن خیال آیا، خبر پوچھی،  
معلوم ہوا اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اب وہ شادی کے قابل ہے۔ میں طارق کے پاس  
گیا اور وہ بات یاد دلائی اور اپنے قرض کا مطالبہ کیا۔ اس نے چلے حوالے اور بہانے کرنے  
شروع کر دیے۔ وہ مجھ سے دوبارہ مہر لینے کی فکر میں ہے۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا  
ہوں، یہ فرمائیے میں تھی پر ہوں یا وہ؟

— لڑکی کا سن کیا ہے؟

— لڑکی بڑی ہو چکی ہے، سکر بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔

— اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو حق پڑ تم ہو، نہ طارق، غریب عورت کو اس کے حال پر چھوڑ دو،  
اور تم اپنا کام کرو۔

وہ آدمی حیران ہوا، پیغمبر علیہ السلام کو دیکھتا رہا۔ سوچ رہا تھا، یہ کیسا فیصلہ ہے، باپ کے  
اپنی بیٹی پر اختیار نہیں، میں لڑکی کا نیا مہر، باپ کو دے دوں اور وہ اپنی خوشی و رضامندی  
سے اپنی لڑکی میرے حوالے کر دے تو غلط کام ہوگا۔؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی بھٹی بھٹی نگاہوں کو دیکھ کر سمجھ گئے، اس  
پیشانی خیال کو مد نظر فرما کر کہا:

— "پریشان نہ ہو، میں نے جو بات کہی ہے اس سے تم گنہگار نہ ہو گے نہ تمھارا دوست  
طارق۔"

لڑکیوں کا ادلہ بدلہ: لڑکیوں پر باپ کے مکمل اختیار کا ایک منظر نکاح "شفارہ"  
تھا، نکاح "شفارہ" یعنی لڑکیوں کا عوض معاوضہ۔ دو

آدمیوں کی دو لڑکیاں شادی کے قابل ہوں۔ لوگ ان کا ادل بدل کرتے تھے، یعنی  
ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر بنتی تھی۔ اسلام نے یہ دستور منسوخ کر دیا۔

رسول اللہ نے اپنی صاحبزادی  
حضرت زہراؓ کو انتخاب مہر میں آزاد رکھا

حضرت علیؓ کو جواب دیا، اب تک کئی آدمی طلب  
کے لیے آئے ہیں، میں نے خود ان کی بات زہراؓ سے کہی، انھوں نے مہر کے ثمار سے نہار  
نا منظور کیا۔ اب میں تمھاری بات بھی کہوں گا۔

پیغمبر، فاطمہ زہراؓ کے پاس گئے اور پیاری بیٹی کو رشتے کا آیا ہوا پیام سنایا، پیدہ عالمیا  
نے، منہ نہ پھیرا اور خاموش بیٹھی رہیں، سکوت سے رضامندی کا اظہار دیکھ کر آنحضرتؐ  
تجسیر کہتے ہوئے فاطمہ کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے۔

اسلامی تحریک میں  
خواتین کا اطلاق سفید

خواتین کے لیے اسلام نے بہت بڑی خدمتیں انجام  
دی ہیں۔ اسلام نے صرف یہی نہیں کیا کہ بیٹی پر باپ کے  
تمام تر اور مکمل اختیارات واپس لے لیے، بلکہ اسلام  
نے عورت کو مکمل آزادی اور شخصیت عطا کی، فکر و نظر کو آزادی بخشی، عورت کے طبعی  
حقوق کو قانونی حیثیت دی۔ حقوق خواتین کے بارے میں اسلام نے جو اقدامات کیے ہیں  
اور یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے، دوسرے ممالک جو اس کی راہ میں بہہ رہے ہیں۔ ان کا جائزہ  
لیا جائے تو اسی طور پر دو فرق ملیں گے۔

ایک تو زن و مرد کے نفسیات کے زاویہ نظر سے فرق ہے، اسلام نے اس سلسلے میں  
مبغضہ دکھایا، ہم آئندہ اوراق میں اس پر گفتگو کریں گے اور کچھ مثالیں سامنے رکھیں گے۔  
دوسرا فرق یہ ہے کہ عین اس وقت جبکہ وہ خواتین کو ان کے انسانی حقوق، ان کی  
شخصیت و حیثیت و آزادی و خود مختاری دے رہا تھا، اس لمحہ جنس مرد سے، نہیں بغاوت  
کشی و نافرمانی پر نہیں ابھارا اس نے کبھی بھی مردوں سے برابری اور ان کے بارے

میں غلط اندیشی کی تحریک نہیں کی۔

خواتین کا اعتدال سفید تھا، سیدہ، سرنج، نیلا اور زعفرانی تھا۔ یہ انقلاب بیٹوں کے باپ کا احترام اور بیٹوں سے شوہروں کا احترام چھیننے نہیں آیا۔ اسلام کے انقلاب نے گھریلو زندگی کی بنیاد نہیں بدلی، بیویوں کو شوہروں کی خبر گیری اور ماں کو تربیت اولاد سے بدظن نہیں بنایا، بے شادی شدہ لڑکوں کے لیے ایسے وسائل نہیں پیدا کیے جن کے سہارے وہ معاشرے میں مفت کے تسکین کھیں سکیں، خواتین کو شوہروں کی پاک غوش اور بیٹیوں کو ماں باپ کے سایہ مہر و محبت سے نکال کر افسروں اور سرمایہ داروں کے حوالے نہیں کیا، کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا کہ آسٹروں کے سمندر میں طوفان اٹھے۔ ہائے، گھر کا امن و سکون تباہ ہو گیا، باپ کے دل سے اطمینان چھن گیا۔ اس افراتفری میں آدمی کیا کرے؟ نومو لوڈ بچوں کا قتل، اسقاط، کا عدج کیا ہے؟ چالیس فی صد جائز بچوں کی پیدائش کا حل کیا ہے؟ نومو لوڈ بچے، جن کا باپ نہیں ملتا، ماؤں نے اپنے بچے پتے گھروں میں جتنے ہیں۔ چاہنے والے باپ کے گھر میں پیدا نہیں ہوئے۔ ان کا اس بچے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بچہ ”پرورش گاہ“ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ وہاں کوئی ان کی خبر لینے نہیں آتا۔

ہمارے ملک میں ”خواتین کے انقلاب“ کی ضرورت ہے۔ لیکن سفید اسلامی انقلاب مغربی کالی کھوٹی انقلابی تحریک درکار نہیں۔

ایسا انقلاب جس میں شہوت پرست جوانوں کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ وہ انقلاب جو براہ راست اسلام کے عملی تعلیمات سے مستفید ہو۔ یہ نہیں کہ اس کا مدعا صرف ”قانون مدنی“ بدانا ہو۔ یعنی اسلام کے مسلم قوانین ہوں اور جس کا نشانہ بنائے جائیں۔ وہ انقلاب جس کی پہلی منزل عیسیٰ و گھر مطالعہ ہو تاکہ یہ بات کھل کر سامنے آئے کہ جس معاشرے کا نام اسلام سے وابستہ کیا گیا ہے، وہ کس حد تک اسلام کو نافذ کرتا ہے۔

فدائی تو بیٹے سے اگر یہ سلسلہ مضامین باقی رہا تو اہم مسائل کو مکمل کرنے کے بعد خواتین کے

اسلامی انقلاب کا ایک پروگرام شائع کروں گا جس کا واضح ہو گا کہ ایسی خواتین واقفاً ایک ایسا انقلاب لاسکتی ہیں، جو نیا اور دنیا پسند بھی ہو اور منطقی و بادیں ہونے کے ساتھ ساتھ چودہ سو سالہ اسلامی تعلیمات کے سرچشمے سے سیراب بھی ہو جس میں مغرب کی طرف بھٹکنا نہ تھوڑا پھیلا یا گیا ہو۔

**باپ کی اجازت:** باپ، لڑکی کا ولی ہے۔ یعنی، کیا دو شیزہ لڑکیاں تو پہلی مرتبہ شادی کرنا چاہیں انھیں باپ کی اجازت لینے کی شرط ہے یا نہیں؟

**اسلام کی نظر میں:** لڑکا اور لڑکی اگر اقتصادی طور پر خود کفیل ہوں بالغ و عاقل، ”نیز رشید“ بھی ہوں۔ یعنی معاشرتی لحاظ سے ان کا فکری معیار اس قدر ہو جس کی بنیاد پر وہ اپنے مال کا تحفظ و نگہداشت کر سکیں، ان کا سرمایہ ان کے ہاتھ میں رہ سکے۔ تو ماں یا باپ، ماں یا شوہر، بھائی یا کسی دوسرے آدمی کو ان پر نظارت و دخل اندازی کا حق نہیں ہو سکتا۔

دوسری طے شدہ بات شادی کے بارے میں ہے۔ اولاد، بالغ ہونے کی عمر پہنچ جائے، عقل و رشد بھی ہو۔ تو اپنے بارے میں وہ خود مختار ہیں، کسی کو ان کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں۔ لڑکیوں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی ایک مرتبہ شوہر رکھ چکی ہے اور اب بیوہ ہے تو وہ بھی لڑکے کی طرح خود مختار ہے اور کسی کو اس کے معاملے میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ ہاں اگر دو شیزہ ہے اور اس کا پہلا نکاح سنا تو...؟ باپ کو مکمل اختیار نہیں، لڑکی کا عذر یہ اور اس کی رضامندی کے بغیر جس کے ساتھ یہ نہا جائے نہیں بیاہ سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہم نے دیکھا ہے، بیٹی کی رائے کے بغیر نکاح کر دیا تو آپ نے فرمایا: ”پسند نہیں تو دوسرے کے ساتھ



شادی کر سکتی ہو۔ فقہاء میں اس نقطہ نظر سے اختلاف ہے کہ آیا دوشیزہ لڑکیاں، بچا کی رضامندی حاصل کیے بغیر شادی کا حق نہیں رکھتیں؟ یا باپ کا اتفاق رائے کسی طرح شرط صحت نکاح نہیں ہے؟

ابتداءً ایک مسئلہ قطعی و مستمب ہے کہ اگر باپ کسی سبب کے بغیر لڑکی کے نکاح کو منع کریں تو ان کا حق (ولایت) ساقط ہو جاتا ہے۔ اور بالفاق تمام فقہاء لڑکی انتخاب شوہر میں مکمل آزادی کی مالک ہیں۔

رنیہ کہ یا باپ کی رضامندی شرط ہے یا نہیں؟ ہم نے بتایا کہ فقہاء میں اختلاف ہے۔ شاید اکثر فقہاء خصوصاً متاخرین علماء (آخری دور کے فقہاء) باپ کی رضامندی کو شرط نہیں جانتے، مگر بعض علماء متاخر شرط جانتے ہیں۔ ہمارے "قانون مدنی" نے دوسرے گروہ کے فتوے کو قانون بنایا ہے کیونکہ احتیاط کا راستہ یہی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے کیونکہ مسودہ اتفاق نہیں اس لیے ہم اسلامی نقطہ نظر سے بحث بھی نہیں کرتے۔ بدتہ معاشرتی لحاظ سے بحث ضروری سمجھتا ہوں اس کے علاوہ میری رائے میں "قانون مدنی" نے صحیح راہ اختیار کی ہے۔

بن یا ہی لڑکیوں پر لازم۔ کم از کم ان کے لیے اچھا ضرور ہے کہ باپ کی ہم نیلی کے بغیر کسی مرد سے شادی نہ کریں۔ اس کا فلسفہ یہ نہیں ہے کہ لڑکی کو ناقص بن دیا جائے۔

اور معاشرتی لحاظ سے اس کا شعور مرد سے کمتر سمجھا گیا ہے۔ اگر یہی بات ہوتی تو سولہ برس کی بیوہ اور اٹھارہ برس کی بن یا ہی میں فرق کیا ہوگا، سولہ برس کی عمر والی بیوہ باپ کی رضامندی کی پابند نہ ہو اور اٹھارہ برس کی بن یا ہی رضامندی پر پابند ہو۔ پھر یہ بات بھی دیکھیے، اگر لڑکی اسلام کی نظر میں اپنے معاملات میں ناقص سمجھی جاتی تو بالغہ و رشیدہ لڑکی اپنے مالی امور اور ملینوں، بلینوں سرمایے کے معاملے میں، باپ بھائی

اور شوہر کے راضی ہونے یا اجازت لینے کی پابند کیوں نہیں؟ اور انھیں دینے کا حق کیوں نہیں؟ اس کے اقدامات صحیح اور وہ سب سے زیادہ کیوں ہے؟ دراصل یہاں ایک دوسرا فلسفہ ہے۔ فقہی دلائل سے قطع نظر۔ اس فلسفے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور قانون مدنی "تیار کرنے والوں کی اس بنیاد پر داد دینا چاہیے۔"

بات، عورت میں کمی یا عقلی و فکری نقص ہی کی نہیں۔ اس کا تعلق مرد و عورت کے نفسیات سے ہے۔ اس کا ربط ایک طرف مرد کی فطرت نکار پسندی اور دوسری طرف عورت کے حسن ظن سے ہے وہ مرد کی وفا، سچائی اور محبت پر جلدی سے ایمان لے جاتی ہے۔ مرد، خواہشات کا غلام اور عورت اسیر محبت ہے، مرد کے پیر شہوت سے لڑکھڑکاتی ہیں مگر ماہرین نفسیات کے بقول عورت، جنسی خواہشات کے بارے میں مرد سے زیادہ معاشرہ پر پابند رہے۔ ہاں، عورت کو حث کرنے والی چیز انہما رحبت و خلوص، وفا و محبت ہے وہ مرد سے یہ باتیں سن کر لڑکھڑکاتی ہے۔ عورت کی خوش فہمی یہاں کھل جاتی ہے۔ عورت جب تک بن یا ہی ہے، جب تک اس کے لباس نے مرد کا صابن مس نہیں کیا، اس وقت تک وہ مرد کے زمرہ محبت کو جلدی سنتی اور ماننے لگتی ہے۔

معلوم نہیں آئیے "زن روز" کے شمارہ نمبر ۹۰ میں، مرکزی ماہر نفسیات کا مضمون پڑھا یا نہیں؟ پروفیسر ریگ کے مضمون کا عنوان تھا "عورت و مرد کے لیے دنیا ایک جیسی نہیں ہے۔" پروفیسر لکھتا ہے کہ بہترین فقرہ جو ایک مرد کسی عورت سے کہہ سکتا ہے وہ ہے "پیاری، میں تمھیں چاہتا ہوں۔" روزمرہ و محاورہ۔ پھر ریگ نے لکھا، ایک عورت کے وسطے سب سے بڑی خوش نصیبی، ایک مرد کا دل موہنا، اس کی زندگی بھر دیکھ بھال ہے۔

سولہ کریم، وہ نفسیات کے خدائی ماہر اس حقیقت کو چودہ سو برس پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اپنے فرمایا: "میں تمھیں چاہتا ہوں۔" ایک جملہ ہے جو عورت کے دل سے نہیں نکلتا۔ "سکاری مرد، عورت کی اس نفسیاتی کمزوری سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ "پیاری"

بہ تو تمہارے عشق میں مر رہے ہیں۔ مردوں کے تھکھنڈوں سے ناواقف لڑکیوں کے لیے یہ بہترین جال ہے۔

”زن روز“ کے تازہ شماروں میں، افسر نامی خاتون کی داستان چھپ رہی ہے۔ یہ خاتون خودکشی کرنا چاہتی ہے۔ جو اپنے اس کو فریب دے رکھا تھا، بات کچھری تک پہنچی اور زبان زد عام ہو گئی۔ جو اپنے افسر کو اپنا گرویدہ بنانے کے لیے، مذکورہ فارمولے سے فائدہ اٹھایا، بقول رسالہ زن روز، افسر کہتی ہے:

”میں نے اس بات کو نہیں کی، مگر ہر ساعت اور لمحے اسے دیکھنے کو ترغیب دیتی تھی میں تو عاشق نہ تھی، مگر جس عشق کا اظہار وہ کرتا تھا اس سے میری روح کو نیاز ضرور تھی۔ ساری عورتوں کا حال یہی ہے ”عشق“ کو پسند کرنے سے پہلے ”عاشق“ پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ لڑکیوں اور خواتین کی پیدائش سے پہلے، عاشق ان کے بعد عشق پیدا ہوتا ہے۔ اس قانون میں بھی مستثنیٰ نہ تھی۔“

تجربہ کار، بیوہ پر یہ تازہ واردات بیت گئی تو نا تجربہ کار لڑکیوں کا حال کیا ہوگا۔ یوں لازمہ قرار پایا کہ ”مرد نہ آموزہ“ لڑکی باپ کی رضامندی بہر حال حاصل کرے۔ باپ مرد کے احساسات، جذبات و نفسیات سے بہتر آگاہ ہوتے ہیں۔ چند افراد و خاندانوں کو چھوڑ کر، باپ اپنی بیٹی کی خیر خواہی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ لہذا ان سے مشورہ مفید و لازم ہے۔

قانون، سنکتے پر کسی انداز سے بھی عورت کی توہین نہیں کرتا۔ اس نے تو حمایت کا ہاتھ کا ندھے پر رکھا ہے۔ اگر لڑکا دعویٰ کرے کہ قانون نے انھیں باپ یا ماں کی رضا حاصل کرنے کا پابند کیوں نہیں کیا۔ تو ن کا دعویٰ منطق کے خلاف نہ ہوگا۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو لڑکیوں کی ہم آہنگی پر مبنی ہیں۔

”عجب کرتا ہوں، لوگ روزانہ“ بیوک و نہرہ“ عادل و سرین“ کے افسانے

در ڈرامے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ پھر لڑکیوں کو اولیا کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔

ان کے کردار میں تضاد محسوس کرتا ہوں۔ عورت کے بارے میں ان کی ہمدردی و ہم خواری دیکھو، پھر سکاریوں کے لیے سکاڑیاں کرتے، گویاں دیتے اور لڑکیوں کے گتے کو ہٹا کر زنا سے پرہیز کرتے ہیں۔

○

”زن روز“ شماره ۸۸ میں چالیس نکاتی قرار داد کے مصنف نے کہا ہے:

”دفعہ ۱۰۴۳۔ بلوغ و رشد سے متعلق تمام دفعات، کی مخالف اور ان کو توڑنے

والی دفعہ ہے۔ نیز آزادی انسان اور منشور اقوام متحدہ کے خلاف.....“

معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے سوچ رکھا ہے کہ مذکورہ دفعہ باپ کو حق دیتی ہے وہ جسے چاہیں اپنی بیٹی دے دیں اور انھیں بلاوجہ شادی روکنے کا بھی حق ہے۔

باپ غلط اندیش اور بنیت نہ ہو، جو لڑکی کو شادی ہی نہ کرنے دے۔ اس صورت میں لڑکیوں کو با اختیار مان کر شادی کے صحیح ہونے کی شرط باپ کی رضامندی مان لی جائے تو کیا خرابی ہے، اور انسانی آزادی کے منشور کی کیا خلاف ورزی ہے؟ یہ تو ایک احتیاطی اقدام اور پیش بندی ہے۔ ان خواتین کے لیے جن کا سابقہ تجربہ کچھ نہیں ہے۔ اور مرد کی حیثیت و طبیعت کے بارے میں بے اطمینانی کی وجہ سے یہ احتیاطی تدبیر کی گئی ہے۔

مضمون نگار کہتے ہیں:

”ہمارے قانون ساز نے تیسرے برس کی لڑکی کو شادی کے قابل قرار دیا ہے۔ ابھی اس کی فکری نشوونما پوری نہیں ہوئی۔ اصولاً اسے شادی کے معنی اور بیوی بننے اور شوہر بنانے کا مطلب بھی نہیں آتا۔ ایسی مخلوق جو دو چار سیر ترکاری بھی نہیں خرید سکتی، تیسرے کہ شادی کرے اور زندگی بھر کا ساتھی قبول کرے۔ اس کے متعلق میں پچیس یا چالیس سالہ خاتون، تعلیم یافتہ، یونیورسٹی کی ہوا کھائے، اعلیٰ درجے کی دانش ور کو شادی کا حق نہیں،



بلکہ ضروری ہے۔ وہ بے پڑھے باپ یا دادا سے اجازت اور رائے حاصل کرے۔۔۔

پتے تو قانون کے کس جزے اپنے یہ دریافت کیا کہ تیس برس کی لڑکی باپ کی اجازت سے بغیر شادی کر سکتی ہے اور تیس یا چالیس برس کی لڑکی "دانش گاہ دیدہ" قانون شادی نہیں کر سکتی۔ دوسرے بے گناہ باپ کی اجازت انھیں حدود میں ہے یہاں وہ جذبہ پدری اور مرد کے ان احساسات کا نڈازہ کر کے جو عورتوں کے بارے میں ہوا کرتے ہیں لیکن اگر کاؤ بننے کا روپ دھارے تو اس کی اجازت بے قیمت ہے۔

تیس برس میں نہیں سمجھتا کہ عہد قدیم سے آج تک کوئی ایسا ج پیدا ہوا اور دکھائی دیا ہوا جس نے "قانون مدنی" کی رو سے کہا ہو کہ فکر و عقل کی پختگی (درشد عقلی) شادی میں شرط نہیں ہے۔ اور بقول مضمون نگار تیس سالہ لڑکی جسے شادی اور انتخاب شوہر کے معنی معلوم نہ ہوں وہ شادی کر سکتی ہے۔

قانون مدنی، دفعہ ۲۱۱ میں ہے :

"دو معاملہ کرنے والے اہل سمجھے جائیں، اس کے لیے بالغ و عاقل و رشید ہونا چاہیے۔"

قانون کے اس فقرہ میں اگرچہ "معاملہ کرنے والے" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور باب نکاح - معاملہ نہیں لیکن اس کے ساتھ ایک مجموعی عنوان ہے "عقود، معاملات، پابندیاں" یہ پیرگراف دفعہ ۱۸۱ سے شروع ہوتا ہے۔ قانون مدنی کے ماہرین نے دفعہ ۲۱۱ کو "اہلیت عام" - عمومی صلاحیت - کے طور پر مانا ہے۔ یہ اہلیت تمام "عقود" میں جہاں جہاں صیغہ معینہ جاری کیا جائے (لازمی قرار دی ہے)۔

تمام پرانی دستاویزوں اور نکاح ناموں میں "بالغ و عاقل و رشید" کے بعد شوہر کا نام اور "بالغ و عاقل و رشیدہ" کے بعد بیوی کا نام لکھا ہوا موجود ہے۔ "قانون مدنی" کے مرتب کرنے والے اس نکتے سے کیونکر غافل رہ سکتے تھے۔

"قانون مدنی" کے مرتبین باور نہیں کر سکتے تھے کہ فکری گراؤت یہاں تک پہنچے گی کہ عوامی ہیت بیان کرنے دینے کے باوجود باب نکاح میں دوبارہ "بوغ و غفل و رشید" کے لیے ایک دفعہ لکھنا چاہیے۔

دفعہ ۱۰۶۴ پر قانون مدنی کے ایک شارح، جناب ڈاکٹر سید علی شاہ گن، فرماتے ہیں - "عاقل کو بالغ و عاقل و بارادہ ہونا چاہیے" - موصوف نے سوچا کہ اس کا تعلق میاں بچہ سے ہے بعد ان نکاح کی اہلیت کا بیان ہے۔ رشید کا تذکرہ موجود نہیں ہند فیصلہ کر دیا کہ مذکورہ دفعہ ۲۱۱ کے خلاف، جس میں عام اہلیت کا تذکرہ ہے - یہ کہنے کے بعد وجہ گڑھیا کہ دفعہ ۱۰۶۴ اگر "عاقل کے بارے میں ہے اور وہاں ضروری نہیں کہ رشید ہو۔"

یہاں محل اعتراض ایرانی عوام کا طریق کار ہے، نہ قانون مدنی پر اعتراض ہو سکتا ہے نہ قانون اسلام پر۔ ہمارے عوام کی اکثریت میں اب بھی دور جاہلیت کی طرح باپ اپنے تئیں مکمل اختیار کا مالک سمجھتے ہیں۔ اور انتخاب شوہر و شریک زندگی، اور نسل آئندہ کے باپ کے بارے میں لڑکی کی رائے کا اظہار، بے حیائی و تہذیب کے خلاف جانتے ہیں۔ فکری پختگی (درشد فکری)، جسے لڑکی کے بارے میں اسلام مسلم جانتا ہے، توجہ کے قابل نہیں سمجھتے۔ کتنے ہی نکاح ہیں جو لڑکیوں کے رشید سے پہلے ہو چکے، حالانکہ وہ غیر منوثر اور شرعاً باطل تھے۔ عقد کرنے والے، لڑکی کے رشید کے بارے میں چھان بین کرتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک لڑکی کا بالغ ہونا کافی ہے۔ دریاں حالیکہ بڑے بڑے عمامہ کے بہت سے واقعات ہمارے علم میں ہیں، انھوں نے لڑکیوں کے عقلی و فکری پختگی کے تجربے کیے ہیں۔ کچھ علماء لڑکی میں شادی دینی پختگی کو شرط مانتے ہیں۔ یہ علماء صرف ان لڑکیوں کا عقد پڑھتے تھے جن کو سال دین پر استدلال کرنا آتا تھا۔ افسوس، آج کل بچوں کے اکثر ولی اور نکاح کرنے والے نابالغوں کا خیال نہیں رکھتے۔

عوام کے رویوں پر گفتگو چونکہ مطلوب نہیں، لہذا سارے پیالے پیالیاں "قانونِ مدنی" کے سر پر توڑنا چاہیے، عوام کے ذہن اس "قانونِ مدنی" کے خلاف کرنا چاہیے جو قوانینِ اسلام سے پیدا ہوا ہے۔

میری نظریں "قانونِ مدنی" پر جو اعتراض ہوتا ہے وہ دفعہ ۱۰۴۲ سے مربوط ہے یہ دفعہ کہتی ہے:-

"پندرہ برس پورے کرنے کے بعد بھی لڑکیاں جب تک اٹھارہ سال کی نہ ہو جائیں اس وقت تک ولی کی اجازت کے بغیر شوہر نہیں کر سکتیں۔"

اس دفعہ کی رو سے، پندرہ اور اٹھارہ برس کے درمیانی عمر کی بیوہ بھی بلا اجازت ولی، شادی نہیں کر سکتی۔ حالانکہ فقہ شیعہ اور عقلی بنیاد پر، جو عورت شرائط کے مطابق بالغ و رشیدہ ہے۔ ایک مرتبہ شادی کر چکی ہے تو اسے باپ کی اجازت و رضا حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

## چوتھا حصہ:

# اسلام اور بدلتی زندگی

- — وقت کے تقاضے۔
- — دین اور وقت کے تقاضے نہرو کی نظریں۔
- — اسلام زندگی کی ترقیوں سے انطباق، غیروں کے لیے تعجب آفرین ہے۔
- — اسلام نے مستقل ضروریات کے مستقل ضابطے اور ادلتی بدلتی ضرورتوں کے لیے غیر مستقل ضابطوں کو پیش نظر رکھا ہے۔
- — اگر ہر چیز کو زمانے سے منطبق دہم آہنگ کریں تو خود زمانے کو کس سے ہم آہنگ بنائیں؟
- — زمانے سے اسد م کی ناہم آہنگی، ایک گروہ کے جمود اور ایک گروہ کی جہالت کا نتیجہ ہے۔
- — قرآن نے، اسلامی معاشرہ کی تشبیہ اس سبزے سے دی ہے جو پھلک رہا ہو۔
- — "صدی کی پیداوار" ایسی اصطلاح ہے جس نے بہت سے خاندان تباہ کر دیے۔



جامد (غیر متحرک) ہمیشہ پرانی چیز سے جوڑ کھاتی ہے اور جاہل ہر تباہی کا سبب تقاضائے زمانہ بتاتے ہیں۔

قوانین اسلام کی تکنیک میں ایسے جوڑ اور موڑ ہیں جن کی بدولت اس میں حرکت اور مڑنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔

ہیت پہننا حرام نہیں، دم پھلانا بنا حرام ہے۔

اسلام "قاعدہ ضرر" و "قاعدہ حرج" کے لئے "ویٹو" کا قائل ہے۔

(خلاصہ از مؤلف)

## اسلام اور بدلتی زندگی

①

زمانے کے تقاضے : مقدمہ کتاب "انسان و سر نوشت" میں، مسلمانوں کے غروج و زوال کے مسئلے پر بحث کر چکا ہوں۔ وہاں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں موضوع کے تین حصے کر کے بحث و تحقیق کی ہے۔ اسلام کا حصہ۔ مسلمانوں کا حصہ۔ اجنبی عوامل کا حصہ۔

اس مقدمہ میں جن ستائیس نکات پر تحقیق کی ضرورت پر زور دیا ہے، ایک موضوع یہ بھی ہے۔ میں نے وہاں وعدہ کیا ہے کہ اسلام اور مقتضیاتِ زمانہ "پر ایک کٹہر لکھو گا چنانچہ کچھ نوٹ بہت دنوں سے تیار کر رہا تھا۔

مقالات کے اس سلسلے میں سب باتیں تو لکھنا مشکل ہیں تفصیل کے لیے تو مستقل کتاب ہی ہونا چاہیے۔ ہاں، اس موضوع پر یہاں اتنا ضرور لکھوں گا جو مختصر طور پر قاری کے ذہن کو منور کر دے۔

مذہب و ترقی۔ ایسا موضوع ہے، ہم مسلمانوں سے پہلے اور ہم سے زیادہ دوسرے مذاہب و اہل مذاہب کے سامنے آتا رہا ہے۔ دنیا کے بہت سے روشن دماغ اس لیے مذہب چھوڑ بیٹھے کہ ان کے خیال میں مذہب اور آئے دن بدلتی ہوئی زندگی میں جوڑ نہیں بیٹھا۔ دونوں ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ ان کی سوچ میں دینداری، ٹھہراؤ اور سکون کا نام ہے۔ مذہب حرکت اور تبدیلی سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ دوسری عبارت میں، وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب ثبات، ایک رخی، اور شکل و صورت کی یکسانیت چاہتا ہے۔

انجمنی نہرو ہندوستان کے وزیر اعظم مذہب کے خلاف تھے۔ اور بقول خود کسی دین و مذہب کا قائل نہ تھے۔ ان کی باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے نبود اور اس کے منفرد رویے سے بیزار ہو گئے تھے۔ نہرو زندگی کے آخری دور میں اپنے اندر اور پوری دنیا میں ایک خدا محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے خیال میں یہ خلا روحانی طاقت ہی سے پر ہو سکتا تھا اس کے باوجود مذہب کے منفرد رویے اور اس کے نبود کی بنا پر۔ بخیاں خود ہر مذہب سے گھبراتے تھے۔

"کرنجیو" ایک ہندی نامزنگار نے ان کی آخری عمر میں ایک انٹرویو لیا جو فارسی میں چھپ چکا ہے۔ غالبیہ ان کی آخری نظریات تھے جو دنیا کے مجموعی حالات پر انھوں نے ظاہر کیے۔ "کرنجیو" گاندھی کے بارے میں ان سے باتیں کرتے ہوئے کہتا ہے:

چند روشن خیال و ترقی پسندوں کا خیال ہے کہ گاندھی جی نے آپ کے نفسیاتی اور روحانی احساسات میں تبدیلی پیدا کی اور آپ کے فکری سوچ کو متاثر اور کمزور کر دیا؛

نہرو نے کہا:

..... روحانی اور باطنی رویوں سے فائدہ اٹھانا ضروری اور اچھا ہے۔ میں اس بارے میں گاندھی کے عقیدے سے متفق تھا، اور اب ان وسائل سے فائدہ اٹھانے کو زیادہ ضروری سمجھتا ہوں، اس دور میں روحانی خلا کی وجہ سے نئے تمدن نے فروغ حاصل کر لیا ہے۔ ہمیں کل کے مقابلے میں آج روحانیت سے جواب لینے کی ضرورت زیادہ ہے۔

کرنجیو، مارکسزم کے بارے میں سوالات کرتا ہے اور نہرو مارکسزم کی نارسائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے دوبارہ اسی روحانی راہوں کی بات کرنے لگے۔ کرنجیو نے سوال کیا: مسٹر نہرو! اس وقت آپ کے تاثرات جن میں اخلاقی و روحانی طریقوں سے

مسائل کا حل ممکن سمجھتے ہیں، تو کیا جناب والا، اور کل کے جواب لال میں۔ نہرو کی جوانی۔ کوئی فرق نہیں پیدا ہوا؟ آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسٹر نہرو عمر کے سورج ڈھلنے خدا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔

نہرو:

جی ہاں، تبدیلی تو محسوس کرتا ہوں مشکلات حل کرنے کے بارے میں جن اخلاقی و روحانی معیاروں کی بات کر رہا ہوں وہ بے فکری و نادانستہ حالت میں نہیں ہیں.....

اب یہ سوال ہے کہ اخلاق و روحانیت کو بلند سطح پر لایا کیسے جائے۔ اس کا جواب خود ہی دیا۔ سامنے کی بات ہے اس مقصد کے لیے مذہب موجود ہے۔ افسوس، مذہب کو تاہ نظری، اور خشک رسم و رواج اور جسم بے روح بن چکا ہے۔ کچھ کھٹا ہے، میں اور ظاہری شکل و صورت اور اوپری خول رہ گیا ہے۔ اس کی روح اور حقیقی مقصد ختم ہو چکا ہے۔

**اسلام اور وقت کے تقاضے:** | دنیا بھر کے مذاہب و ادیان میں کسی مذہب نے انسان کی زندگی میں اتنا دخل نہیں دیا جس قدر اسلام کا عمل دخل ہے۔ اسلام نے اپنے پروگرام میں، چند عبادتوں اور کچھ ذکر و اذکار، پھر اخلاقی بیعتوں ہی کو نہیں رکھا ہے۔ وہ تو جس طرح، اللہ و بندہ کے روابط پر روشنی ڈالتا ہے اسی طرح بندگانِ خدا کے تعلقات، انسانوں کے رشتے، ان کے حقوق، فرائض اور ایک فرد کے دوسرے فرد، ایک فرد کے معاشرے سے زنگارنگ تعلقات بھی دکھاتا اور بتاتا ہے۔ اسی وجہ سے "زمانے" کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کے مقامات زیادہ موجود ہیں۔

اتفاقاً، بیرونی دنیا کے بہت سے مفکروں اور منصفوں نے معاشرتی و ذہنی قانون سازی



کے زوے سے سلام کا مطالعہ کیا ہے۔ ان لوگوں نے قوانین اسلامی کو ترقی پسند مانا ہے ان کے خیال میں یہ بنیاد پر سلام زندہ جاوید ہے۔ اس کے قوانین میں اتنی صلاحیت ہے کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ان کا انطباق کیا جاسکے، اسی لیے قابل توجہ اور لائق تعریف ہیں۔

”بناؤ شاہ انگلستان کا آزاد خیال، مشہور محقق نے کہا ہے:

”میں ہمیشہ دین محمدؐ کا احترام اس لیے کرتا ہوں کہ اس میں زندہ رہنے کی توجہ خاصیت ہے۔ میری نظر میں فقط اسلام ہی ایک ایسا راستہ ہے جو نگارنگ حالات و تغیر پذیر زندگی میں ہم آہنگی اور اقتدار پیدا کر سکتا ہے۔ اور اس پر عمل صدیوں کے لیے ہے۔“

میں پیش گوئی کرتا ہوں۔ اس کے آثار، اب بھی نمایاں ہو رہے ہیں کہ ”محمدؐ کے عقائد“ نے والے یورپ کے واسطے قابل قبول قرار پائیں گے۔“

”قرون وسطیٰ“ کے عمامہ جہانت یا تعصب کی بنا پر آئین محمدؐ کی سیاہ خدی و خال بناتے رہے۔ انھوں نے عوام کو کینہ و دشمنی سے متاثر ہو کر آپ کو ضد مسیح بتایا۔ میں اس شخصیت کے بارے میں۔ فرد بلند زلسلے عوام و خواص۔ مطالعہ کیا، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف یہی نہیں کہ وہ ضد مسیح نہ تھے بلکہ ان کو نجات دہندہ بشر کا لقب دینا چاہیے۔ میرا عقیدہ ہے، اگر ان جیسا صاحب اختیار آج کی دنیا میں آجائے تو مشکلات و مسائل دنیا کا حل یوں کر دے کہ دنیا صلح و سعادت انسانی کا گہوارہ بن جائے۔

ڈاکٹر شبلی شمیم، مادہ پرست، لبنانی عرب نے پہلی مرتبہ ڈارون کے فلسفے کو جو خنز جرمی کی شرح کا ضخیم ملا کر عربی میں ترجمہ کیا اور مذہبی عقائد پر حملے کی صورت میں عربی زبان جاننے والوں کے سامنے پیش کیا۔

میٹر یا سٹ ہونے کے باوجود، اسلام کی حیرت انگیزی اور خوبیوں کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا اس نے اسلام پیش کرنے والے (رسول) کی تعریف کی اور اسلام

کو دوا می طور پر زندہ آئین اور زمانے کے مطابق قرار دیتے ہوئے ستائش کی۔

”فلسفۃ النشوء والارتقاء“ کی جلد دوم میں انہوں نے ایک مقالہ شائع کیا ہے۔ ”القرآن والعمران“۔ مقالے میں ایک سیاح کے خیالات کی تردید کی ہے۔ وہ سیاح اسلامی ملکوں میں آیا تھا اور وہاں کی زبانوں کی حالت کا سبب اس نے اسلام بتایا تھا۔

شبلی شمیم نے اپنے مقالے میں مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کے تعلیمات اسلامی سے انحراف کو قرار دیا ہے اور کوشش کر کے ثابت کیا ہے کہ اسلام کے معاشرتی اصول چھوڑنے کے نتیجے میں زوال رونما ہوا ہے، اسلام سے نہیں۔ اس نے کہا۔ منفرکے لوگ جو اسلام پر حملہ کرتے ہیں وہ یا تو اسلام کو نہیں جانتے یا نیت اچھی نہیں۔ وہ مشرقی لوگوں کے دوا سے ان قوانین سے دل چسپی ختم کرنا چاہتے ہیں جو خود ان کی زمین سے ابھرے ہیں۔ وہ اپنی غلامی کا طوق ان کی گردن میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہمارے زمانے میں یہ سوال عام ہے کہ آیا اسلام تقاضائے وقت کے مطابق ہے یا نہیں؟ مجھے مختلف طبقے کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ خصوصاً علیم یافتہ و تجربہ کار حضرات کے ساتھ بروقت کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ میرے حلقے میں سب زیادہ بلی سوں گردش کرتا ہے۔

کبھی اپنے اس اسکاں کو فلسفیانہ رنگ دیتے ہیں اور کہتا جاتا ہے **اعتراضات:** دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے۔ انسانی معاشرہ بھی اسی طرح تغیر پذیر ہے۔ لہذا بدلتے معاشرے کے قوانین ناقابل تغیر کیسے ہو سکتے ہیں؟

سوال کو اگر صرف فلسفی انداز سے دیکھیں تو جواب بہت صاف ہے۔ جو کچھ مس حالت تغیر میں ہے، نیا ہے پرانا ہوگا، نشوونما کے بعد زوال پذیر ہوگا۔ ترقی و ارتقا میں ہے۔۔۔۔۔ یہ سب کائنات کا مادی اور ترکیبات مادی کا حال ہے۔ لیکن جہاں تک قوانین کائنات کا تعلق ہے، وہ بہر حال ثابت و قائم ہیں۔ زندہ مخلوق و موجودات اپنے مخصوص قانون کے مطابق، تکامل پیدا کرتے ہیں۔ یہ قوانین اہل دانش بیان کر چکے ہیں۔ خود زندہ

موجود کساند ہمیشہ ٹوٹ پھوٹ اور ترقی جاری رہتی ہے مگر ان کے قوانین میں تغیر و تبدل نہیں ہے اور ہماری گفتگو قوانین ہی کے بارے میں ہے۔ اب اس میں کوئی فرق نہیں۔ قانون زیر بحث طبعی ہو یا وضعی و معاہداتی، سب کا حکم ایک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وضعی قوانین ممکن ہے طبیعت و فطرت سے ماخوذ ہوں اور ان سے افراد یا انسانی معاشروں کا وہ راستہ بتا جو جس پر وہ اپنا ارتقائی سفر کرتے ہیں۔

رہے وہ سوالات جن میں اسلام اور تقاضائے وقت کے ہم آہنگ ہونے نہ ہونے کی بات کی جاتی ہے۔ ان میں نقطہ فلسفیانہ یا کلیاتی بات نہیں ہوتی۔

ایک سوال ہر سوال سے زیادہ دھڑکایا جاتا ہے۔ "قوانین ضرورت کے پیش نظر بنائے جاتے ہیں اور انسان کے مجموعی ضروریات پائدار و یکساں نہیں ہیں۔ لہذا اجتماعی قوانین بھی پائدار و یکساں نہیں ہو سکتے۔"

سوال چھا اور بہت قیمتی ہے۔ اتفاق کی بات، دین مبین اسلام کے معجزانہ پہلوؤں میں سے ایک پہلو ایسا ہے جس پر سمجھ دار اور دانشمند مسلمان فخر محسوس کرتا ہے۔ یعنی اسلام، فرد یا معاشرے کے پائدار ضروریات کے لیے پائدار قانون رکھتا ہے اور ضروریات انسانی کی بدلتی صورتوں میں اس کے قوانین میں لوٹ اور لچک بھی ہے۔ ہم اللہ کی مدد سے جہاں تک مناسب ہوا، تفصیلی بات کریں گے۔

**خود زمانہ کس سے منطبق ہوتا ہے؟** بحث شروع کرنے سے پہلے دو باتیں یاد دلاتے ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ ترقی پسندی اور بدلتی دنیا کے تقاضوں کا دم بھرنے والے، معاشرے کی ہر تبدیلی کو ترقی سمجھ لیتے ہیں۔ خصوصاً اگر وہ تبدیلی یورپ سے آئی ہو وہ اسے ارتقائی عمل ضرور مانتے ہیں۔ آج کے عوام میں سب سے زیادہ گمراہ کن یہی فکری رجحان دامگیر ہے۔

اس گروہ کے خیال میں چونکہ زندگی کا ساز و سامان روزانہ بدل رہا ہے، ناقص کی جگہ کامل آ رہا ہے۔ علم اور ٹیکنک میں ترقی ہے۔ ہند انسانی زندگی میں جو تبدیلیاں بھی پیدا ہو رہی ہیں وہ ایک قسم کی ترقی و پیش رفت ہیں، اور ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے بلکہ وقت کا جبر ہے وہ اپنا راستہ خود صاف کر لے گا۔

حالانکہ تو ہر تبدیلی براہ راست علم و صنعت کا نتیجہ ہے اور نہ ضرورت و جبر میں دخل ہے۔ عین اس حالت میں کہ علم ترقی کر رہا ہے ہوس پیشہ طبیعت، درندہ مزاج بشریت بھی خالی نہیں بیٹھی ہے۔ علم و نقل انسان کو کمال کی طرف بڑھاتی ہے، و طبیعت کی ہونا کی، و بشری درندہ مزاجی خود آگے بڑھ کر انسان کو فساد و انحراف کی راہ پر کھینچتی ہے۔ طبیعت کی ہوسناک و درندہ مزاجی کو شش کرتی رہتی ہے کہ علم کو اپنے لیے حربہ بنائے اور اپنی شہوانی و حیوانی ہوس کے لیے استعمال کرے۔ جس طرح زمانے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے اسی طرح اس سے مقابلہ بھی کرنا ضروری ہے۔ دنیا کے اصلاح پسند اور رجعت پرست دنیا کی ترقی کے خلاف سرود آزار مارتے ہیں۔

اگر زمانے کی تبدیلیوں اور تغیرات کو تمام اچھائیوں اور برائیوں کا پیمانہ مان لیں، تو خود زمانے اور اس کی تبدیلیوں کا علم حاصل کرنے کے واسطے کون سا ذریعہ استعمال ہوگا؟ اگر ہر چیز کو انطباق اور ہر بات کی تطبیق زمانے سے کرنا ہے تو خود زمانے کی تطبیق کس سے کریں؟ اگر انسان دست بستہ ہو کر زمانہ اور تبدیلیوں کا تابع ہو جائے تو خود انسان کی خلافت، فعالیت اور اس کے ارادے کی صناعی کہاں جائے گی؟

انسان، وقت کی سواری پر بیٹھا ہے، اور سفر کر رہا ہے۔ اسے محب بھر کے لیے بھی اس کی راہنمائی سے غفلت نہ رہنا چاہیے۔ جو حضرات فقط زمانے کی تبدیلیوں کے گیت گاتے رہتے ہیں، اور اس کی رہبری سے غافل ہیں، وہ انسان کے تعمیری عمل کو بھلا رہے ہیں۔ وہ اس گھوڑے سوار کے مانند ہیں جو گھوڑے کی باگ ڈور



پنے ہاتھ میں لینے کے بجائے اپنے منہ میں اس کے حوالے کر دے۔

**انطباق یا نسخ؟** دوسری بات۔ "اسلام اور تقاضائے وقت" کا حل بعض حضرات نے ایک فارمولے کے ذریعے نکالا، یہ فارمولا بہت

سادہ اور آسان ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "اسلام جاودانی دین ہے۔ ہر زمانے کے مطابق ڈھل سکتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کیسے؟ اس کے مطابق کا فارمولا کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں: جب دیکھیں کہ زمانہ بد گیا، فوراً اس کے قوانین منسوخ کر دیں، اس کی جگہ دوسرے قوانین سے آئیں۔"

چالیس نکات کے مضافے، شکل کا یہی حل پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں، دنیا کے بارے میں دیان کے قوانین کو نرم اور مڑے بھکنے کے قابل ہونا چاہیے۔ تقاضائے وقت پر منطبق ہو سکیں، یہ بات سلام کے تعلیمات کے برخلاف نہیں بلکہ اس کی روح کے بالکل مطابق ہے۔ (رسالہ زمین روز شمار، نوے صفحہ ۷۵)

مقالہ نگار موصوف نہ کورد ہلا جملے کے آگے پیچھے فرماتے ہیں۔ چونکہ زمانے کے تقاضے بد رہے ہیں اور ہر وقت نئے قانون کی ضرورت ہے۔ اسلام کے مدنی و معاشرتی قوانین جاہلیت کے عرب رسم و رواج کے مطابق اور ان کی سادہ زندگی سے ہم آہنگ تھے۔ ہذا اس وقت ٹھیک تھے۔ آج کے زمانے سے وہ ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لہذا آج کے لیے آج کا قانون بنا ضروری ہے۔

اس قسم کے غمگینانہ سوچ چھاجائے۔ گزر زمانے سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوانین منسوخ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو پھر کون سا قانون ہے جس میں یہ لوح نہیں ہے؟ کون سا قانون ہے جو اس معنی میں زمانے سے ہم آہنگ نہیں ہے؟

سلام کی زندگی سے ہم آہنگ ہونے کی بیاں کردہ پچھلے اور ہم آہنگی کی مثال تو وہی

ہے کہ ایک شخص کہے: کتاب و کتاب خانہ عمر سے مزے لوٹنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس سے پوچھیے اس کا مطلب؟ وہ جواب دے۔ یعنی جب آدمی لطف و لذت کا خیال کرے فوراً اسے بیچ کر اس کی قیمت عیش و نوش میں خرچ کر دے۔

مضمون نگار موصوف فرماتے ہیں: اسلامی تعلیمات کی تین قسمیں ہیں: پہلی قسم اصول عقائد، جیسے توحید و نبوت و قیامت وغیرہ۔ قسم دوم، عبادات۔ جیسے مقدمات و متعلقات نماز و روزہ و وضو و طہارت و حج وغیرہ۔ تیسری قسم، وہ قوانین جو عوامی زندگی سے متعلق ہیں۔

پہلی دوسری قسم تو دین کا جز ہیں، انسان کو ذاتی طور پر ہمیشہ ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ رہی تیسری قسم، تو وہ دین کا جز نہیں۔ کیونکہ دین کو عوامی زندگی سے سروکار نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان چیزوں کو جز دین کے طور پر نہیں لائے تھے۔ ان کا تعلق فریضہ رسالت سے نہ تھا۔ اتفاق کی بات ہے، آپ حکمران بھی تھے لہذا یہ کام بھی کرتے رہے۔ ورنہ دین کی شان تو فقط اسی میں ہے کہ آدمی کو نماز، روزے کے لیے تیار کرے دین کا انسانوں کی دنیاوی زندگی سے کیا تعلق؟

میں یقین نہیں کر سکتا کہ جو شخص ایک اسلامی ملک میں زندگی بسر کرتا ہو وہ اسلام کی منطق سے اتنا بھی ناواقف ہو سکتا ہے۔

کیا قرآن مجید نے انبیاء و مرسلین کا نصب العین نہیں بتایا ہے؟ کیا قرآن مجید نے بوری وضاحت سے یہ نہیں کہا؟

لَقَدْ آتَيْنَاكَ سُلْطٰنًا بِالْبَيِّنٰتِ وَآتَيْنَاكَ مَعَهُدَ الْكِتٰبِ وَالْمِيزٰنِ  
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔

ہم نے اپنے تمام رسولوں کو روشن دلائل اور کتاب اور ترازو کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ عوام میں انصاف قائم کریں۔

قرآن نے "اجتماعی عدالت" کے قیام کو پیغمبروں کا اصل نصب العین بتایا ہے۔ اگر آپ قرآن پر عمل نہیں کرنا چاہتے تو آگے بڑھ کر اس سے بڑا جرم کیوں کرتے ہیں، اسلام اور قرآن پر تہمت لگاتے ہیں؟ آج انسان کے سر پر جو مصیبتیں آرہی ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ دین؟ جو سب کا پشتیبان اور بہار ہے اسے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ وہی تو منفرد اخلاق و قانون کا حشریہ ہے۔

"اسلام بہت اچھا ہے، بشرطیکہ مسجدوں اور عبادت گاہوں میں رہے، معاشے سے سروکار نہ رکھے۔ ہم یہ ترانہ آدھی صدی سے سن رہے ہیں۔ یہ نغمہ، اسلامی سرحدوں کے پاٹھا تھاویاں سے، سلامی دنیا میں آیا اور اس کا خوب پروپیگنڈا ہوا۔ چھوڑیے، ہم اس کا عام فہم زبان میں مطلب بتائیں اور سادہ لفظوں میں لکھیں۔ اس طرح ان دعوے داروں کی بات زیادہ وضاحت سے بیاں ہو سکے گی۔

خلاصہ مدعا یہ ہے۔ "اسلام جہاں تک کیونززم کے مقابلے کے لیے، اسے آگے رکھو"۔ باقی رہنا چاہیے۔ مگر جہاں، مغربی منافع سے ٹکرائے اسے راستے سے ہٹ جانا چاہیے۔ یورپ کے نزدیک، اسلام کے عبادتی طور طریقے باقی رہیں کوئی حرج نہیں۔ کیونززم کے خلاف اسے ایک اتحادی تحریک اور دشمن خدا فلسفہ کہہ کر استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام کے سماجی ضابطے، جو مسلمانوں کی زندگی کا فلسفہ ہیں۔ مسلمان جب تک اسے مانتے رہیں گے اس وقت تک وہ یورپ کے مقابلے میں آزادی اور انفرادیت کا احساس بیدار رکھیں گے۔ یہ بات مغرب کے لیے ان کے مفہم کرنے میں رکاوٹ بنے گی۔ اسے درمیاں سے ہٹانا ضروری ہے۔

افسوس ہے کہ یہ نکتہ ایجاد کرنے والے، یہ تھیوری پیش کرنے والے غلط فہمی کے شکار ہوتے ہیں۔

۱۔ شبیدی نہایت خوبصورت دینی غیر عبارت ہے (دقیقہ مشید برص)

پہلے یہ ہے:

"لَوْ مِنْ بَعْضٍ وَنَكَفٍ بَعْضٌ"

"ہم کچھ مانتے ہیں کچھ نہیں مانتے" ایسا "اصول" ہے جسے قرآن مجید نے پندرہ سو برس پہلے ہی مسترد کر دیا ہے۔

دوسرے یہ ہے:

میرے خیال میں، وقت آچکا ہے کہ مسلمان اب ان شعبہ بازیوں کا سکار نہ ہوں، علوم کی انتقادی قوت کم و بیش بیدار ہو چکی ہے۔ وہ امتیاز کرنے لگے ہیں کہ انسانی علم و فکر کی طاقت کہاں کہاں نگو فر بہار کا سبب ہے اور کہاں کہاں فساد و انحراف کا باعث ہے۔ چاہے وہ یورپ سے متعلق کیوں نہ ہو۔

اسلامی دنیا کے عوام پہلے سے زیادہ اسلامی تعلیمات کی قوت و قیمت کو سمجھ چکے ہیں، وہ نصب العین بنا چکے ہیں کہ زندگی کا مستحق فلسفہ اسلام اور اسلامی ضوابط ہیں وہ کسی قیمت پر یہ حقیقت منایع کرتے پر تیار نہیں ہوں گے۔

مسلمان سمجھ چکے ہیں کہ اسلامی قوانین کے خلاف پروپیگنڈا، استعمار اور سامراج کی ایکٹ چال ہے۔

تیسرے یہ ہے:

یہ تھیوری دریافت کرنے والے سمجھیں کہ اسلام میں اگر اسناد کے مقابلے کی قوت ہے تو اس میں غیر اسنادی نظام سے بھی ٹکرائے کی صلاحیت ہے۔ یہ اسی وقت ہے جب وہ

خبر مشید از ص ۱

ترجمانہ، "ایدا کنندگان این تزکور خوانندہ"۔ "بزرگترینی میں"۔ "۱۹۵۵ء"۔ "۱۹۵۵ء"۔

"DISSERTATION" کہتے ہیں۔



ایک فلسفے کے طور پر معاشرے میں بالادستی و حاکمیت پیدا کرے، مساجد اور عبادت خانوں میں محدود نہ رہے جو اسلام عبادت گاہوں میں بٹھاتا ہے وہ افکار اہل یورپ کے لیے میدان خالی چھوڑ دیتا ہے، بلکہ وہ تو مغربی افکار کی مخالفت کا محاذ بھی چھوڑ دیتا ہے۔ اسلامی ممالک پر یورپ نے جو غضب ڈھایا ہے وہ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

## اسلام اور بدلتی زندگی

(۲)

**انسان، معاشرہ اور عقل** | انسان فقط ایسا جاندار نہیں جو اجتماعی زندگی کا عادی ہے۔ بہت سے حیوانات، خصوصاً حشرات، اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں، ان کا ایک حکیمانہ نظام و دستور ہے جس کے پابند ہیں۔ اصول تعاون، تقسیم کار، تولید و تقسیم، حکمرانی فرماں برداری، ان کی زندگی میں حکم و اطاعت کا عمل موجود ہے۔

شہد کی مکھی، چیونٹی کی بعض قسمیں اور دیمک جاذبہ زندگی، تمدن (ان کا خاص تمدن) نظام اور انتظامات سے فیضیاب ہیں۔ برس برس بلکہ صدیاں گزر جائیں تب جا کر انسان، اشرف مخلوقات ان تک پہنچے۔

ان کا تمدن، انسانی تمدن کے برخلاف عمدہ و عمدہ تقسیم نہیں ہوتا۔ پہلے جنگل پھر پتھر اس کے بعد لوہے کا دور اور اب ایٹم کے زمانے تک نہیں پہنچا، انہوں نے اس دنیا میں قدم رکھتے ہی یہ تمدن یہ انتظامات اور یہ دنیا بنائی دیکھی، آج بھی وہی اسلوب ہے اور کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ یہ انسان ہے۔ اور انسان محض زور پیدا کیا گیا ہے۔ (قرآن) اس کی زندگی زیر و سے شروع ہو کر لانتہا کی طرف جارہی ہے۔

جانوروں کے لیے وقت کے تقاضے یکساں ہیں۔ دنیا کے تقاضے ان کی زندگی کو دگرگوں نہیں کرتے، جدت پسندی اور نو پرستی ان کے لیے بے معنی ہے۔ ان کے

یہاں نئی پرانی دنیا کا فرق نہیں ہے۔ علم ان کے لیے روزانہ نئے انکشافات نہیں کرتا بلکہ بھاری صنعتیں جدید سے جدید تر، کامل سے کامل تر ان کے بازاروں کو انقلاب نہیں لاتیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ جلتی (غریزہ کی) زندگی گزارتے ہیں عقل سے دور ہیں۔ انسان کی زندگی اجتماعی اور ہمیشہ تغیر پذیر بلکہ تبدیلیوں کی زد پر ہے۔ ہر صدی میں اس کے لیے دنیا بدل جاتی ہے۔ اس کے اشرف مخلوقات ہونے کی بنیاد بھی یہی ہے انسان طبیعت کا فرزند بالغ و رشید ہے۔ وہ ایسی منزل پر فائز ہے جہاں اسے براہ راست طبیعت کی نگہداشت و سرپرستی کی ضرورت نہیں۔ غریزہ درشت، نامی چیز اپنی مروز (اندرونی و اشارتی) ہدایت کرے۔ انسان اس سے آزاد ہے وہ غریزہ کے بجائے عقل کی زندگی گزارتا ہے۔

طبیعت نے انسان کو بالغ سمجھ کر آزاد کر دیا ہے۔ اپنی سرپرستی سے دست کش ہو گئی ہے۔ حیوان جو کچھ اپنے غریزے اور قانون طبیعت کے ماتحت بے چون و چرا کرتا ہے، انسان وہی کام اپنے علم اور وضع شدہ قانون و شریع سے کرتا ہے جس سے سربازی بھی ممکن ہے۔

تباہی و بربادی، انحرافات اور روگردانی جو کچھ بھی وہ ترقی و کسب کمال کی راہ میں دکھاتا ہے، ٹھہراؤ اور پستیاں، گراؤٹ اور ہلاکت انہی مقام سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان کے لیے جس طرح ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں اسی طرح فساد و انحراف اور گراؤٹ کی راہیں بھی بند نہیں ہیں۔

انسان اس منزل میں ہے، جہاں تعبیر قرآن کریم ہے۔ جس امانت کا بوجھ آسمان وزمین اور پہاڑ اٹھا کے اسے اپنے کاندھوں پر لے کھڑا ہوا۔ یعنی آزاد زندگی قبول کر لی۔ پابندیوں، ذمے داریوں اور قانون کے بندھن بھی منظور کر لیے۔ اسی بنیاد پر ظلم و جہالت و خود پرستی میں مبتلا ہوتا اور غلط کاری سے نہیں بچتا۔

قرآن کریم، جہاں انسان کی عجیب و غریب صلاحیت اور امانت و ذمہ داری کے بارے میں بات کرتا ہے وہیں بلا توقف "تے ظلوم" و "جہول" کی صفتوں سے بھی یاد کرتا ترقی پذیری اور انحراف کی دو صلاحیتیں انسان میں ناقابل جدائی ہیں، انسان جانور کی طرح نہیں کہ اجتماعی زندگی میں نہ آگے بڑھ سکے نہ پیچھے ہٹ سکے نہ دائیں بڑھ سکے نہ بائیں۔ انسان کی زندگی میں کبھی پیش قدمی ہے کبھی پسپائی، سرعت و تیز روی ہے ورت و توقف اور گراؤٹ، عدالت و نیکی، ظلم و تجاوز انسانی زندگی کے پرتو ہیں۔ ایک منزل میں عقل و علم کا منظر ہے۔ ایک مرحلے میں جہالت و ہوس پرستی ہے۔

زمانے میں جو تغیرات اور تبدیلیاں ہوتی ہیں ممکن ہے دوسری قسم کی ہوتی ہوں۔

**منجد اور جاہل لوگ** بشری خاصیتوں میں افراط بھی ہے تفریط بھی، انسان اگر خدا و اعدال میں رہے، پہلی قسم کی تبدیلیوں کو دوسری قسم کی تبدیلیوں سے الگ کرے، زمانے کو علم و ایجاد کی طاقت سے کوشش و عمل کے ذریعے آگے لے جائے، ترقی و پیش رفت کے مظاہر سے اپنے تئیں ہم آہنگ بنانے کی سعی کرے۔ زمانے کے انحرافات کا راستہ روکے اور ہم رنگ زمانہ ہونے سے دور رہے تو انسان کے لیے ممکن ہے۔

افسوس یہ ہے کہ صورت حال یہ نہیں ہے۔ آدمی کو اس موقع ہر دو خطرناک بیماریاں لگا رہی ہیں، جمود اور جہالت کے مرض پہلی بیماری کا نتیجہ تھراؤ، سکون اور توقف ہے، آدمی دستوں اور ترقیوں سے دور رہ جاتا ہے۔ اور دوسرے مرض کی وجہ سے سقوط و انحراف سے دوچار ہوتا ہے۔

جامد، ہر چیز سے نفرت کرتا ہے اور پرانے پن کے علاوہ کسی کو پسند نہیں کرتا جاہل بڑی چیز کو تقاضائے وقت کا نام دیتا اور جدت پسندی و ترقی پسندی سمجھنے لگتا ہے۔



جامد، برہنہ اور تازہ چیز کو فساد و انحراف کہتا ہے اور۔ جاہل، ہر بات کو تمدن اور توسیع علم و دانش کی مد میں شمار کرتا ہے۔

جامد آدمی، مغز اور چھلکے میں، وسیلے اور نصب العین میں فرق نہیں کرتا، اس کی نظر میں دین، شہادت و قیام کی حفاظت کی ذمہ داری سونپتا ہے اس کی رائے میں نازل شدہ قرآن زمانے کی رفتار روکنے اور وضع کائنات کو اپنی حالت پر ساکن رکھنے کا فریضہ سپرد کرتا۔ جامد شخص کے عقیدے میں پارہ عم تیسرا لون پڑھنا، ٹھک سے لکھنا، صوف والی دوا کا شعل ہر سنے حمام میں بہا۔ ہاتھ سے کھانا کھانا، مٹی کے تیس کی لائین جلانا، جاہل و بے سواد جینا، دینی ادب کی زندگی سے، اس کی نگہداشت کرنا چاہیے، جاہل اس کے برخلاف، دونوں آنکھیں بند کیے دیکھتا رہتا ہے کہ یورپ میں کیا نیا کشف کھلا، کیا نیا فیشن نکلا جس عقیدہ کرے اور جدت پسندی اور وقت کا جبر کہہ کر اسی راہ پر چل کھڑا ہو۔

جامد و جاہل، دونوں اس بات پر ہم خیال ہیں کہ جو وضع قطع پرانے زمانے کی تھی وہی دینی مسائل اور مذہبی شعائر ہیں۔ دونوں میں اختلاف یہ ہے کہ ایک رسم و رواج کی نگہداشت پر زور دیتا ہے اور جاہل کے خیال میں مذہب قدامت پرستی ہے اور اس کا تعلق سکون و قرار سے ہے۔

آخری صدیوں میں یورپ علم اور دین کے تضاد سے دوچار تھا، ہر جگہ یہی بحث و گفتگو تھی۔ دین و رسم میں تضاد کی بنیادیں دو ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ چرچ نے کچھ قدیم علمی و فلسفی مسائل کو دینی عقائد اور دینی پہنومان لیا تھا، لیکن علوم نے ان مسلمات کے خلاف کچھ ترقیاتی حقائق ثابت کر دیے تھے۔ ادھر علوم نے زندگی کی وضع بدل دی زندگی کی شکل و صورت کچھ سے کچھ کر دی۔

جامد و جاہل، نہاد دیندار، جنہوں نے صرف ایک طرف توجہ نہ دی تھی، دوسری طرف مادی زندگی کے ظاہری ڈھب کو بھی غور و تدبیر سے نہ دیکھتا تھا، یہاں دھڑکاؤ بھی سوچتے ہیں کہ وقفاً

مادی زندگی میں بھی آدمی کو خاص وضع قطع میں ہونا چاہیے۔ اور چونکہ علم کا فتویٰ یہ ہے کہ مادی صورت کو بدلنا چاہیے لہذا دین کا منسوخ ہونا ہی بہتر ہے اور یہ فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے۔

پہلے گروہ کے جمود اور دوسرے گروہ کی بے خبری نے علم و دین کے تضاد کو جنم دیا۔ اور بس۔

**قرآنی تمثیل:** اسلام ترقی یافتہ اور ترقی دینے والا دین ہے، قرآن کریم مسلمانوں کو ترقی اور پیش روی کی طرف بڑھنے کی دعوت دیتا ہے اس بنا پر وہ ایک مثل میں کہتا ہے:

پیروان محمد مصطفیٰ علیہ السلام کی مثال دانے کی ہے، زمین میں بویا، اس کی نازک سی کوئل پھوٹی، پھر اس نے کچھ قوت حاصل کی، اس کے بعد وہ اپنے تنے پر ٹہری اس کی یہ رفتار تھی تینر تھی کہ کسان بھی حیرت میں پڑ گئے۔

یہ مثل قرآنی نصب العین کے مطابق ایک مثالی معاشرے کے لیے ہے، قرآن ایسے معاشرے کے لیے ہونا چاہتا ہے جو ہمیشہ نشوونما پاتا، پھلتا، پھوٹتا اور پھیلتا رہے۔ ویل ڈیورانت کہتا ہے:

اسلام کی طرح کسی دین نے اپنے ماننے والوں کو قوت کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اسلام کے پہلے دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام نے معاشرے کی تجدید و تعمیر میں کتنا کام کیا اور ترقی میں کس قدر طاقت کا مظاہرہ کیا ہے۔

اسلام جمود کے خلاف ہے وہ جہالت کا بھی دشمن ہے۔ اسلام کو جو خطرہ ہے وہ اس رخ سے بھی ہے اور اس سمت سے بھی۔ جمود اور خشک مزاجیاں نینر ہر پرانے نمبرے کو محبوب قرار دینا۔ حالانکہ دین مقدس اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جاہل لوگوں کو ایک بہانہ فراہم کرتا ہے کہ وہ اسلام کو جدیدیت کا حقیقی مخالف سمجھیں گے

دوسری صرف تقلید اور فیشن پرستی و مغرب زدگی کے زیر سایہ یہ عقیدہ کہ مشرقی مہم کی خوشنہی اسی میں ہے کہ وہ جسمانی و روحانی، ظاہری و باطنی طور پر فرنگی بن جائیں، بل مغرب کے تمام رسم و رواج قبول کر لیں۔ اپنے مدنی و معاشرتی قوانین کو آنکھیں بند کر کے یورپ کے قوانین سے ہم آہنگ بنائیں۔ یہ خیال جامد افراد کے لیے بہانہ بنا گیا کہ وہ لوگ ہر نئی وضع کو اپنی ہی کی نظر سے دیکھیں اور اسے دین، آزادی اور قوم کی اجتماعی شخصیت و انفرادیت کے لیے خطرہ سمجھیں۔

ان دونوں رویوں کا نقصان اٹھانے والا، اسلام ہے۔ خشک لوگوں کا جہود جاہلوں کو میدان جنگ مہیا کرتا ہے۔ اور جاہلوں کی جہالت، خشک لوگوں کو ان کے عقائد و نظریات زیادہ متعصب اور خشک بنا رہی ہے۔

یہ متمدن نما جاہل سمجھتے ہیں زمانہ "معصوم" ہے۔ جیسے زمانے کی تبدیلیاں انسان کے علاوہ کسی اور ہاتھوں سے رونما ہوتی ہیں؟ کب سے اور کس تاریخ سے انسان سے غلطی سے دوری۔ عصمت۔ حاصل کی ہے، جو زمانے کے انقلابات خطا اور غلط فیصلوں سے ماورا۔ معصوم۔ مان لیے جائیں؟

آدم زد، جس طرح، علمی رجحانات، اخلاقی اور مذہبی رکھتا ہے اور بشریت کی اصلاح و فلاح کے لیے ایجادیں کرتا ہے، اسی طرح وہ خود پرستی، جاہ طلبی، ہوس رانی، دولت مندی و راستکاری خواہشات کے زیر اثر بھی رہتا ہے۔ بشر آخر بشر ہے، نئے نئے اختراعات کرتا ہے، بہتر سے بہتر وسائل دریافت کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اتفاقاً غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ خود فراموش آدمی ان باتوں کو سمجھ نہیں پاتا۔ اس کا تکیہ کلام ہے۔ آج کی دنیا ایسی ہے، آج کی دنیا ویسی ہے۔

سب زیادہ حیرت انگیز بات ہے کہ یہ لوگ زندگی کے اصول جوتے، ٹوپی اور اپنے لباس کے معیار پر جانچتے ہیں، جیسے جوتا، ٹوپی نئی پرانی ہوتی ہے اسی طرح ان کے

نزدیک جو زمانہ نیا نیا، کارخانے سے بننے کے بعد ابھی ابھی ان کے سامنے آیا ہے اس کی توقیت ہے، اسے تو خریدنا اور پہننا چاہیے اور جیسے ہی وہ پرانا ہوا اسے دور پھینک دینا چاہیے۔ کائنات کے حقائق بھی ایسی ہی ہیں، ان جاہلوں کی نظریں، اچھے اور برے کا مفہوم۔ نئے اور پرانے سے جدا نہیں۔ ان کے خیال میں "فیوڈرزم"۔ یعنی، ایک طاقتور زبردستی اپنا نام "مالک" رکھ لے اور اپنی جگہ بیٹھا، سینکڑوں ہاتھوں اور بازوؤں سے کام لے، مقصد صرف منہ چلانا ہو۔ بہت برے ہے، کیوں؟ اس کی دلیل اس کا پرانا پن ہے۔ آج کی دنیا اس نظام کو پسند نہیں کرتی۔ اس کا دور گزر چکا، یہ فیشن پرانا ہو گیا۔ لیکن جس دن یہ طریقہ ایجاد ہوا تھا اور نیا نیا قالب کے اتر تھا، دنیا کی بازاریں رکھا گیا تھا اس دن اچھا تھا۔

ان لوگوں کی نظریں عورت کا استعمار پر اسے۔ کیونکہ آج کی دنیا اسے ناپسند کرتی اور اس کے سلیے تلے نہیں چلتی۔ اس کے مقابلے میں، کل تک عورت کو ترک نہیں ملتا تھا، اس کی ملکیت تسلیم نہ تھی، اس کا عقیدہ و ارادہ یا عزت نہ تھا، اس وقت یہ سب خوب تھا۔ کیونکہ نیا تھا اور نیا نیا بازاریں آیا تھا۔

ان حضرات کی رائے میں، چونکہ یہ زمانہ بفسا کا زمانہ ہے، اور اب ہوئی جہاز چھوڑ کر تھرپر سواری مکان نہیں، بجلی کو چھوڑ کر لائٹیں نہیں جلائی جاسکتی، تاکے بنانے والے بڑے بڑے کارخانوں کو بند کر کے چرنے سے کام نہیں چلایا جاسکتا، دیو بکر چھٹی کی مشینیں نظر انداز کر کے قلمی کتابیں نہیں شایع ہو سکتیں، یونہی محض قصے کہانیاں پارتی ہو یا "ٹونے" خزان میں شرکت کیوں کر چھوڑ دی جائے۔ مشرب نوشی و بدستی جو انیمیم عریاں لباس یعنی اس مدی کے نئے طور طریقوں کا چھوڑنا، گدھے کی سواری کا دور واپس لانے کے برابر ہے۔

"نئی روشنی" کی اصطلاح نے اس قدر شخصی اور کتنی خاندانی زندگیوں کو تباہ کیا ہے!



جیتے ہیں، علم کا دور ہے۔ ایٹم کا عہد ہے، مصنوعی سیاروں، فضائی راکٹوں کا زمانہ ہے۔ جی، بہت اچھا! ہم بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، ہم اس عہد و زمانے، اس دور و مدی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہماری مناسبت ہے، ہم اس دور کے علوم اور مصنوعات سے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر فیض یاب ہوں۔ لیکن ایک بات تو بتائیے کیا اس دور میں سرچشمہ علم کے علاوہ سب چشموں اور دریاؤں کے دھلنے خشک ہو گئے ہیں؟ اس صدی کی تمام ایجادیں اور روشنیاں علمی ترقی کا نتیجہ ہیں؟ کیا کبھی علم نے دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کے وجود اور اس کی طبیعت کو سو فی صد رام و مطیع اور ہر چیز کو انسانی بنارہا ہے؟

علم کے بارے میں دنیا کے ایک آدمی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔ ادھر سائنسی اداروں نے انتہائی خلوص نیت سے پاکلے دے سے تحقیق و تکلف کیے، ہر نئی محنت و تنہائی نئی دریافت کا اور جاہ طلب ہو سس پیشہ سر باہ دار، دولت کے پجاری، علمی محنتوں کو اپنے نجس مقاصد کے لیے استعمال کرتے لگتے ہیں، علم فریادی ہے کہ اس کا استعمال انسان کی سرکش طبیعت ہمیشہ غلط کرتی ہے۔ یہی ہماری صدی کی فکسل اور بد قسمتی ہے۔

علم فزکس میں ترقی کرتا ہے، روشنی کے کلیات دریافت ہوتے ہیں، ایک منافع پرست گروہ آگے بڑھتا اور خانہ برانداز و تباہ کن فلمیں بنانے کا کام اسی تحقیق کے مہارے شروع کر دیتا ہے۔ کیمسٹری کا علم ترقی کرتا ہے مضر دات کے خواص اور مرکبات کے نتائج دریافت کرتا ہے، کچھ لوگ اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں وہ، بلڈے جان بشر "ہیروئن" ایجاد کرتے ہیں، علم، ایٹم کے اندر بھانک کر اس کی حیرت انگیز اور طاقت دیکھتا اور اس کو مہار دیتا ہے اور معمولی سائنسی فائدہ اٹھانے سے پہلے، اقتدار کے بھوکے ایٹم بمب بنا کر بے گن ہوں کو تباہ کرتے ہیں۔

۔ بیسویں صدی کے ہیرو "آئن اسٹائن" کے اعزاز میں جشن ہو رہا تھا، وہ اٹھا اور تقریر کے دوران کہنے لگا:

"آپ اس شخص کے لیے جشن منا رہے ہیں، جس کا علم ایٹم بم بنانے کا سبب ہوا ہے۔"

آئن اسٹائن نے علمی صلاحیتیں اس لیے نہیں استعمال کی تھیں کہ یہ بم بنایا جائے، مگر ہوس پیشہ لوگوں نے اس کے علم سے یہی فائدہ اٹھایا۔

ہیروئن، ایٹم بم، ایسی ویسی فلمیں، فقط اس بنا پر معقول نہیں قرار دی جاسکتی ہیں کہ وہ "صدی کی نئی ایجاد" ہیں۔ اعلیٰ درجے کے بم آخری ترقی یافتہ بمبار ہوئی جہاز کے ذریعہ بے گندہ آدمیوں کے سر پر برسانے سے، عمل کی حشیانہ حیثیت میں ذرہ بھر کی پیدا نہیں ہوتی۔

## اسلام اور بدلتی زندگی

عالمی اور گھریلو زندگی میں مغربی رویوں کو قبول کرنے کے سلسلے میں جو حضرات حمایت کا دم بھرتے ہیں، ان کے پاس سب اچھی دلیل یہ ہے کہ — دنیا بدل گئی ہے، بیسویں صدی کے تقاضے اسی سسٹم کا پابند کر رہے ہیں۔ اگر اس رخ پر ہم روشنی نہ ڈالیں تو ہماری دوسری نچیں ناقص رہ جائیں گی۔

اچھی خاصی اور تفصیلی بحث و تحقیق کے لیے مقالات کافی نہیں ہیں، کیونکہ مقالات میں متعدد موضوعات و مسائل زیر بحث آنا ضروری ہیں فلسفی، فقہی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل۔ "اسلام اور تقاضائے وقت" کے عنوان سے جو کتاب لکھنے کی نیت ہے جس کے نوٹ تیار ہیں۔ تو انشاء اللہ بقیہ بحث وہاں کی جائے گی۔

سر دست دو نکتوں کی وضاحت کافی ہے:

نمبر ۱:- زمانے کی تبدیلیوں سے ہم آہنگی آنی آسان نہیں ہے، جتنی یہ مدعیان بے خبر کچے سمجھاتے ہیں۔

نمبر ۲:- قوانین اسلام کے جوڑ اور موڑ اور ان کے راز و اسرار

دوسرا ضروری نکتہ جسے روشن دیاں ہونا چاہیے وہ اسلامی مفکروں کا یہ عقیدہ کہ اسلام میں ایسے راز موجود ہیں جو دین کو اپنے دور کے ترقیات سے ہم آہنگ ہوئیں

مدد کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے۔ اسلام، زمانے کی ترقیوں اور تقاضوں کی پیش رفت، دنیا کے پھیلاؤ اور زندگی کی جدیدیت کا ساتھ دیتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کا راز و رمز کیا ہے؟ دوسری لفظوں میں، اس مشینری کے اسپرنگ، بیمزنگ، بریکٹ اور نٹ یوں لگے ہیں کہ جن سے حرکت میں فرق نہیں پڑتا، یعنی کسی قانون کے نظر انداز کرنے کے بجائے وقت کی تبدیلیوں، اور تعلیم و ثقافت میں توسیع میں کسی قسم کا تضاد و تصادم نہیں ہوتا، اس عقیدے کے توضیحات اس مقالے کا موضوع ہیں۔

بعض قاری اور ان سے زیادہ میں خود سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ فنی اور ماہرانہ ماحول چاہتا ہے۔ اور ماہرین ہی کے سامنے اس پر گفتگو ہونا چاہیے۔ مگر سوال کرنے والوں اور مسئلے سے دل چسپی رکھنے والوں کی اکثریت سے دوچار ہوں، ان میں غلط اندیش لوگوں کی تعداد زیادہ ہیں، انہیں ان لوگوں کی ہے جو اسلام کی اس خصوصیت کو باور نہیں کرتے۔ میں جس حد تک غلط فہمیوں کو دور کر سکتا ہوں اس حد تک کوشش کروں گا اور دوسروں کو سونپ دوں گا۔

محترم ناظرین! خیال رکھیں کہ اس قسم کی بحثوں سے ہمارے دور اندیش علماء بے خبر نہیں تھے، چنانچہ مرحوم آیت اللہ میرزا حسین نائینی کی "تنبیہ الامت" اور استاد علامہ محمد حسین طباطبائی کا مقالہ "وہدیت و زعامت" کتاب "مرجعیت و روحانیت" میں قابل ملاحظہ ہے۔ یہ کتابیں فارسی ہی میں ہیں اور چھپ چکی ہیں۔

۱۔ آیت اللہ غنی میرزا محمد حسین نائینی، آجف کے عالم مدین، فقیہ عظیم اور اصولی، جنہوں نے علماء کے منصب پر ایک اہم کتاب "تنبیہ الامت" تحریر فرمائی، یہ شرطیں استعمار سے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ ان کی ولادت ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء اور سندوفات ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء ہے۔

۲۔ علامہ سید محمد حسین طباطبائی نمونی ۱۲۹۸ھ، قم۔ تفسیر المیزان کے مصنف اور آخری دور کے مشہور فلسفی



دین مقدس اسلام اپنے اصل اور ناقابل تغیر قوانین کے باوجود تمدن و ثقافتِ زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور انسان کی بدلتی زندگی میں قابل تطبیق ہے۔ چند چیزوں کی طرف توجہ مبذول فرمائیے۔

**جسم و صورت کے اختلاف**  
۱۔ اسلام زندگی کی ظاہری شکل و صورت سے بحث نہیں کرتا جب کہ انسانی دانش و بینش تمام و کمال اسی سے وابستہ ہے۔

اسلامی قوانین و سفارشات، روح و حقیقت سے متعلق ہیں۔ وہ زندگی کے نصب العین اور انسان کے لیے بہترین راستے کا رہنما ہے وہ راستہ جو اسے منزل مقصود تک پہنچا دے۔ علم نہ روح و مقصدِ زندگی کو دیتا ہے نہ بہتر اور نزدیک تر و بے خطر راستہ بتاتا ہے جو مقصدِ حیات تک پہنچا سکے۔ علم ہمیشہ بہتر وسائل اور کامل تر ذرائع مہیا کرتا ہے جس سے آدم زاد زندگی کے مقاصد حاصل کر سکے اور ان تک پہنچنے کے راستے اور ان پر چلنے کا انداز معلوم کر سکتا ہے۔

اسلام نے اپنی قلمرو اپنے دائرہ کار میں مقاصد متعین کر دیے ہیں شکل و صورت و وسائل علم و فن کے دائرہ کار میں چھوڑ دیے، تمدن و ثقافت کے پھیلاؤ میں دم اور ٹکڑے بچ گئے۔ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے علم و عمل، توسیع تمدن و ثقافت، تقویٰ، انصاری راہ، ہمت پائدار اور استقامت پیدا کرنے اور بڑھانے میں صلی عامل اور تمدن کی ترقی میں اسامی کردار اپنے ذمے لیا۔

اسلام نے شاہراہِ سفر بشر پر سنہیل نصب کر دیے ہیں۔ وہ نشانِ راہ، رفتارِ کارِ تاج اور منزل کی سمت بتاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں خطروں، موڑوں، گرنے کے مقامات تباہی کے ٹھکانوں سے بچنے کے سگنل بھی دکھا دیے۔ اسلام کے تمام ضابطے پہلی قسم کے نشانات ہیں یا دوسری قسم کے۔

زندگی کے اسباب و وسائل ہر دور میں انسانی معلومات اور علمی اخلاعات سے بہتہ ہوتے ہیں، معلومات جتنے بڑھتے جاتے ہیں آلات و وسائل اتنے ہی کام و مکمل ہوتے رہنا قص و مسائل کو جبرِ زمانہ کے ہاتھوں ہٹاتے جاتے ہیں۔

اسلام میں ایک سید یا ایک ظاہری و مادی وضع قطع ایسی نہیں مل سکتی جس پر تقدس کا سیل چپکایا گیا ہو۔ اور کوئی مسلمان اس وضع قطع کی نگہداشت کا دائمی محافظ بننے کا مدعی ہو۔

اسلام نے یہ نہیں کہا، اسلامی، بنائی، کاشتکاری، حمل و نقل، جنگ..... کے لیے آلات، اوزار اور ذرائع کے نام اور خصوصیات نہیں متعین کیے کہ فلاں کام میں فلاں اوزار ہی سے کیا جائے۔ جس کے بعد یہ کہا جاسکے کہ علمی ترقی کے ساتھ وہ اوزار بیکار قرار دے دیا جائے۔ اور اسلامی ضوابط اور علم میں تضاد و تصادم رونما ہو۔ اسلام نے جوئے، ٹوپی، اور زیناتے مردانے الگ الگ اور نئے قسم کے کپڑے نہیں بنائے ہیں نہ ان کے لیے خاص سانچے، پیمائے اور مادے، نہ ساخت اور تولید و تقسیم کے لیے چند آلات اور اوزار معین کیے ہیں۔

ایک جہت تو یہ ہے جس سے دین کو ترقیاتِ زمانہ سے ہم آہنگ بنانے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

**مستقل ضرورتوں کے لیے پائدار قانون**  
۲۔ دین اسلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے اس کی بے اندازہ اہمیت بڑھ جاتی ہے وہ ہے اس کا یہ

پہلو کہ انسان کی مستقل ضرورتوں کے لیے پائدار قوانین اور تبدیل ہونے والی ضرورتوں کے لیے ایسے متبادل ضابطے جن میں وقتی ضرورتوں کی رعایت ہو۔ انفرادی، جماعتی، شخصی اور عمومی دائروں میں کچھ قوانین ناقابل تبدیلی ہیں۔ یہ نوعیت ہر زمانے میں

جس ہے۔ جو نظام، انسان اپنے غرائز کے سپرد کرتا ہے اور جو نظام اپنے اجتماع کو دینا ہے اس کے اصول و کلیات پر زملے میں ایک ہی طرح رہتے ہیں۔

”نظریۃ ضابطہ خلق“ اور ”ضابطہ عدالت“ اور اس کے حامیوں سے باخبر ہوں ان کے عقیدے اور وسائل کے بارے میں اپنی رائے بھی لکھوں گا۔

ضروریات بشر میں کچھ ضرورتیں ایسی بدلتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے ناپائیدار اور تغیر پذیر قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسلام نے ان کے لیے حالات کے لیے خاص ہتھیار وضع کر دی ہے، یعنی متغیر حالات کو غیر متغیر اصولوں سے وابستہ کر دیا، یہ اصول ثابتہ ہر بدلتی ہوئی صورت میں ضمنی قانون پیدا کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر اس سے زیادہ توضیح نہیں دینا چاہتا، البتہ، اپنے قاری کے ذہن کو روشن رکھنے کے لیے چند مثالیں دیتا ہوں:

اسلام کا ایک اجتماعی ضابطہ ہے:

”واعظوا لہم ما استطعتم من قوۃ“

مسلمانو! اپنی آخری حد امکان تک دشمن کے مقابلے میں قوت مہیا کرو۔

سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احکام کا ایک مربوط سلسلہ ”سبق و رہایہ“ کے نام سے فقہ میں مرتب ہوا۔ حکم ہے کہ خود تم اور تمہارے بچے، مہارت کامل کی حد تک گھوڑے سواری اور تیر اندازی سیکھیں۔ گھوڑے سواری کا فن اور تیر اندازی کا ڈسنگ اس زمانے کی فوجی تربیت کا جز تھا، ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد اصل ”سبق و رہایہ“ ہے۔ اس کی ”اصل و اعظما لہم ما استطعتم من قوۃ“ ہے یعنی تیر و شمشیر، نیزہ و کمان، خنجر اور گھوڑا، اسلام کی نظریات اہمیت نہیں رکھتا، اصل ہے ”طاقت“ ہونا۔ اصل بات ہے ہر زمانے میں دشمن کے روبرو آخری حد امکان تک فوجی اور دفاعی حیثیت سے مضبوط ہونا طاقت ور ہونا تیر اندازی اور گھوڑے سواری ایک لباس ہے جو طاقت کے جسم پر

پہنا جاتا تھا۔ دوسری لفظوں میں نفاذ حکم کے لیے ایک صورت۔ دشمن کے مقابلے میں طاقت و ناپائیدار قانون ہے، جو پائیدار ضرورت کو پورا کرتا اور اسی کے دوام سے دوام پاتا ہے۔ تیر اندازی و گھوڑے سواری میں مہارت کا ضروری ہونا وقت کی وقتی ضرورت تھی، زمانے کی مناسبت اور عہد کے بدلنے سے وہ بدلے گی اور تمدن و ثقافت کی ترقی کے ساتھ دوسرے جنگی آلات اور آج کے گرم اسلحہ اور آج کی مہارت درکار ہے اور آج کے وسائل کل کی تکنیک کی جگہ بدل جائے گی۔

دوسری مثال:

تبادلہ دولت کے بارے میں قرآن مجید نے ایک ”اصل اجتماعی“ بیان کر دی ہے اور اسلام نے ”شخصی ملکیت کی اصل“ قبول کی ہے۔ ہاں، اسلام جس کو ”ملکیت“ کا نام دیتا اور مانتا ہے اس میں اور آج کی دنیا میں سرمایہ داری کی بنا پر جو کچھ ہو رہا اور جو فرق ہے اس کے مقابل کا یہ موقع نہیں۔ بہر حال مالکیت فرد کا لازمہ ”تبادلہ“ ہے۔

باہمی تبادلے کے لیے اسلام نے اصول مقرر کیے ہیں۔ من جملہ ان کے ایک اصل ہے:

”ولا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل“

سرمایہ کو غلط طریقے پر آپس میں گردش نہ دو۔

یعنی جو روپیہ اور جو سرمایہ، دست بدست گردش کرتا ہے، کاریگر اور کارخانہ دار کے ہاتھوں سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں آنے والی چیز جن جن ہاتھوں میں جس جس انداز سے جائے اور جو فائدہ ہو وہ مطابق شریعت ہو۔ سرمائے کے دست بدست آنے جانے میں جو فائدہ ہو رہا ہے اس سے انسانی قدر کے اندر ہونا چاہیے ورنہ اجازت نہ ہوگی۔ اسلام نے مالکیت کو مکمل خود مختاری کے برابر نہیں قرار دیا ہے۔

پھر اسلامی ضوابط میں بعض چیزوں کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے



شد خون اور انسان کا فضلہ.... کیوں؟ بات یہ ہے کہ خون انسان یا خون گوند کا استعمال مفید نہیں ہے۔ لہذا اس کی قیمت ایسی نہیں ہو سکتی جو انسانی سرمے کا حصہ بن سکے۔ خون اور فضلات کی خرید و فروخت کی منوعیت کی ساس وہی قرآنی اصل ہے۔ "ولا تأکلوا أموالکم بنکیم بالباطل"۔ ہے خون و فضلہ کی منوعیت اسلام کی نظر میں اصل نہیں، اصل تو ہے ایسی دو چیزوں کا تبادلہ جو بے حی حالت کے لیے مناسب ہو خون وغیرہ کی منوعیت ایک لباس ہے جو غلط سرمے کی گردش کو پہنایا گیا ہے۔ دوسری مضمون میں یہ منوعیت اصل ہے۔ "لا تأکلوا أموالکم بنکیم بالباطل"۔ کی اجرائی صورت ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اگر تبادلہ "مبادلہ" کا ہاتھ درمیان میں نہ ہو اس وقت بھی کوئی سرمایہ کسی سے غلط طریقے پر لے کر ملکیت اور تصرف کا حق حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

یہ اصل پائدار ہے اور پابند وقت نہیں، اس کا ماخذ (در چشمہ) ناقابل تبدیل اجتماعی ضرورت ہے۔ رہا خون اور فضلے کا سرمایہ نہ ماننا اور اسے قابل "مبادلہ" (ایضاً) نہ جاننا اس کا تعلق عہد و زمانہ اور درجہ تمدن سے بھی ہو سکتا ہے اور حالات کی تبدیلی علوم کی ترقی صنعت و مکان استفادہ صحیح و مفید کے بعد، دوسرا حکم بھی ہو سکتا ہے۔ ایک اور مثال:

حضرت میر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے آخری زمانے میں سو مبارک سفید ہو گئے تھے، آپ خضاب نہیں لگاتے تھے، دائرہ بھی سفید دیکھ کر ایک شخص نے عرض کی کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ بالوں کی سفیدی کو رنگ سے چھپالو؟ جواب میں حضرت نے فرمایا: کیوں نہیں؟ اس نے کہا: پھر آپ خضاب کیوں نہیں لگاتے؟ آپ نے فرمایا: جب حضور نے یہ فرمایا تھا اس وقت مسلمان تعداد میں کم تھے۔ پھر ان میں بوڑھوں کی اچھی خاصی تعداد بھی جوڑائیوں میں

شریک ہوتے تھے، دشمن جب مسلمان فوج کو دیکھتا اور بوڑھے سپاہیوں پر اس کی نظر پڑتی تھی تو اسے ایک نفسیاتی اطمینان و اعتماد حاصل ہوتا تھا کہ مقابل میں تھوڑے سے بوڑھے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمان جاری کر دیا کہ خضاب لگایا جائے کہ دشمن ان کے بڑھاپے کو دیکھ کر جو ان ہمت نہ ہو سکے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: حضورؐ کا حکم تقاضائے وقت کے مطابق تھا اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی، لہذا اس قسم کے وسائل کا اختیار کرنا ضروری تھا، آج اسلام پوری دنیا میں پھیل چکا ہے لہذا اس کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص آزاد ہے۔ خضاب لگائے یا نہ لگائے۔

حضرت علیؑ علیہ السلام کی نظریں، پیغمبر کرمؐ کا فرمان "خضاب لگاؤ"۔ کلیہ۔ صل نہیں۔ بلکہ کسی اور اصل کی شکل اجرائی ہے۔ قانون اصلی۔ دشمن کی نفسیاتی مدد نہ کرنا پر ایک لباس تھا۔

یہ مطلب ہے کہ اسلام ظاہری شکل، پوست، چھلکے اور اوپری خوں کو اہمیت دیتا ہے اور روح و باطن و مغز کو بھی۔ مگر ہمیشہ صورت کو روح، چھلکے کو مغز اور خوں کو اندرونی حقیقت کے حوالے سے دیکھتا ہے۔

**رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ:** ان دنوں ملک میں ایک مسئلہ زیر بحث ہے "رسم خط بدلا جائے"۔ یہ بات، زبان و ادب کے

لحاظ سے بھی قابل بحث ہے اور اصول اسلامی کے لحاظ سے بھی بحث طلب ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے مسئلے کی دو جہتیں زیر بحث لائی جاسکتی ہیں: ایک یہ جہت کہ آیا، اسلام کی کوئی خاص الف بے ہے۔ اور دوسری الف بے سے جدا ہے؟ کیا اسلام ہماری الف بے کو جس کا نام عربی الف بے ہے، اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اور دوسری الف بے کو اجنبی جانتا ہے، جیسے لائینی حروف؟

ہرگز نہیں۔! اسلام، کائناتی دین ہے اس کی نظریں ہر الف بے برابر ہے۔

مسئلے پر بحث کرنے کی دوسری جہت ہے۔ خط اور الف بے کی تبدیلی کا مسلمانوں کے اجنبی لوگوں کے حلق میں اترنے اور ان کے پیٹ میں ہضم ہونے پر اثر بھی پڑتا ہے! اس تبدیلی کا اثر قوم کے اپنے تمدن سے کٹ جانے پر کیا ہوگا، جس نے ہلال اسلامی علوم اور اپنے علمی اثاثے کو چودہ سو برس تک غائبے میں لکھا ہے؟ اور رسم الخط بدلنے کا منصوبہ ہے کن ہاتھوں میں اور اسے کون سا نفع دے گا؟ ان کی تحقیقات ہونا چاہیے۔

**ھیٹ پہننا حرام نہیں**  
**دم چھلانا حرام ہے۔**

مجھے جیسے لوگوں نے سنا ہے کہ سرسبز آنرلےجے میں پوچھا جاتا ہے؟ جناب! یہ تو کھانا شرم کا کیا ہے!! چھری کاٹتے سے کھانا جائز ہے؟ بیت لگانا حرام ہے؟ کیا اجنبی زبان میں بات کرنا ناجائز ہے؟

ان حضرات کے جواب میں کہتا ہوں: اس بارے میں اسلام نے کوئی خصوصی حکم نہیں دیا ہے! اسلام نے پابند نہیں کیا ہے کہ ہاتھ سے کھائیے یا چمچے سے، یہ ضرور حکم دیا ہے کہ صفائی کا خیال رکھیں۔ جوتا، ٹوپی اور لباس کا بھی کوئی ماڈل نہیں دیا۔ انگریزی جاپانی اور فارسی زبان اسلام کے نزدیک یکساں ہے۔

لیکن.....

لیکن اسلام نے ایک اور بات ضرور کہی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اپنی شخصیت کا بھلا دینا حرام ہے۔ دوسروں کے پیٹ میں ہضم ہو جانا، دوسروں میں مل کر مت جانا حرام ہے۔ دم چھلانا حرام ہے۔ اجنبی کے متاعے انوں کی نذر ہونا حرام ہے جیسے سانپ کے سامنے خرگوش، دوسرے کے بدلے کو چمڑے کا جھنڈا حرام ہے۔ ان انحرافوں کی بنیاد ”صدی کی ایجاد“ کہہ کر جذب کر لینا حرام ہے۔ یہ عقیدہ کہ ایرانی کو جسم و روح ظاہر و باطن میں فرنگی بن جانا چاہیے، حرام ہے چاروں تک صبح سویرے ”فرانسیسی کچرینٹر“ پیرس جانا اور حرف ”ر“ کا مخرج ”غ“ میں

بدن اور رفقہ ”کو غفتم“ کہنا حرام ہے۔

**۳۔ ایک اور جہت کہ اسلام کو تقاضائے وقت سے ہم آہنگ کرنا ہے، وہ اس کے قوانین کا عقلی پہنچنا ہے۔** اسلام نے اپنے پیروں کو عذنیہ بتایا ہے کہ اس کے تمام ضوابط بلند ترین مصالح پر مبنی ہیں، اور خود اسلام میں مصالح کی اہمیت کے درجے بیان کیے گئے ہیں۔ اسلام کے معاملات کے مابراہیہ مقامات پر طرح طرح کی مصلحتوں کو باہم مقابل دیکھ کر کام کی سمت وجہت آسانی سے معلوم کریتے ہیں۔ وہ اسلام کی اس اجازت سے مطلع ہیں کہ ایسے مقامات پر حقیقی ماہرین اسلام مصلحتوں کی اہمیتوں کا اندازہ لگائیں اور سلام کی براہ راست رہنمائی کی روشنی میں اہم ترین مصلحتوں کا انتخاب کریں، فقہاء اس کلیہ کو ”اہم و مہم“ کا نام دیتے ہیں۔ یہاں مثالیں بہت ہیں لیکن ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

**”ویٹو“ کا حق رکھنے والے قوانین**

۴۔ ایک اور جہت جس نے س دین کو حرکت و انطباق کی خصوصیت دی اور اسے زندہ و جاوداں بنا دیا ہے وہ خود اس دین کے اندر ایسے قوانین اور قواعد وضع ہوئے ہیں جن کا کام دوسرے قوانین میں اعتدال اور ان پر کنٹرول قائم رکھنا ہے۔ فقہاء کی زبان میں انھیں ”قواعد حاکمہ“ کہتے ہیں جیسے ”قاعدہ، خراج“، ”در قاعدہ“، ”نہر“، ”جو پوری فقہ پر حاکم ہے۔ حقیقت میں اسلام تمام قوانین و ضوابط کے مقابلے میں ان قواعد کو ”ویٹو“ کا درجہ دیتا ہے اس کی بات بھی طویل ہے اور اس کا بیان کرنا مقصود نہیں۔

**حاکم کے اختیارات**

جن برکتوں، اسپرنگوں کا سلسلہ ہم نے بتایا، ان کے علاوہ بھی کچھ باتیں ہیں جو دین مقدس اسلام کی تعمیر



موجودہ کمیٹی میں۔ اور انہوں نے اس دین کو ابدیت و قیامت کی صفت خاص بخشی ہے۔  
مرحوم آیت اللہ تائمی اور علامہ طباطبائی نے اس سمت میں ان اختیارات کا تذکرہ کیا ہے  
جو اسلام نے "اسلام کی حکومت صالحہ" کو عطا کیے ہیں۔

**اصل اجتہاد:** اندسہ اقبال پاکستانی کہتے ہیں:  
"اجتہاد اسلام کی قوت محرکہ ہے۔"

بات بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن ہم خصوصیت ہے "اجتہاد پذیر" اسلام اجتہاد  
کو منظور کرتا ہے۔ اسلام کی جگہ کسی اور کو رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اجتہاد کس قدر  
مشکل ہے۔ بلکہ اجتہاد کا راستہ ہی بند ملے گا۔ اس دین آسمانی میں عجیب و غریب ترین  
بات وہ باریکیاں ہیں جو اس کی ساخت میں موجود ہیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے وہ  
تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

بوعی سینے کے کتاب "اشفا" میں بھی اسی بنیاد پر ضرورت اجتہاد کی بحث  
پھیل چھڑی ہے وہ کہتا ہے: چونکہ زمانے کے حالات تغیر پذیر ہیں، اور ہمیشہ نئے مسائل  
پیش آتے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے کلی اصول، تقاضا قابل تبدیل ہیں۔  
ضرورت ہے کہ ہر عہد اور ہر زمانے میں نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہند  
ایسے افراد ہونا چاہئیں جو نئے مسائل کا اور اک کر سکیں اور مسلمانوں کو جواب دیں  
بعد اصفین والیں۔

"قانون اساسی" کے تحت میں بھی اس کی پیش بندی کی گئی ہے۔ یعنی ہر زمانے  
میں مجتہدین کی ایک کمیٹی ہوگی جس کے ممبر کم از کم پانچ ہوں گے۔ یہ حضرات  
"تقاضائے وقت" سے باخبر بھی ہوں، یہ حضرات منظور شدہ قوانین کی نظارت کریں گے  
قابل یاد دہانی بات یہ ہے کہ "اجتہاد" اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے۔ یعنی  
تخصص، مہارت و دانشناسی اور اسلامی مسائل میں فنی کارشناسی۔۔۔ ایسی

پیش نہیں کہ مدسے کا ہر جگہ صرف اس بہانے مدعی ہو سکے کہ وہ چند دن کسی  
حوزہ علمیہ میں رہ چکا ہے۔

اسلامی مسائل میں مہارت اور اظہار نظر کی صلاحیت کے لیے پوری عمر درکار  
ہے جو اگر کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں ہے، اس پر ایک شرط زائد اس کا فطری ذوق  
اور قوت استعداد اور فن پر قابو اور توفیقات الہی کا ہونا ہے۔

مہارت خصوصی اور اجتہاد سے آگے۔ یہ لوگ ایسے ہوں جو مزاج رائے و نظر  
سمجھ جاتے ہوں۔ تقویٰ، معرفت الہی، خدا ترسی سے کما حقہ بہرہ مند ہوں، تاریخ  
اسلام ایسے افراد کی نشان دہی کرتی ہے جو تمام تر علمی و اخلاقی صلاحیتوں کے باوجود  
مجبوراً نظر کا وقت آتا تھا تو کانپنے اور تھرتھرانے لگتے تھے۔

محترم مطالعہ کرنے والوں سے معذرت چاہتا ہوں کہ گفتگو کا دامن اس بحث  
میں ان مطالب تک پھیل گیا۔

## پانچواں حصہ:

### قرآن کی نظر سے عورت کا انسانی درجہ

- — اسلام نے زن و مرد میں انسانی مساوات کی نگہداشت کی ہے۔
- — اسلام زن و مرد کے مساوی حقوق کے خلاف نہیں وہ دونوں کے حقوق میں مشابہت کے خلاف ہے۔
- — اسلام نے عورت کے بارے میں حقارت آمیز نظریوں اور رویوں کو کالعدم قرار دیا۔
- — قرآن نے اپنے بیان کردہ واقعات میں توازن رکھا ہے۔ واقعات میں فقط مرد ہی بڑے کردار کے نہیں دکھائے۔ خواتین کے بلند کردار بھی نمایاں کیا ہے۔
- — خواتین اگر مردوں کے برابر حصہ لینا چاہیں تو مرد کے حقوق سے مشابہت کا خیال ختم کریں۔
- — علماء اسلام کے کلیہ "عل" کی بنیاد پر فلسفہ حقوق کی اساس کھینچتے۔



• اہل مشرق نے انسانیت کو درگزر اور نیکی میں اور اہل مغرب نے حقوق حاصل کرنے میں محدود کر دیا۔

• منشور حقوق انسانی فلسفہ ہے قانون نہیں ہے۔ اسے فلسفیوں کی تائید و رکاز سے عوام کی نہیں۔

• منشور حقوق انسانی میں احترام آدمیت کی بات مذلوں کے مشرق اور اسلام میں تصدیق شدہ ہے۔

• مغربی دنیا ایک طرف تا بہ حد امکان انسانی مقام کو نیچے لے رہی ہے اور دوسری طرف حقوق انسانی کا لمبا ٹرنگ منشور جاری کر رہی ہے۔

• آج کے انسان کی مجبوری یہ ہے کہ اس نے "خود" کو بھلا دیا ہے۔

• احترام انسان فلسفہ مشرق سے ہم آہنگ ہے، فلسفہ مغرب سے نہیں۔

خداوند متعال: مؤلف

## قرآن کی نظر سے عورت کا انسانی درجہ

اسلام، عورت کو کس قسم کی مخلوق سمجھتا ہے؟ کیا شرافت، اور انسانی حیثیت سے اسے مرد کے برابر جانتا ہے یا ادنیٰ درجے کی جنس؟ یہ سوال ہیں جن کے ہم جواب دیں گے۔

اسلام خاندانی مسئلہ میں عورت و مرد کے لیے خاص عالمی حقوق کے بارے میں اسلام کا خاص فلسفہ

نفس کا قائل ہے۔ یہ فلسفہ گزشتہ چودہ سو برس اور آج کے فلسفے سے مختلف ہے۔ اسلام عورت مرد کے لیے ہر جگہ ایک طرح کے حقوق، ایک قسم کے فرائض، ایک نوع کی سزا کا قائل نہیں۔ کچھ حقوق اور ذمے داریاں اور سزائیں مرد کے لیے مناسب سمجھتا ہے، کچھ باتیں عورت کے واسطے کہیں و وزن و مرد کو مشابہ وضع میں دیکھتا ہے، کہیں یہ شائبہ نہیں داتا۔

یہاں؛ کس انداز و حساب کی بنیاد پر؟ یہ وجہ تو نہیں ہے کہ دوسرے رشتہ مانوں کی طرح اسلام بھی عورت کے بارے میں حقارت آمیز رویہ رکھتا ہے اور عورت کو پست جنس مانتا ہے یا کوئی اور علت و فلسفہ ہے؟

معدنی سسٹم کے پیروکار تقریروں اور تحریروں میں کہتے اور کہتے اور ہم آپ سنتے رہتے ہیں کہ اسلامی قانون قاعدے، مہر و نمان و نفقہ، طلاق و تعدد ازواج، عورت کی جنس کو حقیر رکھنے کے لیے ہیں۔ ہر جگہ عورت کی توہین کی گئی ہے۔ یہ لوگ سمجھاتے ہیں کہ تمام حکوم مرد ہی کی جنبہ داری کرتے ہیں۔

کہتے ہیں: بیسویں صدی سے پہلے رسم و رواج دنیا ہی یہ تھا کہ مرد کی جنس کو عورت کی جنس سے بہتر مانتے تھے۔ عورت فقط مرد کی لذت اندوزی اور بیگار کے لیے پیدا

لی گئی ہے۔ اسلامی قوانین بھی مرد کے فوائد کے گرد گھومتے ہیں۔

کہتے ہیں، اسلام مردوں کا دین ہے وہ عورت کو معیاری انسان نہیں مانتا اس کے لیے ایسے قوانین وضع نہیں کیے جو ایک انسان کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ اگر اسلام عورت کو مکمل معیاری انسان جانتا تو کئی کئی بیویاں رکھنے کی اجازت نہ دیتا، طلاق کا حق مرد کو نہ دیتا، دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر نہ مانتا، گھر کی سرداری مرد کو نہ دیتا، بیوی کی میراث مرد کے حصہ ترکہ میں نصف کی نسبت سے نہ رکھتا۔ مہر کے نام سے عورت کی قیمت مقرر نہ کرتا۔ عورت کو اقتصادی و معاشرتی خود مختاری دیتا، اسے وظیفہ و نفقہ گیر مرد نہ بناتا یہ باتیں ثابت کرتی ہیں کہ اسلام عورت کے بارے میں حقارت آمیز رویہ رکھتا ہے، اسے مرد کے لیے ایک وسیلہ جاتا ہے۔

کہتے ہیں: اسلام دراصل مساوات کا دین ہے، متعدد مقامات پر اس نے مساوات کا خیال رکھا ہے صرف مرد و زن کے بارے میں اس کا رویہ جدا ہے۔

کہتے ہیں: اسلام مردوں کے قوانین و حقوق میں امتیاز و ترجیحات کا قائل ہے اگر مردوں کے لیے ترجیحات کا قائل نہ ہوتا تو مذکورہ بالا ضابطے نہ بناتا۔

ان حضرات کے استدلال کو اگر منطق و منطق کے مطابق دھرائیں تو یہ شکل ہوگی: (الف) اگر اسلام عورت کو مکمل معیاری انسان مانتا تو مرد کے مساوی و مشابہ حقوق اس کے لیے بھی بناتا۔

(ب) اسلام عورت کے لیے مرد کے برابر اور اس سے مشابہ حقوق و قوانین کا قائل نہیں۔

(ج) لہذا، عورت کو ایک حقیقی و واقعی انسان نہیں مانتا۔

اس استدلال میں جو کجیہ استعمال ہوتا ہے وہ ہے کہ: "قانون میں یکسانیت و مشابہت (تشابہ) برابر کی یا مشابہت"

ن بنیاد پر حیثیت و اعزاز انسانی جانچا جائے اور زن و مرد کو ایک سمجھا جائے۔ اچھا تو نفسی زاویے سے بھی ایک گوتے پر اشارہ کیا جانا چاہیے۔ یعنی تباہی کے عورت و مرد میں انسانی حیثیت سے اشتراک کا لازمہ کیا ہے؟ لازمہ یہ ہے کہ دونوں قانونی مساوات رکھتے ہوں یعنی کسی قسم کی ترجیح اور کسی کام میں حقوقی امتیاز نہ ہو۔ یہ لازمہ یہ ہونا چاہیے کہ زن و مرد کے حقوق میں برابری و مساوات کے علاوہ ایک دوسرے کے مشابہت اور یک رنگی بھی ہونا چاہیے۔ کسی قسم کی تقسیم کار، کسی قسم کی تقسیم فرائض نہ ہو۔ زن و مرد کے انسانی مرتبے میں برابری بلا شک و شبہ موجود ہے۔ انسانی حقوق میں مساوات بھی ہے مگر حقوق میں ایک دوسرے کے مشابہ حقوق کا مقصد کیا ہے۔

اگر فلسفہ یورپ کی اندھی تقلید کو چھوڑ کر ان کے افکار و نظریات کے زاویے سے سوچنے کا حق دیا جائے تو ہم سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ آیا تساوی حقوق کا لازمہ تشابہ حقوق بھی ہے یا نہیں؟ آخر تساوی اور تشابہ میں فرق ہے۔ تساوی کے معنی برابری اور تشابہ کہتے ہیں یکسانیت کو۔ ممکن ہے باپ اپنی دولت اپنی اولاد میں مساوی سے تقسیم کر دے مگر تشابہ تقسیم نہ کرے۔ مثلاً باپ متعدد قسموں کے سرمائے کا مالک ہو۔ ایک تجارتی مرکز، ایک زرعی جائداد، کچھ کرایے کے مکانات و ملاک۔ ریکوں یا مزدائیوں کا جائزہ لینے کے بعد، اس نے اندازہ لگایا کہ ایک میں تجارت، دوسرے میں زراعت، تیسرے میں املاک کے کرایے کی وصول یا بی کا حقوق دیکھا۔ اپنا سرمایہ تقسیم کرتے وقت اس نے فیصلہ کیا کہ جائداد و املاک تقسیم کرتے وقت ہر ایک کے حصے کو قیمت میں برابر رکھنے کا خیال رکھا اور کسی کو ترجیح و امتیاز نہیں دیا۔ سب کو حصہ دیتے وقت اس کے حصے کی قیمت کا اندازہ کر لیا۔

یکتہ و مقدار، اور چیز کی کیفیت اور چیز ہے، برابر اور ہے اور یکسانیت اور ہے۔ طے شدہ بات ہے کہ اسلام نے یکساں اور ایک انداز حقوق زن و مرد کو



نہیں دیے ہیں۔ اس کے باوجود اسلام مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں امتیاز اور ترجیح حقوق کا بھی قائل نہیں۔ اسلام زن و مرد میں انسانی مساوات کا خیال ضرور رکھتا ہے۔ اسلام زن و مرد کے حقوق میں مساوات کا مخالف نہیں، تشابہ حقوق کے مخالف ہے۔

تساوی و مساوات و برابری کے لفظ میں چونکہ امتیاز نہ ہونے کا مفہوم بھی ہے لہذا لفظ نے "لقدس" کا پہلو اختیار کر لیا ہے، خصوصاً جب اسے "حقوق" سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ حقوق کی برابری و تساوی حقوق، کتنی مقصد میں خوبصورت ترکیب کون شخص ایسا ہوگا جو پاک فطرت اور صحیح وجدان رکھتا ہو اور ان دو لفظوں کو سن کر سر نہ جھکائے۔

میر کی سمجھ میں نہیں آتا، ہم ایک زمانے میں علم و فلسفہ و منطق کے علم بردار تھے، آج یہ حالت ہے۔ "تشابہ حقوق زن و مرد" کو "حقوق کی برابری" کے نام سے ہم پرست کیا جا رہا ہے۔

اس کی مثال تو یہ ہے، جیسے کوئی اپنے لبو (بے پند) کو گلابی (نامشپاتی) کی قسم کا ایک پھل، کہہ کر شور مچائے۔

سب مانتے ہیں، اسلام نے زن و مرد میں ہر جگہ تشابہ حقوق وضع نہیں کیے۔ نہ ہر جگہ اور ہر مقام پر ان کے بے مشابہ فرائض اور سزا جویز کی۔ ہاں، یہ سوال۔ کیا مجموعی طور پر جو حقوق عورت کو دیے ہیں وہ مردوں کو عطا کردہ حقوق سے کم قیمت ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اسے ہم ثابت کریں گے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت مرد کے حقوق کو بعض مقامات پر غیر متشابہ کیوں رکھا، علت کیا ہے؟ دونوں کو ایک دوسرے کے متشابہ کیوں نہ رکھا؟ اگر عورت و مرد کے حقوق مساوی بھی ہوتے اور متشابہ بھی تو اچھا نہ ہوتا، جو مساوی تو رکھے مگر متشابہ نہ بنائے؟ اس مدعا کو واضح کرنے کے لیے تین پہلوؤں پر بحث کرنا ہوگی۔

۱۔ تخلیق و پیدائش کے لحاظ سے عورت کی انسانی حیثیت پر اسلام کا نقطہ نظر۔  
۲۔ عورت و مرد کی تخلیق میں جو فرق ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ آیا یہ اختلاف دونوں کے طبعی و فطری حقوق میں نامشابہت رکھنے کا سبب ہے یا نہیں؟

۳۔ اسلامی منابع میں زن و مرد میں جو اختلافات ہیں وہ بعض حصوں میں نامشابہ حالات پیدا کرتے ہیں ان کا فلسفہ کیا ہے؟ کیا وہ فلسفے ابھی تک اپنے استحکام پر باقی ہیں؟

۱۔ قرآن فقط قوانین کا مجموعہ نہیں، اس کے مندرجات صرف خشک قواعد و ضوابط ہی نہیں بلکہ ان کی تشریح بھی ہے۔ قرآن میں قانون، تاریخ و خط

تفسیر خلقت اور ہزاروں مطالب ہیں۔ قرآن کبھی قانونوں کے بیان میں دستور العمل معین کرتا ہے۔ کبھی وجود و ہستی کی تشریح، کبھی خلقت زمین و آسمان، نباتات و حیوانات، انسان اور موت و زندگی، عزت و ذلت، عروج و زوال، غربت و امیری سے رہنمائی دیتا ہے۔

قرآن کتاب فلسفہ نہیں ہے، اس کے باوجود، کائنات، انسان، اور مومن و کافر کے فلسفے کے تینوں اہم موضوعات کے بارے میں اپنی حتمی رائے ضرور دیتا ہے۔ قرآن، اپنے پیروکاروں کو فقط قانون کی تعلیم نہیں دیتا، صرف وعظ و نصیحت نہیں کرتا، وہ شریعت تخلیق کائنات بھی کرتا ہے انداز و فکر و کائنات شناسی کا خاص زاویہ بھی بتاتا، انسانی ضمیر میں معاشرے جیسے مالکیت، حکومت، عائلی قوانین وغیرہ کی تشریح بھی کرتا ہے اور اسے تخلیق و موجودات ہی میں قرار دیتا ہے۔

تو مسائل قرآن مجید میں تشریح طلب سمجھے گئے ہیں، ان میں زن و مرد کی تخلیق جی ہے۔ قرآن نے اس بارے میں خاموشی اختیار نہیں کی اور بے معنی خیال آرائی

کرنے والوں کو موقع نہیں دیا کہ وہ اپنی طرف سے عورت و مرد کے لیے کوئی فلسفہ گزرا  
ورنہ ان کی اسلام سے نسبت دے کر مذہبی مسلمات کا نام دیں۔ اسلام نے آگے بڑھ کر  
خود عورت کے بارے میں اپنا نقطہ بیان کیا ہے۔

قرآن مجید کا عورت کے بارے میں نقطہ نظر معلوم کرنے سے پہلے دوسری مذہبی  
کتبوں میں زن و مرد کی سرشت پر گفتگو بھی دیکھتے چلیے قرآن مجید بھی خاموش نہیں دیکھنا  
چاہیے کہ تخلیق زن و مرد کے بارے میں قرآنی نقطہ نظر ہے کیا؟ دونوں ایک خیمہ سے  
بنے ہیں یا الگ الگ؟ دونوں کی سرشت ایک ہے یا مرد کی طینت اور ہے عورت  
کی سرشت اور ہے۔ قرآن بڑی صفائی سے متعدد آیتوں میں کہتا ہے کہ عورت کو مرد  
کی جنس اور اسی جیسی سرشت سے پیدا کیا ہے۔ آدم اول کے بارے میں ارشاد ہے  
”تم سب کو ایک باپ سے اور اس کی شریک حیات کو خود اسی کی جنس سے قرار دیا  
والنساء / تم آدم نژاد کے لیے فرمایا: اللہ نے خود تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں  
پیدا کیں (انساء، آل عمران، الروم)

کچھ مذاہب کی کتابوں میں جو لکھا ہے کہ عورت کو مرد کے مقابلے میں حقیرانہ  
سے پیدا کیا گیا۔ یا عورت کو بائیں یا زائد حصہ جسم قرار دیا گیا، اور یہ کہ آدم اول کی بیوی  
آدم کے بائیں بہو کے کسی عضو سے پیدا کی گئیں۔ قرآن میں اس کا کوئی سراغ نہیں  
ملا۔ نابہرین، اسلام میں عورت کے لیے سرشت و طینت کی بنیاد پر کوئی حقارت  
آئینہ نظریہ موجود نہیں۔

ایک اور نظریہ حقارت آئینہ نامی میں موجود تھا اور بین الاقوامی ادب میں  
اس کے ناپسندیدہ نشان ملتے ہیں۔ وہ تھا کہ عورت عنصر گناہ ہے۔ عورت چھوٹا  
شیطان ہے مرد جو گناہ و جرم کرتے ہیں اس میں عورت کا دخل ہوتا ہے۔ مرد بذاتہ گناہ سے پاک ہے  
عورت لے گناہ کی طرف لے جاتی ہے شیطان براہ راست مرد تک نہیں پہنچ سکتا وہ عورت کے ذریعے مرد کو فریب

دیتا ہے شیطان، عورت کو دوسو سے میں ڈالتا اور وہ مرد کو۔ آدم اول نے جو شیطان  
کا فریب کھایا اور سعادت کی جنت سے نکلے وہ بھی عورت کے سبب ہوا شیطان نے  
حوا کو ورغلا یا اور انھوں نے.....

قرآن نے جنت آدم کی بات چھیڑی ہے مگر کہیں یہ نہیں کہا کہ شیطان یا سانپ  
نے حوا کو فریب دیا، اور حوا نے آدم کو قرآن حوا کو نہ دے دے دار قرار دیتا ہے نہ ان کو حساب  
فارج کرتا ہے۔ قرآن کے بقول: ہم نے آدم سے کہا، تم اور تمہاری زوجہ بہشت میں  
رہو اور اس کے میوے کھاؤ۔ شیطان کے دوسووں کے تذکرے میں قرآن ثنیہ کی فریب  
لاتا ہے:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ شَيْطَانُ نَافِلٍ فِي دُونِ الْوَلَدِ لَيْسَ دَسْوِدَ الْكَيْ  
فَدَلَا هُمَا بَعْدَ ذَٰلِكَ شَيْطَانُ نَافِلٍ فِي دُونِ الْوَلَدِ لَيْسَ دَسْوِدَ الْكَيْ  
وَقَا سَمِعَا أَنِّي لَكُمْ مِنَ النَّاصِحِينَ يَعْنِي شَيْطَانُ نَافِلٍ فِي دُونِ الْوَلَدِ لَيْسَ دَسْوِدَ الْكَيْ  
میں قسم کھائی کہ وہ ان کی بھلائی چاہتا ہے۔

اس طرح قرآن مجید نے اس دور کے عام عقیدے بلکہ آج کی دنیا میں بھی  
کہیں کہیں پائے جانے والے عقیدے کے خلاف سختی سے قدم اٹھایا اور جنس زن  
کو اس اتہام سے بری قرار دیا کہ وہ عنصر گناہ یا گناہ ہے یا چھوٹا شیطان ہے۔

یہ حقارت آئینہ نظریہ بھی عورت کے بارے میں موجود ہے کہ اس کی روحانی  
و رغباتی صلاحیت کے پیش نظر وہ جنت میں نہیں جائے گی۔ عورت روحانی سراج  
اور الہی معارف کو نہیں پاسکتی۔ جیسے مرد قرب الہی حاصل کرتے ہیں عورت کو یہ

۱۔ بقرہ / ۳۵ (يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا)

۲۔ الاعراف / ۳۰ ۳۔ الاعراف / ۲۲ ۴۔ الاعراف / ۲۱



مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید نے متعدد آیات میں صاف صاف کہا ہے کہ آخرت کا بدلہ، اور قرب الہی کا جنس سے کوئی تعلق نہیں، یہ مسئلہ ایمان و عمل کا ہے۔ س میں عورت ہو یا مرد، قرآن مجید نیک اور مقدس مرد کے ساتھ نیک اور مقدس خاتون کا تذکرہ کرتا ہے۔ آدم و ابراہیم علیہما السلام کے ساتھ ان کی بیویاں، حضرت موسیٰ و عیسیٰ کی محترم بیویاں، بڑے اعزاز سے یاد کی گئی ہیں۔ نوح اور لوطؑ کی بیویوں کا نام بیویوں کے ضمن میں بیان کیا مگر نہایت موزوں انداز سے۔ زوجہ فرعون، ایک بڑی خاتون جو انتہائی گندے شوہر کے ساتھ رہیں۔ گویا قرآن نے اپنی تاریخی حکایتوں میں توازن کو برقرار رکھا۔ اور اپنی داستانوں کے بیرو مرد ہی نہیں خواتین کو بھی یاد رکھا ہے۔

قرآن کریم، مادر حضرت موسیٰ کے بارے میں کہتا ہے :  
 ”ہم نے مادر موسیٰ کو ”حی“ بھیجی کہ بچے کو دو دودھ پلائیں اور جب ان کی جان کے بارے میں وہ خوف زدہ ہوں تو ہمند میں ڈال دیں اور ڈریں نہیں کہ ہم اسے تمہارے واپس لوٹا دیں گے“

قرآن کریم مادر عیسیٰ حضرت مریم کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کا مرتبہ یہاں تک پہنچا کہ ملائکہ محراب عبادت میں ان سے باتیں کرتے تھے۔ غیب سے ان کے لیے روزی آتی تھی، روحانی مرتبہ اتنا بلند ہوا کہ پیغمبر وقت حیران رہ گئے وہ نبی سے آگے بڑھ گئیں، زکریا، مریم کے سامنے حیران ہو گئے۔

تاریخ اسلام میں مقدس و بلند مرتبہ عورتیں فراواں ہیں، حضرت خدیجہ کے پائے کے بہت کم مرد میں گئے اور پیغمبر و علیؑ کے سوا فاطمہؑ کا ہم پایہ کوئی نہ تھا۔

۱۵۸ ”واضحیتا الخ ام موسیٰ ان ارضعیہ ...“

حضرت زہرا سلام اللہ علیہا خاتم الانبیاء کے علاوہ تمام پیغمبروں اور اپنی اور درجہ نام تھی، سب پر شرف رکھتی ہیں۔ اسلام نے خلیفہ سے حق کی طرف سفر میں زن و مرد کا فرق نہیں کیا، ہاں خلیفہ سے خلیفہ کے سفر میں اور پیغمبرانہ ذمہ داریوں میں مرد کو مناسب تر سمجھا ہے۔

عورت کے بارے میں ایک اور حقارت آمیز نظریہ تھا، وہ مجرد جنسی ریاضت، شادی نہ کرنے اور مرد سے دور رہنے کا دستور تقدس ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بعض عینوں میں جنسی روابط بدلتے نچس ہیں، اور ان قوانین کے ماننے والوں میں فقط وہی لوگ روحانی درجے حاصل کر سکتے ہیں جو ساری زندگی کنوار پن میں گزر دے، بلاتوقی پیشوائے مذہبی کا جہلہ ہے ”بکارت کے تیشے سے شادی کے درخت کو جڑ سے کاٹ دو“ یہی پیوستہ دی کو فساد ترک کر کے یوں کر کرتے ہیں ان کی لالچوں کی کثرت کنوار پن پر مبرک کر سکتے ہیں، ہوا کرتا کہ رشتہ دار گھر سے ہوجاتے ہیں، متعدد عورتوں سے بچتے ہیں، ریاضت کی فکر در مجرد زندگی کی حمایت اور کنوار پن، جنس خواتین سے بدظنی ہے۔ یہ لوگ عورت سے محبت کو فطرتی تباہ کاری شمار کرتے ہیں۔

سلام نے اس بے معنی نظریے اور عمل سے مقابلہ کیا اس نے ازدواج کو مقدس قرار دیا، کنوار پن کو منحوس شمار کیا، اسلام نے عورتوں سے محبت کو انبیاء کے اخلاق کا حصہ بنا دیا، اور کہا: ”من اخلاق الانبیاء حب النساء“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا، مجھے تین چیزیں پسند ہیں خوشبو، عورت اور نماز۔

برٹنیہ، رسل کہتے ہیں: تمام مذاہب میں جنس زن کے بارے میں بدظنی ہے، اسلام کے علاوہ، اسلام نے معاشرتی فلاح و بہبود کے زاویے سے حدود و پابندیاں تو لگائی ہیں مگر اس رابطے یا عورت کو نجس قرار نہیں دیا۔

عورت کے بارے میں حقارت آمیز ایک رویہ یہ بھی تھا کہ: عورت وجود

مرد کا پیش خیمہ ہے، وہ مرد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

اسلام نے کوئی ایسا بات نہیں کہی، اسلام نے انتہائی وضاحت سے علت غائی بیان کی اور اسلام صاف صاف کہتا ہے: زمین و آسمان، ابر و ہوا، نباتات اور حیوانات سب انسان کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ عورت مرد کے لیے پیدا ہوئی، اس کے بجائے وہ ایک کو دوسرے کے لیے پیدا ہونے کا تذکرہ کرتا ہے:

”مَنْ لَبَسَ لَبَاسًا كَثَمَ وَثِقَتُهُ لِحَمْنٍ“۔ عورتیں تمہارے لیے زینت و لباس ہیں تم عورتوں کے لیے لباس و زینت ہو۔ اگر اسلام عورت کو مرد کے لیے پیش خیمہ جانتا تو بہر حال اپنے قوانین میں اس زاویے کو ملحوظ رکھتا، لیکن چونکہ اسلام تشریح خلقت کے نقطہ نظر کا حامی نہیں اور عورت کو طفیلی وجود مرد نہیں مانتا، اس بنا پر اس نے اپنے ضابطوں میں زن و مرد کے لیے یہ گوشہ پیش نظر نہ رکھا۔

حقارت آمیز رویوں میں سے ایک رویہ یہ بھی ہے کہ عورت ایسا شر و بلا ہے جس سے مرد بچ نہیں سکتا، بہت سے مرد جنحوں نے عورت سے فائدہ اٹھایا ہے، وہ بھی اسے بغیر اور اپنی بہت کم کی بنیاد جلتے ہیں قرآن حکیم نے خصوصی طور پر اس بات کی یاد دلائی ہے کہ وجود زن مرد کے لیے خیر و آرام دل و جان ہے۔

توہین آمیز رویوں میں یہ بات بھی ہے کہ عورت تولید میں ناچیز ہے، جاہلیت کے عرب اور متعدد قومیں ماں کو مرد کے مادہ خلیق کا برتن جانتی تھیں ان کے خیال میں مرد کا مادہ ہی اصل بیج ہے ماں فقط اسے محفوظ رکھتی اور نشوونما دیتی ہے۔

۱۸۶/ بقدر

۱۸۷/ ۲۱ - وَمِنْ آيَاتِهِ انْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا اِيَهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ۔

وَرَّان مجید نے متعدد آیات میں پھر تفاسیر اس سوچ کو ختم کیا، اور مرد و عورت کو مساوی بتایا۔

مذکورہ بالا گفتگو سے واضح ہو گیا کہ فلسفیانہ اور تخلیقی بیانات کے نقطہ نظر سے اسلام کسی قسم کی حقارت آمیز رائے نہیں رکھتا، بلکہ ایسے خیالات کو بے ہودہ سمجھتا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ مرد و زن کے حقوق میں تشابہ نہ ہونے کا فلسفہ کیسے؟ ہم نے کہا ہے، اسلام زن و مرد کے خاگی تعینات و حقوق میں خاص فلسفہ کا مالک ہے، اسلام کا فلسفہ پنودہ سو برس پہلے کے فلسفے سے مختلف اور عاصر فلسفے سے بھی متفق نہیں ہے۔

## مساوات؟ ہاں۔ مشابہت؟ نہیں۔

ہم کہہ چکے کہ اسلام میں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں کہ مرد و زن دو مساوی انسان ہیں یا انسانیت میں فرق ہے؟ کیا ان کے گھریلو حقوق قیمت کے لحاظ سے مساوی ہوں یا نہیں؟ اسلام کی نظر میں مرد و زن دونوں انسان ہیں اور انسانی حقوق میں برابر کے حصے دار ہیں۔

اسلام کے نزدیک بحث طلب بات ہے کہ زن و مرد فقط اس بنا پر کہ ایک عورت ہے، دوسرا مرد، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں، کائنات ان دونوں کے لیے یکساں نہیں ہے، حقیقت اور طبیعت نے دونوں کو ایک جیسا تسلیم نہیں کیا، وہ یہی ثابت کرتے ہیں کہ بہت سے پہلوئیں ہیں جہاں حقوق و فرائض، قانون سزا میں مشابہ وضع نہیں ہے۔ یورپ کو شاں ہے کہ عورت و مرد بلحاظ قوت و ضوابط، حقوق و فرائض میں وضع کے طور پر ایک اور مشابہ ہیں۔ اور طبیعت اور نچر کے خدائت کو نظر انداز کرتے ہیں۔ سہم اور مغربی سسٹم میں ایسے اختلاف و نما ہوتا ہے بنا پر جسکا ہم سے ملت اسلامی قوانین کے طرفدار و مغربی سسٹم کے حامی اکائی اور تشابہ قوانین زن و مرد

۱۸۸/ ۱۳ - یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی...۔ یہ بات پہلی دور کی ہے، انقلاب اسلامی کے بعد سوشل سسٹم میں بھی ہے، لیکن ایران کے علاوہ متعدد مسلمان ملکوں کا سنی سسٹم ہے کہ سہم کا یہاں تو ہے مگر ان کے قوانین میں بھی وہ۔



کے مسئلہ پر نہیں کر رہے ہیں۔ تساوی حقوق پر نہیں "تساوی حقوق" حقوق کی مساوت "لیبل ہے جو تشابہ حقوق پر مغرب کے اندھے تعلقوں نے فریکے لیے چپا کر دیا ہے۔

میں نے ہمیشہ تحریروں، تقریروں اور کانفرنسوں میں اس جعلی لیبل کے استعمال سے پرہیز کیا ہے۔ میں نے کبھی "تساوی حقوق" کا نام "تشابہ و تداخل حقوق" کو نہیں دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں "برابری حقوق مرد و زن" کے کوئی معنی نہیں اور تمام گنتہ موجودہ قوانین عورت و مرد کے حقوق کے بارے میں مساوی قیمت و اقدار پر مبنی قرار دیے گئے ہیں اور صرف مشابہت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

نہیں، میرا یہ دعویٰ نہیں۔ بیسویں صدی سے پہلے کا یورپ بہتر گواہ ہے۔ بیسویں صدی سے پہلے وہاں کی عورت قانونی اور عملی طور پر انسانی حقوق سے محروم تھی۔ نہ اسے مرد کے برابر حقوق حاصل تھے نہ مشابہ حقوق۔ وہ.... ایک جلد باز انقلاب میں (جو ایک صدی سے کم میں رونما ہوا) جس کا نعرہ عورت اور وہ برائے عورت تھا، یہ انقلاب یورپ میں اٹھا اور اس نے عورت کو کم و بیش مرد کے مشابہ حقوق دے دیے لیکن طبعی اور جسمانی اور نفسیاتی ضروریات کے پیش نظر عورت کبھی بھی مرد کے برابر حقوق پیدا نہ کر سکی۔ اگر عورت، مرد کے برابر حقوق حاصل کرنا چاہتی ہے آگے مرد کی خوش نصیبی جیسی خوش نصیبی کی آرزو ہے تو اس کا صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ راستہ "حقوق کی مشابہت سے دست برداری" ہے۔ مرد کے حقوق مرد کے مناسب اور خود اس کے حقوق اس کے مناسب احوال کا خود اعتراف و مطالبہ کرے۔ صرف ایک راہ یہ ہے کہ عورت و مرد میں سچا خلوص اور اتحاد پیدا ہو۔ عورت مرد کے برابر بلکہ اس سے بہتر خوش نصیبی سے شاد کام ہو سکتی ہے۔ مرد بھی سچے دل سے، کسی غفلت و سستی کے بغیر، فربہ کاری سے نکل کر عورتوں کو اپنے

برابر بلکہ بہتر حقوق کا اعتراف کریں۔

میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ ہمارے موجودہ بظاہر اسلامی معاشرے میں جو قوانین عملاً رائج ہیں وہ قدر و قیمت کے لحاظ سے عورت کو مرد برابر حقوق دیتے ہیں۔ کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ آج کی عورت کے معاملات کی مکمل چھان بین کی جائے اور وہ بہت سے حقوق جو اسلام نے عورت کو دیے ہیں اور طویل مدت سے عملان کو چھوڑ رکھا گیا ہے۔ وہ سب حقوق واپس کیے جائیں۔ مگر یورپ کی اندھی تقلید میں نہیں جو خود ان کے لیے مصیبت غلیم کا بے بن ہوئے ہیں ہم بھی غلط طریقے اور مفروضے کا خوبصورت نام رکھیں۔ اور مغربی قسم کی بد نصیبیوں پر مزید مشرقی قسم کی بد بختیاں بڑھا دیں میرا قہقاریہ ہے کہ عورت اور مرد کی طبیعت و خیر میں جس حد تک مشابہت نہیں ہے۔ وہاں تک دونوں کو غیر مشابہتی حقوق دیے جائیں اور اس میں "عدل" و "حقوق فطری" کی نگہداشت رہے۔ یوں عائلی زندگی بھی خوشگوار ہو سکے گی اور معاشرہ ہمیشہ خوشی میں آگے بڑھ سکے گا۔

اچھی طرح سمجھ دیجیے کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ انصاف عدالت اور فطری و انسانی حقوق زن و مرد کا لازمہ یہ ہے کہ کچھ حقوق میں "تشابہ" نہیں ہے۔ لہذا ہماری سو فی صد فلسفیانہ پہلو ہے۔ اس کا تعلق فلسفہ قانون سے ہے۔ اس کا تعلق "اصل عدالت" اور کلیہ "انصاف" سے ہے "عدل" اصول دین میں بھی ہے اور فقہ اسلامی میں بھی کہیں کی حیثیت رکھتا ہے۔ "اصل عدل" وہ کلیہ ہے جو اسلام میں "عقل و شرع"

نہ بات پہلی دور کی ہے۔ انقلاب اسلامی کے بعد صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ لیکن یوں کے مزد و متعہ و مسلمان ملکوں کا مسئلہ یہی ہے کہ اسلام کا لیبل تو ہے مگر میں وہ قوانین کچھ اور۔

کی طبیعت کا سبب یعنی اسلامی فقہ۔ کم کم شیعہ فقہ۔ میں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ فلا  
قانون خدا بنیاد پر خلاف عدل ہے اور اگر اس کی صورت یہ ہو تو ظلم ہوگا اور  
اس عدل کے خلاف ہے، اگر یہ ثابت ہو جائے تو مجبوراً ماننا پڑے گا کہ شریعت  
کا حکم یہی ہے، کیونکہ شریعت نے خود ایک اصل کی تعلیم دی اور کہا ہے کہ عدل  
و حقوق فطری و طبیعی کے محور سے حکم کو دور نہ ہونا چاہیے۔

مقدیم یہی تھا کہ وہ لوگ اپنا کام مکمل طور پر آگے نہ بڑھا سکے تقریباً آٹھ صدی بعد  
یورپ کے فلسفہ اور دانشوروں نے سمجھا کیا اور یہ اعزاز اپنے لیے حاصل کر لیا کہ معاشرتی  
و سیاسی و اقتصادی فلسفے پیدا کیے اور دوسری طرف افراد، معاشروں اور قوموں کو زندگی  
کی قدروں اور ان کو ان کے انسانی حقوق سے آشنا کیا، تحریکات اور انقلابات برپا کیے  
دنیا کی صورت کچھ سے کچھ کر دی۔

میرے خیال میں تاریخی اسباب کے علاوہ ایک نفسیاتی و جغرافیائی سبب کا  
ذیل بھی تھا، بامعنی کہ اسلامی مشرقی بلاک میں عقلی حقوق کا مسئلہ تو موجود تھا مگر  
لوگوں نے اس کو مسلسل توجہ کے قابل نہ سمجھا، اس کی ایک وجہ مشرقی و مغربی لوگوں کے  
اخلاقی رجحانات ہیں، مشرقی اخلاق کی طرف مائل ہے اور مغرب حقوق کی طرف، مشرق  
اخلاق کا دیوانہ، مغرب حقوق پر فریفتہ، مشرق اپنی فطرت و طبیعت کی بنا پر انسانیت  
کا مطلب یہ سمجھتا ہے کہ جذبات کام میں لائے درگزر کرے، اپنے ہم نوع افراد سے  
محبت کرے، جواں مردی اور فرائح جو صِلگی دکھائے لیکن مغربی انسان کے نزدیک  
انسانیت کا مطلب ہے اپنے حقوق جاننا، اس کا دفاع کرنا، اور کسی کو یہ حق نہ دینا کہ اس کے  
حقوق کے دائرے میں قدم رکھے۔

بشریت کو اخلاق کی ضرورت بھی ہے اور حقوق کی بھی۔ انسانیت حقوق  
سے بھی تعلق رکھتی ہے اور اخلاق سے بھی، اخلاق و حقوق الگ الگ انسانیت کا

معیار نہیں ہیں۔

دین مقدس اسلام اس غظیم خصوصیت کا حامل تھا اور ہے۔ اس نے حقوق اخلاق  
کو ایک وقت مرکز توجہ قرار دیا۔ اسلام کے نزدیک خلوص و نیکی، اخلاق معاملات ہیں  
اور مقدس کام، حقوق اور ان کا دفاع بھی مقدس اور انسانی کام شمار ہوتے ہیں۔  
یہ تفصیل طلب داستان ہے جس کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے۔

خاص مشرقی روح نے اپنا عمل انجام دیا، شروع شروع میں تو حقوق و اخلاق  
دونوں اسلام سے لیے اور ان پر عمل کیا لیکن آہستہ آہستہ حقوق کو چھوڑ دیا اور  
اخلاق پر توجہ جمالی۔

مقصود یہ ہے کہ اس وقت جس مسئلہ کا سامنا ہے۔ وہ مسئلہ قانونی ہے، وہ  
مسئلہ عقلی و فلسفی ہے، وہ مسئلہ استدلال و برہان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا تعلق  
عدالت اور جج آف لاء سے ہے۔ عدالت و انصاف و حقوق، قانون وضع ہونے سے  
پہلے موجود تھے اور قانون وضع کرنے سے عدالت و حقوق انسانی کی حقیقت نہیں بدلی  
جاسکتی۔

مان تیسکیو کہتا ہے۔

”نسان کی قانون سازی سے پہلے، ایسے عادلانہ رویے موجود تھے جو مخلوقات  
پر حکومت کرتے تھے۔ انھیں رویوں کا وجود بعد میں قانون سازی کا سبب بنا، اب  
آئینہ فرض کر رہے ہیں کہ سوائے ابتدائی قوانین کے کوئی شے عادل یا ظالم وجود نہیں رکھتی تو  
گویا ہم اس کے مدعی ہو رہے ہیں کہ دائرہ بننے سے پہلے اس دائرے کی تمام شعاعیں و خط  
مساوی ہیں ہیں۔“

سہ برٹ سپنسر کہتا ہے:

”عدالت احساسات کے علاوہ کسی اور چیز سے مخلوط ہے اسے افراد بشر کے طبیعی



حقوق کہتے ہیں۔ اور عدالت کے وجود خارجی سے پہلے حقوق اور طبیعی خصوصیات (و امتیازات) کا احترام کرنا چاہیے۔

یورپ کے فلسفی یہی عقیدہ پہلے بھی رکھتے تھے اور اب بھی وہ بہت بڑی تعداد میں اسی کے حامی ہیں۔ حقوق انسانی کے اعلانات اور منشور اسی نظریے کے ماتحت مرتب ہوئے اور جو دفعات وضع کی گئی ہیں وہ حقوق طبیعی کے مفروضے سے حاصل شدہ نتائج ہیں یعنی حقوق صبی و فطری کا مفروضہ ہے جس نے اعلان حقوق انسانی "روپے چارے" میں معلوم ہے کہ مان ٹیکو، اسپنسر وغیرہ عدالت کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں بعینہ وہی بات ماہرین علم کلام (علم عقائد) "حسن و قبح عقلی" کے ضمن میں کہتے ہیں۔ مسلمان علماء میں کچھ لوگ ذاتی حقوق کے منکر اور عدالت کو معاہداتی چیز جانتے ہیں۔ یورپ و لوں میں بھی یہ خیال موجود تھا، انگریز "ہوبز" عدالت کو ایک موجود حقیقت نہیں مانتا تھا۔

**حقوق انسانی کا منشور**  
**فلسفہ قانون نہیں ہے**  
منشور کو حکومت کے دونوں ایوانوں نے منظور کیا ہے۔ بات ہے عہد شاہی کی۔ اور چونکہ حقوق زن و مرد اس منشور کی ایک دفعہ ہے لہذا قانون تائید ہر دو ایوان

۱۔ علم کلام و عقائد میں ایک بحث یہ ہے کہ اچھائی اور برائی عقلی بنیاد پر موجود ہے یا اسلام نے جسے چھاکا وہ اچھا ہے اور جسے برا کہا وہ برا ہے۔ یہی بحث "عدل" کے موضوع میں دبستان بناتی ہے۔  
۲۔ یہی بحث نورو و معتزلہ۔

۳۔ دونوں ایوانوں سے مراد اس وقت کی مجلس ملی اور سنا ہے۔ مدعی کہتے تھے کہ عورت مرد کے مساوی حقوق کا مسئلہ قابل بحث یوں نہیں ہے کہ سینٹ اور اسمبلی نے منشور حقوق انسانی، اقوام متحدہ منظور کر لیا ہے اور اس میں مساوی حقوق موجود ہیں لہذا "سول لا" میں اگر غیر مساوی ہیں۔

کے مطابق عورت و مرد کو مساوی حقوق کا مالک ہونا چاہیے۔

شاید منشور حقوق انسانی، قرارداد اور مسودہ قانون، ہے اور اس میں صلاحیت ہے کہ دونوں ایوان اسے منظور یا نامنظور کر سکیں!؟  
منشور حقوق انسانی کے مشتملات قرارداد قسم کے نہیں ہیں کہ مختلف ممالک کے قانون ساز ادارے اس کو منظور یا نامنظور کر سکیں۔

منشور حقوق انسانی، ذاتی حقوق ہیں وہ نہ چھینے جاسکتے ہیں نہ خود آدمی انھیں کسی کو دے سکتے ہیں نہ نظر انداز کر سکتے ہیں یا ایسے حقوق ہیں جن پر اس میں گفتگو کی گئی ہے اس منشور میں ایسے حقوق پر گفتگو ہے جو منشور کے دعوے کے مطابق انسانی حیثیت کے پورے میں اور حیثیت کے توانا ہتھوں نے انسان کے لیے عین ہیں۔ یہ حقوق منشور کے دعوے کے مطابق ان لوگوں کو ملے انسان اس منشور کے حقوق اپنے لیے وضع نہیں کر سکتے، نہ وہ اپنے اختیار سے سلب یا ساقط کر سکتے ہیں۔ دونوں ایوانوں کی منظوری یا قانون ساز اداروں کی تائید کا تو سوال ہی نہیں۔

منشور حقوق انسانی فلسفہ ہے قانون نہیں ہے۔ اس کی منظوری فلسفیوں کو کرنا چاہیے نہ اسمبلی کے نمائندوں کو، دونوں ایوانوں کو یہ حق کہاں ہے کہ وہ اپنی اٹھک بیٹھکوں میں لوگوں کے یہ منطق و فلسفہ وضع کریں۔ اور اگر ایسا ہے تو اس سائن کا فلسفہ منسبت بھی اسمبلی میں نہیں اور نمائندوں سے وہ تنگ کرایا نہیں سائنائی کروں میں فلسفہ حیات بھی منظور کرایا نہیں۔ طبیعت کے قانون، قراردادوں کی طرح منظور یا منظور نہیں ہو سکتے۔ جیسے ہم میں کہ دونوں ایوان نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا ہے کہ گلابی زاشی

۱۔ تو منوج، نے جہاں شہید مہتری اس کا جواب دیتے ہیں کہ منشور میں تائید دہی لغت یوں کی ضرورت ہی نہیں وہ ایک فلسفہ و مستقل دستور ہے۔

کا سب سے پیوند لگایا جائے تو پیوند لگ جاتا ہے اور اگر شہوت کے درخت میں اس کا پیوند لگایا جائے تو نہ لگے گا۔

جب اس قسم کے اعلان کسی ایسے گروہ کی طرف سے شایع ہوں جو مفکر اور فلسفی ہوں تو اقوام کو چاہیے کہ ان اعلان کو فلسفہ اور مجتہدین کے سامنے رکھیں اور اگر اس قوم کے مفکرین و فلاسفہ کی رائے اس کے حق میں آجائے تو اس قوم کے تمام افراد پابند ہیں کہ ان حقائق کو قانون سے باہر سمجھیں، قانون ساز اور بھی پابند ہیں کہ کوئی قانون اس کے خلاف وضع نہ کریں۔

دوسری قوموں کا معاملہ یہ ہوگا کہ جب تک خود ان کی رائے میں یہ ثابت نہ ہو جائے کہ واقعا طبیعت میں یہ حقوق اسی طرح سے موجود ہیں اس وقت تک وہ اس کی پابندی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ پھر یہ مسائل تجرباتی تو ہیں نہیں جن کے لیے وسائل اور لیبارٹری ہو اور وہ آلات اور لیبارٹریاں صرف یورپ والوں کو میسر ہیں دوسروں کے پاس نہیں ہیں۔ ایٹم کو توڑنے اور اس کے دوکے راز معلوم کرنے کی بات نہیں کہ یہ سب کچھ چند محدود افراد کے قبضے میں ہے۔ یہ فلسفہ و منطق کی بات ہے اور اس کے بارے میں مغز، عقل اور قوت استدلال۔

فرض کیجیے کہ دوسری قومیں مجبور ہوں اور فلسفہ و منطق میں وہ دوسروں کی تقلید کریں، اپنے اندر موزونیت اور فکر فلسفی کی کمی محسوس کریں تو ہم ایرانیوں کو تو یہ نہ کرنا چاہیے۔ ہم نے ماضی میں اپنی صلاحیتیں درجہ کمال پر دکھائی ہیں اور منطق و فلسفہ کی چھان بین کا مکہ ہیں۔ ہم فلسفے کے مسائل میں دوسروں کی تقلید کیوں کریں؟

مسلمان دانشوروں پر حیرت ہے کہ جہاں "اصل عدالت" اور انسان کے نجی حقوق کا نام آتا ہے، وہ اس قدر اس کی اہمیت ماننے لگتے ہیں کہ چوں و چرا کے بغیر "عقل و شرع" کی مطابقت کا اصول برتنے لگتے ہیں اور فرماتے ہیں "یہی حکم شرعی ہے"

یعنی شرعی تائید کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اب معاملہ یہاں تک پہنچا ہے کہ ان مسائل کی تائید اسمبلی کے نمائندوں سے طلب کی جاتی اور اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ہم عورت کے حقوق انسانی کی تحقیق کے لیے لڑکوں اور لڑکیوں سے رجوع کریں، کوپن (سوالنامہ) چھاپ کر ان سے جواب لکھوائیں، اور اس کی روشنی میں نتیجہ نکالیں کہ انسانی حقوق کیا ہیں؟ کیا عورت و مرد کے انسانی حقوق ایک جیسے ہیں یا دو طرح کے ہیں؟

بہر حال، ہم عورت کے انسانی حقوق کا مسئلہ علمی و فلسفی اساس اور انسان کے ذاتی حقوق کی بنیاد پر دیکھیں گے اور یہ معلوم کریں گے کہ جن اصولوں کا یہ تقاضا ہے کہ تمام انسان کلی طور پر خداداد اور طبعی حقوق کے ایک سلسلے کے مالک ہیں، آیا وہی اصول یہ بھی لازم قرار دیتے ہیں کہ عورت و مرد بھی حقوق کے نقطہ نظر سے مشابہ (وضع) حالت رکھتے ہیں یا نہیں؟ میں ملک کے صحیح دانشوروں، مفکروں اور قانون دان حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمارے دلائل کو تحقیق و تنقید کی نظر سے دیکھیں۔ کیونکہ ایسے حضرات ہی اس قسم کے مسائل میں اظہار رائے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انتہائی شکر گزاری کا باعث ہوگا اگر یہ حضرات اپنی رائے دلائل کے ساتھ بیان فرمائیں۔ تائید میں ہوتا رہے۔

اس مدعا کی توثیق تک پہنچنے کے لیے پہلے انسانی حقوق کی اساس و بنیاد سے بحث کرتے ہیں۔ پھر عورت و مرد کے حقوق کو موضوع مطالعہ بنائیں گے۔

مناسب ہوگا اصل مطلب سے پہلے ہی مدعی میں حقوق سے متعلق تحریکوں، بورن و مرد کے حقوق میں برابری کے نظریے پر تمام ہونے اشارہ کروں۔



یورپ میں سترہویں صدی کے بعد انسانی حقوق کے نام سے نغمہ سنجی شروع ہوئی، بسترہویں اٹھارویں صدی کے لکھنے والوں نے حیرت انگیز

اس مہم کا دوسرا بڑا نتیجہ، انگلستان کے خلاف امریکہ کی جنگ آزادی میں برآمد ہوا، شمالی امریکہ کے تیسرا استعماری علاقے، جہاں کے عوام نے سخت دباؤ اور شدید حملے کے بغاوت اور خود مختاری کا پرچم بلند کیا اور آخر میں اپنی آزادی حاصل کر لی۔

تیسرا امریکن فلاڈلفیا میں ایک کانفرنس ہوئی جہاں آزادی عام کے بارے میں ایک اعلان و منشور شایع کیا گیا، اس کے مقدمے میں لکھا تھا:

”تمام افرادِ بشرِ خلقت میں یکساں ہیں۔ اور خالق نے سب کو مستقل اور ناقابلِ تبدیل حقوق عطا فرمائے ہیں، جیسے زندگی کا حق اور آزادی کا حق حکومتوں کی تشکیل کی علت غائی (اور اصل) غرض مذکورہ حقوق کی حفاظت ہے۔ اور اس کا اقتدار قوم کی پسند پر موقوف ہو گا۔۔۔“

۱۷ ترجمہ تاریخ ہرمالہ ج ۴ ص ۲۶۶ - مصنف نے البرٹ مالٹ کی نوول ہسٹری یونیورسل

"ALBERT MALET'S NOVELLE HISTOIRE UNIVERSELLE"

THE UNANIMOUS DECLARATION OF THE

THIRTEEN UNITED STATES OF AMERICA"

جو جوہم جولائی ۱۷۷۶ء کو منظور ہوا۔

”منتور حقوق انسانی“ کے نام سے دنیا میں شہرت پانے والا اعلامیہ فرانس کے عظیم انقلاب کے بعد ”اعلان حقوق“ کے عنوان سے شائع ہونے والا ہی منشور ہے۔ اس اعلامیہ میں ایسے اصول کلیات ہیں جو فرانس کے آئین کے مقدمے میں لکھے گئے ہیں اور فرانس کے آئین کا ناقابل جدائی حصہ شمار ہوتے ہیں۔ یہ اعلامیہ ایک مقدمے اور سترو دفعات پر مشتمل ہے۔

”پہلی دفعہ ہے:

افراد بشر آزاد پیدا ہوئے ہیں اور زندگی بھر آزاد رہیں گے اور حقوق میں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ . . . ”

انیسویں صدی میں، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کے بارے میں حقوق بشر کے مسئلہ پر نئے افکار ابھرے جن کے نتیجے میں سوشلزم، اور محنت کش طبقے کی نفع میں قطعی شرکت اور سرمایہ دار کے ہاتھ سے مزدور کو حکومت منتقل کرنے کی بات سامنے آئی۔

یسویں صدی کی ابتدا میں انسانی حقوق کے بارے میں جتنی بھی گفتگو ہوئی ہے اس کا پس منظر۔ حکومتوں کے مقابلے میں قومی حقوق یا مزدور و محبت کش عوام اور حکمران و مالک ہیں۔

تیسویں صدی میں پہلی مرتبہ مردوں کے مقابلے میں "عورتوں کے حقوق" کا سوال

"DECLARATION OF THE RIGHTS OF MAN AND  
OF CITIZENS"

یہ مشرق فریسی قومیں اسمبلی نے ۱۷۸۹ء میں آئین کے مقدمہ کے طور پر منظور کیا، اور بعد میں تھامس پائس کے ذریعہ حقوق انسانی کے نام سے مشہور ہوا۔

ہذا، اگلی صدی میں قریب ترین ملک تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ملک بیسویں صدی کے اوائل میں "عورت و مرد کے مساوی حقوق" کا قائل ہوا ہے۔ یونائیٹڈ نیشنز آف امریکہ باوجودیکہ تھارہویں صدی میں اعلان آزادی کے ساتھ "عام انسانی حقوق" کا اعتراف کر چکا تھا، مگر سیاہی حقوق میں مرد و زن کی مساوات کا مسودہ سال ۱۹۴۵ء میں منظور کرتا ہے۔ فرانس نے بھی بیسویں صدی ہی میں یہ اصول مانا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ، بیسویں صدی میں پوری دنیا میں متعدد گروپ "عورت و مرد" کے حقوق و فرائض کے بارے میں ایک بڑی، وگہری تبدیلی کے حق میں اٹھ کھڑے تھے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ قوموں کے تعلقات حکومتوں سے محنت کشوں کے تعلقات مالکوں سے، مزدوروں کے تعلقات سرمایہ داروں سے اس وقت دگرگوں نہیں ہو سکتے جب تک مرد و زن کے حقوق و تعلقات میں اصلاحات رونما نہیں ہوتے، نہ اس کے بغیر معاش ترقی انصاف قائم ہو سکتا ہے۔

اسی لیے انسانی حقوق کا منشور ۱۹۴۸ء جنگ عظیم دوم کے بعد ادارہ اقوام متحدہ نے شایع کیا۔ اس کے مقدمے میں درج ہے:

"چونکہ اقوام متحدہ کے عوام نے انسانی حقوق، اور فرد انسانی کی قدر و قیمت اور حقوق مرد و عورت کی برابری کا ایک بار پھر اعلان کیا ہے۔۔۔۔۔"

انیسویں اور بیسویں صدی کا مشینی (صنعتی) انقلاب کاری گروں اور مزدوروں، خاص کر عورتوں کی غربت سے بڑا سبب بنی کہ موضوع حقوق خواتین پر توجہ دی جائے۔ تاریخ البسٹ مالت میں ہے:

ایک مدت تک حکومت نے مزدوروں کے مابین اور کارکنوں کے مسائل

سلسلہ بین اقوامی منشور حقوق انسانی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو منظور کیا۔

پر دھیاں نہیں دیا سرمایہ دار جو چاہتے تھے وہ کرتے رہے۔۔۔۔۔ کارخانہ دار عورتوں اور کم سن بچوں کو بڑی تھوڑی تھوڑی مزدوریوں پر رکھ لیتے تھے کہ کم کا وقت زیادہ ہونے سے اکثر لوگ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے اور جوانی میں مر جاتے تھے۔۔۔۔۔"

یورپ میں، انسانی حقوق کی تحریک کا یہ مختصر تاریخی جائزہ تھا، انسانی حقوق کے تمام منشوروں میں جو مطالب ہیں وہ اہل یورپ کے لیے نئے ہیں لیکن ہمیں علم ہے کہ اسلام میں چودہ صدی پہلے یہ بتایا جا چکا تھا، اور کچھ عرب اور ایرانی دانش وران اعلامیوں کے تقابلی مطالعے میں یہ بات کر چکے ہیں اور کتابوں میں لکھ چکے ہیں۔ ہاں، اعلامیے اور اسلام کے ضوابط میں کہیں کہیں اختلاف ہیں، اور یہ بحث بڑی خوش گوار و دل کش ہے۔ ان مسائل میں ایک مسئلہ "حقوق زن و مرد" کا مسئلہ ہے۔ اسلام مساوات کا قائل ہے اور مشابہت و یکسانیت اور اکائی کو "حقوق زن و مرد" میں تسلیم نہیں کرتا۔

**انسان کی حیثیت اور حقوق :** "چونکہ افراد خاندان بشری کے تمام افراد کی ذاتی حیثیت کی پہچان اور ان کے ناقابل تبدیل (و اتقالی) و یکساں حقوق، آزادی و عدالت اور صلح کی بنیاد مہیا کرتی ہے۔

چونکہ پہچان نہ ہونے اور حقوق بشری کے حقوق کی تحقیر و مشیہ نہ عمل پر تمام ہوتی ہے، جو روح بشریت کو کسرشی پر ابھارتی ہے۔ اور ایسی دنیا کا وجود جس میں تمام افراد بشر اپنے عقیدے کے نگہار میں آزاد ہوں، خوف اور غربت سے مطمئن ہوں انسانی زندگی بند ترین دنیا کا اعلان کیا جاتا ہے۔

چونکہ، اساسی طور پر حقوق انسانی کو، نفاذ قانون کے ذریعے حمایت کی جاتی ہے۔



تاکہ انسان جلم اور دباؤ کے خلاف آخری علاج کے لیے اٹھنے پر مجبور نہ ہو۔

چونکہ اس کی طور لازم سے قوموں میں باہمی دوستانہ تعلقات کو پھیلا یا جائے (لہذا اس بات کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔

چونکہ اقوام متحدہ کے عوام نے انسانی بنیادی حقوق اور فرد انسان کی قدر و منزلت اور عورت و مرد کے حقوق کی برابری کا پھر سے اعلان کیا ہے اور تختہ ارادہ کیا ہے کہ اجتماعی ترقی میں مدد کریں گے اور اچھے ماحول میں زندگی کی شکل صورت بہتر بنائیں گے۔

چونکہ.....

عام اجلاس اس اعلامیہ جہاں حقوق بشر کو تمام عوام اور تمام اقوام کی مشترک مناسبت کے طور پر اعلان کرتا ہے تاکہ تمام افراد اور معاشرے کے تمام ارکان اس اعلامیہ کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھیں اور پوری کوشش کریں کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے ان حقوق اور آزادیوں کے احترام کا دائرہ وسیع ہو اور قومی، بین الاقوامی اور انسانی تدریجی کوششوں سے ان اقدار کی پہچان اور ان کا واقعی اور زندہ نفاذ، خود ممبر قوموں اور ان کے ممالک میں رہنے والے عوام میں۔ وجود پذیر ہو۔“

مندرجہ بالا سنہری فقرے انسانی حقوق کے بین الاقوامی اور قومی دنیا کے لیے (اعلامیہ کے مقدمے میں درج ہیں، یہ وہی اعلامیہ ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ: ”سب سے بڑی کامیابی ہے جو آج کی تاریخ تک انسانی حقوق کی تائید میں عالم بشریت کو نصیب ہوئی ہے۔“

اس کا ہر جملہ سوچا سمجھا ہے۔ جیسا کہ سابقہ مقلے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ جملے صدیوں کے فلاسفہ اور آزادی طلب اور قانون دانانِ عالم کے افکار کی نمایندگی کرتے ہیں۔

منشور حقوق انسانی کے اہم نکات: اس سے قطع نظر کہ بعض دفعات

کچھ مطالب مکرر یا کم از کم بعض دفعات میں بیان شدہ مطالب دوسری جگہ کے بیان کردہ ہیں۔ سب سے بڑے نیاز کردہ ہیں۔ یا کچھ مطالب ایسے بھی ہیں جن کو الگ پیرا گراف میں ہونا چاہیے تھا۔

اس مقدمے کے چند اہم نکات ایسے ہیں جن پر توجہ کرنا ضروری ہے:

① حیثیت، احترام اور ناقابل انتقال ذاتی حقوق میں انسان ایک ہی نوع سے بہرہ مند ہے۔

② انسان کی حیثیت، احترام اور ذاتی حقوق، کلی اور عمومی ہیں جو تمام انسانی افراد کو اغوش میں لیتے ہیں۔ ان میں تفریق نہیں ہے۔ سفید و سیاہ، بلند اور پستہ، قد و وزن، مرد و سب ان میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ جیسے خاندان کے تمام ممبروں میں سے کسی ایک کو اپنے نسب میں دوسروں پر فوقیت اور اعزاز و نجابت جتانے کا حق نہیں، اسی طرح تمام افراد بشر ایک بڑے خاندان کے ممبر اور ایک جسم کے اجزاء ہیں، شرافت و عزاز میں برابر ہیں۔ کوئی شخص اپنے تئیں دوسرے فرد سے زیادہ معزز سمجھنے کا حق نہیں رکھتا۔

③ آزادی و صلح و عدالت کی اساس یہ ہے کہ تمام افراد دل کی گہرائیوں سے تمام انسانوں کی حیثیت اور ذاتی احترام کی واقعیت پر ایمان رکھیں اور اعتراف کریں۔ یہ اعلامیہ کہنا چاہتا ہے:

”تمام افراد بشر جو ایک دوسرے کے خلاف بے چنیاں پھیلاتے ہیں۔ ان کا حشر و بدرفتاری کیا ہے، لڑائیوں کا پھیلنا، ظلم اور دست درازیوں کا ہونا، اور ایک دوسرے کے مختلف مشیائے کارگزاریوں کا مرکزی نقطہ انسان کے ذاتی احترام و اس کی حیثیت سے ناآشنائی ہے۔ چند افراد کی یہ ناآشنائی (ذات و قیفت) اپنے حریف کو شہسی اور نافرمانی پر ابھارتی ہے اسی سبب صلح و امن کی راہ خطرے میں پڑ جاتی ہے۔“

④۔ سب کو مل کر جس بلند ترین آرزو کے حصول کی جدوجہد کرنا چاہیے، وہ ایک ایسی دنیا کی تخلیق ہے، جس میں عقیدہ و امن اور مادی خوش حالی مکمل طور پر موجود ہو گمٹیں، خوف اور افلاس کی جڑیں اکھڑی ہوئی ہوں، اس تنا کو رو براہ لانے کے لیے اعلیٰ کے جس درجات مرتب کیے گئے ہیں۔

⑤ انسان کی ذاتی حیثیت پر یقین اور ناقابل سلب و انتقال حقوق کا احترام تعلیم و تربیت کے ذریعے تمام انسانوں میں پیدا کیا جائے۔

**مقام و احترام انسان :** حقوق انسانی کا منشور چونکہ احترام انسانیت و آزادی و مساوات کی بنیاد پر مرتب اور انسانی حقوق کا

جیسا کہ خاطر وجود پذیر ہوا ہے، اس لیے ہر صاحب وجدان (واحساس) انسان کے لیے احترام و عزت کے لائق ہے۔ ہم مشرق کے باشندے مدلول سے انسان کی قدر و احترام کا دم بھر رہے ہیں جیسا کہ سابقہ مقالے میں کہہ چکا ہوں، دین مقدس اسلام میں انسان کے حقوق انسان، آزادی اور باہمی برابری کی بری قیمت اور احترام ہے۔ اس منشور کے لکھنے والے اور وہ فلسفی حضرات جو حقیقی طور پر اس فکر کے خالق اور لکھنے والے بن گئے ہیں۔ ہمارے احترام و تعظیم کے لائق ہیں لیکن چونکہ یہ متن ایک فلسفیانہ اعلان ہے، فرشتے نہیں، انسانوں کے ہاتھوں سے لکھا گیا ہے۔ انسانی افراد نے استنباط و حاصل نکرنا پیش کیا ہے، لہذا ہر فلسفی کو حق ہے وہ اس کا تجزیہ و تحلیل کرے اور اگر اتفاقاً کہیں کمزوری نظر آئے تو اس کی یاد دہانی کرائے۔

یہ اعلامیہ منشور کمزور مقامات سے خالی نہیں، مگر ہم اس مقالے میں کمزور نکات کے بجائے نقطہ قوت پر انگلی رکھیں گے۔

اس منشور کا سارا زور انسان کے ذاتی مقام پر ہے، شرافت اور انسان کی

ذاتی حیثیت اس اعلامیہ کے نقطہ نظر سے انسان ایک نوع ہونے کے ناتے خصوصی کر و شرافت اور حقوق اور آزادیوں کے ایک سلسلے کا براہ راست مالک ہے جبکہ دوسرے جاندار اس ذاتی حیثیت و شرافت و کرامت نہ رکھنے کی وجہ سے ان حقوق اور آزادیوں سے بہرہ ور نہیں ہیں۔ اس اعلامیہ کا نقطہ قوت یہی ہے۔

**مغربی فلسفوں میں انسان کا منزل اور گراؤٹ :**

اب یہاں پھر ایک مرحلہ آگیا ہے کہ ہم دوبارہ اسی پرانے فلسفی مسئلے پر توجہ مبذول کریں :

انسانی قدر و قیمت کی دریافت، پوری مخلوقات کے مقابلے میں انسان کی شرافت و مقام، انسان کی قابل احترام شخصیت، آئیے پوچھیں :

انسان کی وہ ذاتی حیثیت کیا ہے جس کی بنیاد پر وہ ان حقوق کا مالک بن گیا اور گھوڑے، گائے اور بکری اور کبوتر سے ممتاز ہو گیا ؟  
یہاں منشور حقوق انسانی اور مغربی فلسفے میں انسانی قیمت کی دریافت کے درمیان سامی تناقض (ایک دوسرے کی مخالفت) کھل کر سامنے آتی ہے۔  
مغربی فلسفے میں برسوں سے انسان اپنی قیمت و اعتبار کو چکاتے، بدستہ باتو ہیں انسان، اور اس کے مرتبہ بلند کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اس کی جڑیں سر زمین مشرق میں تھیں۔ آج یہ باتیں مغرب کے اکثر فلسفہ نظاموں میں مذاق اور توہین کی نظر سے دیکھی جا رہی ہیں۔

یہ یورپین کی نظر میں انسان ہشیش کی حد تک پستی میں آگیا ہے، اس کی عظمت و مقام انکار میں واقع ہو چکی ہے۔ کسی غلبہ غالی، مقصد شوق و جمیوت کے عین مقصود کا عقیدہ رجعت پسندی سمجھا جاتا ہے۔

مغرب میں انسان کے اشرف المخلوقات کے نام کا دم نہیں بھر سکتے کیونکہ یوڈ



کے عقیدے میں، انسان کا اشرف مخلوقات ہونا، تمام مخلوقات کا انسان کا فلسفی ہونا، ساری دنیا کا مسخر انسان ہونا، بطلیموس کے اس پرانے فلسفے کی بات ہے جو غلط ہو چکا، زمین و آسمان کی ہیئت، آسمان کی مرکزیت اور آسمانی کروں کا زمین کے گرد گھومنا سب باطل ہو چکا تو اب انسان کے اشرف مخلوقات ہونے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ یورپ کی نظر میں یہ انسان کی خود پسندی تھی جو اس دور میں انسان کے دماغ میں سما کی ہوئی تھی۔ آج کا انسان عاجزی اور انکساری اختیار کر چکا ہے، دوسرے موجودات کی طرح وہ اپنے وجود کو ایک مٹھی بھر خاک سے زیادہ نہیں جانتا۔ خاک سے نکلا، خاک میں مل کر ختم ہو جائے گا۔

یورپ کا انسان "عاجزاتہ" طور پر، روح کو وجود انسانی کا مستقل پہلو نہیں مانتا وہ اپنے وجود اور گھاس پھوس اور حیوان میں اس بہت سے فرق کا قائل نہیں ہے۔ یورپ کا انسان، فکر و عمل، روح اور پتھر کے کوئلے کی گرمی میں ماہیت و جوہر اعتبار سے فرق نہیں کرتا، وہ سب کچھ مادے اور انرژمی کا کرشمہ جانتا ہے۔ یورپ کا انسان کی رائے میں، زندگی کا میدان تمام جاندار مخلوق کے لیے جن میں وہ خود بھی ہے۔ خونی میدان ہے، جسے زندگی نے ختم نہ ہونے والی جنگ سے وجود بخشا ہے۔ تمام جان رکھنے والی مخلوق پر ایک اصل و کلیہ حکمراں ہے اور وہ اصل تنازع للبقا ہے۔ انسان مسلسل کوشش کر رہا ہے کہ اس جنگ سے خود کو بچائے، عدالت، نیکی، تعاون، اور خیر خواہی جیسے بہت سے اخلاقی اور انسانی مفہوم اسی "بنیادی اصل" تنازع للبقا کے پیدا کردہ ہیں۔ انسان نے ان مفہوم کو اپنی جگہ پہچاننے کے لیے خود وضع کیا ہے۔

کچھ طاقت ور مغربی فلسفیوں کی رائے میں انسان مشیتی ہے جسے صرف اقتصادی منافع چلاتے ہیں، دین و اخلاق، فلسفہ و علم و ادبیات و ہنر سب کچھ اوپر کی لپا پوتی ہے۔ اس کے نیچے مداوار، تقیم، دولت کا صیر پھیر ہے۔ یہ تمام جلوے اور

ان کی کے مظاہرے، انسانی زندگی کے اقتصادی پہلو ہیں۔

نہیں جناب، انسان کے لیے یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ اصل محرک اور ترمیم حرکات اور عمل کی گردش کا بنیادی عامل تو جنسی خواہش ہے۔ خلاق و فلسفہ، مہم و دین و ہنر سب لطیف جمیال اور مظاہرے ہیں، انسان کے وجود کا عامل تو جنسی احساس ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔

اگر طے ہے کہ مخلوقات کو بے مقصد مانیں، اور طبیعت اندھوں کی طرح عمل کر رہی ہے، یہی عقیدہ بنالیں۔

اگر انوار عبادت مخلوق کی زندگی کی ضمانت کا قانون صرف تنازع للبقا ہے، بہتر سے بہتر کا نتیجہ ہے۔ باقی سب تبدیلیاں مکمل طور پر اتفاقی ہیں، انسان کی بقا اور موجودیت اتفاقی و بے مقصد تبدیلیوں کے سبب ہے، کئی مہینے برسوں سے اس کے اجداد نے دوسری انواع مخلوق پر تجربوں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور اب تک وہ سلسلہ موجودہ صورت میں چل رہا ہے۔ یہی فلسفہ صحیح ہے؟

اگر یہ مان ضروری ہے کہ انسان ان مشینوں کا نمونہ ہے جو اب وہ خود اپنے تھول بنا رہا ہے۔

گزشتہ ہی مان لیا گیا ہے کہ روح کا یقین، اصالت اور اس کی بقا کا عقیدہ خود خواہی و خود پسندی و اپنے بارے میں غیر معمولی مبالغہ ہے۔

سے فلسفہ جنسیت کی حرف اشارہ ہے، فرانز آرٹ کی سب میں متنی بچے کے دودھ پینے کے بعد بچے تک وہ ہر مرحلے میں جنسیت ہی محسوس کرتا ہے اور اس کے بعد دوسرے صنفی محبت و تعلق جدید مفکروں کے مسلمات اور یورپ کی فکری نظام کی موجودہ مذہبی کرنے وے ہیں۔

اثرات ہو چکا ہے کہ۔ انسان میں اصلی محرک اقتصادی یا نفسی یا بالادستی کا جذبہ

ہے۔ اگر بنیادی بات یہی ہے کہ نیک و بد، اچھائی اور برائی مجموعی طور پر اضافی ہیں اور فطرت و وجدان کی آواز مہمل خیال ہے۔

اگر انسان جنس کے لحاظ سے نہوت اور خواہشات نفسانی کا غلام ہے اور قوت کے علاوہ کسی کے سامنے سر نہیں جھکتا۔

اگر....

اس کے بعد انسان کی حیثیت اور شرافت اور ناقابل سلب حقوق۔ اور انسان کی قابل احترام شخصیت کا دم بھرنے اور اس کو تمام اقدامات کا نصب العین و مقصد بنانا کیسے ممکن ہے!

**مغرب انسان کے بارے میں**  
**تصادف و تناقض سے دوچار ہے۔**

تک پست کیا۔ ایک طرف تو مغرب کا فلسفہ تخلیق انسان اور اس کے وجود کی علت غرض کے زاویے سے۔ اس کی تخلیق میں کاغذ و خالق کے عمل کے زاویے سے۔ اس کے ڈھانچے اور اس کے وجود کے تانے بانے اور جہتی کے زاویے سے۔ اس کے محرکات عمل کے نقطہ نظر سے۔ اس کے وجدان و ضمیر کے لحاظ اس حد تک نیچے گریا جہاں کچھ تذکرہ ہم نے کیا۔

اس کے بعد ایک قدامت اور اعلان شائع کیا جس میں انسان کی قیمت اس کا مقام حیثیت اور کرامت و ذاتی شرافت اور مقدس حقوق، ناقابل تبدیلی اور ناقابل سلب اختیار کا ڈھول بجا گیا۔ اس فرمان میں تمام افراد بشر کو دعوت دی گئی کہ اس منشور پر ایمان

مغرب پر غرض تھا، پہلے وہ انسان کی جو تشریح کر چکا ہے اس پر نظر ثانی کرے اس کے بعد بلند بنا، علامیہ حقوق مقدس فطری انسان صادر کرے۔

یہ یہ مانتا ہوں، سب مغربی فلسفی انسان کی وہی تشریح نہیں کرتے جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ بہت سے حضرات، کم و بیش انسان کی وہ تعبیر بھی کرتے ہیں جو مشرق وں کرتے ہیں۔ مگر میری نظر اس انداز فکر پر ہے جس نے مغرب کی اکثریت کو متاثر کیا ہے و جس نے دنیا بھر کے عوام متاثر ہو رہے ہیں۔

انسانی حقوق کا منشور اسے صادر کرنا چاہیے جو انسان کو ایک مادی مرکبات سے تیار شدہ مشین سے بلند تر درجے پر فائز جانتا ہو۔ جو انسان کے محرکات اور ارادوں کو بیرونی و نفسی رجحانات کا مجموعہ نہ مانتا ہو۔ جو انسان کے لیے انسانی وجدان کا قائل ہو۔ علامیہ بشر مشرق کو صادر کرنا چاہیے جو قانونی۔ اپنی جہاں "قانونی لاف" خلیفہ میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔ پر ایمان رکھتا ہو۔ اور انسان میں خدائی جہاں سے دعوت ملتا ہو۔

حقوق انسانی کا لغو نہ لگانا چاہیے جو انسان کے سیر و سفر کے لیے ایک منزل کا قائل ہو ورنہ مانتا ہو کہ انسان اس منزل کے لیے راستے کی مشقیں جھیلتا ہے؛ یا ایستھا انسان اقل کا دُشمن الی ربک کدحاً فملا قیدہ۔ انسان کو اپنے رب کی حضوری کے لیے کوشش کر رہا ہے تو ایک انسان کے سامنے حاضر ہو گا۔

انسانی حقوق کا منشور شائع کرنے کا حق اس نظام فلسفہ کو حاصل ہے جو قانونی و نفسی و جہاں سے دعوت ملتا ہو۔ اس کا دُشمن الی ربک کدحاً فملا قیدہ۔ انسان کو اپنے رب کی حضوری کے لیے کوشش کر رہا ہے تو ایک انسان کے سامنے حاضر ہو گا۔



اسے ہموار بنایا، پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری اسے سمجھائی۔ (قرآن) جو انسان میں بھلائی کے ججانات مانتا ہو۔

انسانی حقوق کا منشور جاری کرنے کا اسے حق ہے، جو انسانی سرشت کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہو، اور اس کی سرشت کو معتدل ترین و کامل ترین سمجھتا ہو کہ۔ "لقد خلقنا الانسان في احسن تقویم" یہی معاہدہ کرتا ہے۔ یعنی۔ ہم نے انسان کو بہترین انداز سے پر بنایا ہے۔

مغربی تہذیب کے شہاں شان بات منشور حقوق انسانی نہیں ہے کہ وہ انسان کی تہذیب کی گتے ہی نہیں۔ ان کو تو وہی طریقے جاری کرنا چاہیے جسے مغرب علیٰ غلبہ پر انسان کے لیے جائز سمجھتا ہے۔ یعنی انسانی احساسات کا قتل عام، سرمایہ داری کی بے پناہ قوت، انسان پر دولت کی برتری، مشین کو مبعود سمجھنا ثروت کی خدائی، انسان سے میگے۔ حالت یہ ہے کہ اگر اتفاقاً ایک ملبونراپی کروڑوں کی جائداد اپنے بعد اپنے گتے کے نام لکھ جائے تو اس گتے کا اعزاز آدمی زاد سے بڑھ جاتا ہے، دولت مند گتے کے لیے نامعلوم گتے آدمی پیشکار و نوکر کی طرح حاضر رہتے ہیں۔ منشی، سپرنٹنڈنٹ نوکر رکھے جاتے ہیں اور دست بستہ لوگ اس کے سامنے حاضر رہتے اور تعظیم کرتے ہیں۔

**مغرب نے خود کو بھی بھلا دیا اور خدا کو بھی** | انسانی معاشرے کا ایک اہم مسئلہ

یہ ہے کہ انسان نے بتعبیر قرآن "خود" کو بھی بھلا دیا ہے اور خدا کو بھی، بری بات یہ ہے کہ "خود" کی توہین کی سبب "دین" اور "ضمیر و باطن" سے توجہ ہٹالی، حسی اور مادی دنیا میں اپنی نظر کو محدود

دیا، مادیات کا مزہ چکھنے کے علاوہ کوئی مقصد نہ دیکھتا ہے نہ سوچتا ہے، خلقت کو بے مقصد سمجھتا ہے، خود اپنا انکار کرتا ہے، اپنی روح یا تھ سے دے بیٹھتا ہے۔ آج کے انسان کی اکثر بے بسیوں کا سرچشمہ یہی انداز فکر ہے۔ افسوس کہ یہ سوچ دینا چھائی ماری ہے۔ انسان کے بارے میں اس انداز فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمدن جس قدر پھیلتا اور غیظہ تر ہوتا جاتا ہے تمدن اسی قدر حقارت میں گرتا جا رہا ہے انسان کے بارے میں یہ طرز فکر موجب ہوا کہ واقعی انسان ہمیشہ ماضی میں تلاش کیا جائے اور آج کے تمدن کے بارے کا رخانے کی دست رس میں ہے کہ ہر اعلیٰ درجے کی چیز تیار کر دے، بس انسان نہیں بنا سکتی۔

گاندھی جی کہتے ہیں:

یورپ والے زمین کی خدائی کا لقب حاصل کرنے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے زمین کی تمام نعمتیں اور ان کے امکانات قبضے میں کر لیے اور ان کے ملک بن بیٹھے، دوسری قومیں اسے خدا کی قدرت سمجھتی تھیں، لیکن اہل یورپ ایک چیز سے عاجز رہے، اور وہ اپنے اندر داخل کرنا ہے، جو سونے سے تمدن کی جھلک چمک کو مہل سمجھنے کے لیے تھی مگر دلیل کافی ہے۔

مغربی تمدن نے اہل مغرب کو شراب نوشی اور جنسی عمل پر سب سے تو اس کا سبب "خود تلاش" کو بھلا دیا، اور ضایع کر دیا ہے۔

... اس کی عمل قوت نے اسے کشف، یجی و اور و سبب خلگی... اس پر اس لیے اچھا کہ وہ "اپنے آپ" سے فراری ہے، اسے غیر معمولی تسلط اپنے اوپر باقی نہیں رہا... تنہائی اور خاموشی سے خوف، دولت سے وابستگی نے مغربی انسان کو اندر کی مدد سے معذور بنا دیا، اس کی مسلسل عمل و کارروائی کا ایک محرک یہی ہے۔

دنیا فتح کرنے کی ہوس کا باعث ہے "اپنے اوپر حکومت" نہ کر سکنے کی ناتوانی ہے۔ اسی بنا پر مغرب کا انسان پوری دنیا میں بحران و فساد پھیلا رہا ہے..... آدمی جب اپنی روح کھودے تو عالم کی فتح اس کے کس مرض کی دوا ہو گی..... جن لوگوں کو انجیل نے تعلیم دی کہ وہ حقیقت، محبت اور صلح کے مبشر بنیں وہ لوگ سونے اور غلاموں کی جستجو میں سرگردان ہیں۔ خداوند کی بادشاہی میں انجیل کی تعلیم کے مطابق بخشش و عطا کی جستجو کرنے کے بجائے اپنے گناہوں اور اپنی برائیوں سے بھائی کے لیے مذہب کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ کلام الہی شایع کرنے کے بجائے قوموں کے سروں پر ہم برساتے ہیں.....

اسی سبب انسانی حقوق کا منشور دوسروں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر خود اہل یورپ نے ٹھکرایا جو فلسفہ اہل مغرب نے عملی زندگی میں اپنا رکھا ہے اس کے بعد خود اہل مغرب کے لیے سوئے منشور حقوق انسانی، غلط قرار دینے کے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔

## چھٹا حصہ

# عالمی حقوق کی فطری بنیادیں

- کتاب خفت انسان کے اصلی حقوق پہنچوانے کی تمہا سندی کتاب حوالہ؟
- "مدنی" معاشرے میں باہمی قرار داد کا پہلو اور عالمی معاشرے میں فطری پہلو کا غلبہ ہوتا ہے۔
- عالمی حقوق میں چار زمانوں کا مفروضہ، سوشلزم کے مفروضہ مالکیت کی تقلید سے پیدا ہوا ہے۔
- کیا میاں بیوی دو حقوقی فطریں رکھتے ہیں؟

(خاصہ مطالب از مؤلف)



# عالمی حقوق کی فطری بنیادیں

(۱)

انسانی حقوق کا منشور اس بنیاد اور روح پر قائم ہے کہ انسان ایک نوع کی حیثیت اور ذاتی شخصیت کی بنا پر قابل احترام ہے، اور عین خلقت و آفرینش میں، حقوق اور آزادیوں کا ایک سلسلہ اسے عطا کیا گیا ہے جنہیں اس سے نہ چھینا جاسکتا ہے نہ بدلا جاسکتا ہے۔ ہم اس پر گفتگو کر چکے۔

یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اس روح و اساس کو اسلام کی تائید حاصل ہے، اور مشرقی فلسفے بھی اس کے حق میں ہیں۔ اس منشور کی روح و اساس سے جو بات جوڑ نہیں کھائی اور اسے بے بنیاد ظاہر کرتی ہے، وہ مغربی فلسفوں کی وہ بہت سی تشریحات ہیں جو انسان اور اس کی ہستی کے تانے بانے کے بارے میں کی جاتی ہیں۔

یہ بات دلیل کی محتاج نہیں کہ انسانی حقوق پہچاننے کے لیے فقط ایک کتاب ایسی ہے جو حوالہ بننے کی پوری گنجائش رکھتی ہے، اور وہ ہے آفرینش کی بیش بہا کتاب، اس عظیم کتاب کے صفحے صفحے اور سطر سطر میں انسانوں کے اصلی حقوق تحریر اور زن و مرد کے ایک دوسرے کے مقابلے میں حقوق کے مد و مال پہچانے جاسکتے ہیں۔

تعب ہے۔ بعض سادہ دل، کسی طرح تیار نہیں کہ اس عظیم کتاب حوالہ کو سندی درجہ دیں۔ ان لوگوں کے نزدیک حوالے کی تنہا صلاحیت و سندیت ان لوگوں کو حاصل ہے جنہوں نے "منشور" کی تیاری میں حصہ لیا اور آج سارے جہاں

کی قیادت و حکومت کے مدعی ہیں۔ چاہے، وہ خود اس اعلامیے کے رفعات کی پابندی نہ کریں۔ دوسروں کو بہر حال یہ حق نہیں ہے کہ ان کی بات میں چون و چرا کریں۔ لیکن ہم نہیں "حقوق انسانی" کے حوالے سے چون و چرا کا حق رکھتے ہیں اور تخلیق کے عظیم کائنات کو اللہ کی بولتی کتاب جانتے اور اسی کو اکیلا اندری حوالہ ملتے ہیں۔

محترم قارئین!

مفردت خواہ ہوں، مقالات کے سلسلے میں کچھ مسائل ایسے آگے جن میں فلسفہ کا رنگ اور ذرا خشکی محسوس ہوتی ہوگی، ممکن ہے بعض حضرات اس سے ٹھکن بھی محسوس کرتے ہوں، میں حتی الامکان ایسے مسائل سے پہلو بچاتا ہوں لیکن مسائل حقوق ختم کے ذیل میں کچھ فلسفیانہ بحثوں کا آنا ضروری اور ان سے بچنا ممکن نہیں تھا۔

**طبعی حقوق اور طبیعت کی مقصدیت میں ربط**

ہمارے نزدیک طبعی و فطری حقوق وہاں سے پیدا ہوتے ہیں، جہاں، قوت تخلیق نے اپنی روشن نگاہی اور مقصدیت کے پیش نظر موجودات کو ان کمالات کی طرف رواں کیا ہے جن کی صلاحیت ان کے وجود میں ودیعت فرمائی ہے۔

ہر فطری صلاحیت ایک "طبعی حق" کی بنیاد ہے اور اسے ایک "طبعی سند" کہیں ہے۔ مثلاً انسان کا بچہ، پڑھنے اور سکول جانے کا حق رکھتا ہے، بکری کے بچے کو دوسرے جانور سے کھانا نہیں کیوں؟

انسان کے فرزند میں سبق پڑھنے اور دانشور بننے کی صلاحیت ہے اور بچہ کو فرزند ہے، لیکن بکری کے بچے میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔

قوت تخلیق نے وجود انسان میں اس مطالبے کی دستاویز رکھی ہے اور وجود انسانی کی دستاویز نہیں رکھی۔

سوچنے، دوٹ دینے، آزاد ارادہ رکھنے کا حق بھی اسی طرح ہے۔

کچھ لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ فطری حقوق، کا مفروضہ اور یہ کیفیت و پیدائش نے انسان کو ایک قسم کے حقوق سے خصوصیت دی ہے۔ گھٹیا دعویٰ اور خود پسندی کی بات ہے۔ اس مفروضہ کو دور کر دینا چاہیے۔ انسان وغیرہ انسان میں حقوق کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

نہیں، بات یوں ہی نہیں۔ فطری صلاحیتوں میں اختلاف ہے۔ قوتِ خلاقہ، اخلاق، اکبر، نے انواع و موجودات میں ہر قسم کو ایک دائرہ حرکت دیا ہے اس کو اسی قسم کی سعادت عطا کی ہے وہ موجود اپنے مدار میں حرکت کرتا ہے۔ قوتِ تخلیق نے بھی ایک غرض معین کی ہے۔ یہ دستاویزی اتفاق اور بے خبری کے عالم میں ان موجودات کے ہاتھ میں نہیں دی گئیں۔

**معاشرتی حقوق** تمام افراد انسانی خاندانی (عائلی)، حقوق کے علاوہ اجتماعی (معاشرتی)، حقوق کے مالک ہیں انسان

خاندان کے دائرے سے نکل کر ایک بڑے معاشرے میں، ایک دوسرے کے مقابلے میں کچھ حقوق پیدا کرتے ہیں۔ یہ حقوق مساوات کی بنیاد اور مشابہ صورتِ حال کی وجہ سے مساوی حقوق بھی رکھتے ہیں اور مشابہ حقوق بھی رکھتے ہیں۔ یعنی ان کے ابتدائی فطری حقوق، ایک دوسرے کے برابر اور ایک دوسرے کے مانند ہیں؛ سب کو ایک جیسا حق ہے۔ کائنات کے انعامات سے فائدہ اٹھائیں۔ سب کو مماثل حق حاصل ہے۔ کام کریں۔ سب کو مماثل حق ہے زندگی کے میدان میں ہونے والی دوڑ میں شری کریں اور لگے بڑھیں سب کو برابر کا حق ہے کہ سماجی منصبوں میں سے جس منصب کے لیے چاہیں پناہ نام پیش کریں، پھر اسے حاصل کرنے کے واسطے جائز طریقے استعمال کریں۔ سب کو برابر کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی علمی و عملی صلاحیتوں کو ظاہر کریں۔

ہاں، یہی ابتدائی فطری حقوق کی مساوات آہستہ آہستہ کتابی اور عملی زندگی میں غیر مساوی حقوق کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے۔ یعنی سب کو برابر کا حق ہے، مگر یہ زندگی کی دوڑ میں مقابلہ کریں، مگر جیسے ہی اس مقابلے میں ذمہ داری ادا کرنے اور مقابلے میں حصہ لینے کا مرحلہ آتا ہے، پھر مقابلے میں سب دریلے ایک صرح نہیں نکلتے کچھ لوگوں کی صلاحیتیں زیادہ ہیں کچھ کی کم ہیں۔ بعض زیادہ کام کرنے والے ہیں، کچھ کم بعض زیادہ علم رکھنے والے ہیں، زیادہ باکمال ہیں، بڑے ہنرمند ہیں، زیادہ کارآمد ہیں زیادہ لائق ہیں۔ تہری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے حاصل کردہ حقوق غیر مساوی ہوں گے اور ان کے حاصل کردہ حقوق کو ابتدائی فطری حقوق کی طرح مساوی حقوق کی صنف میں شری کریں تو ہمارا یہ عمل ظلم و ستم کے علاوہ کچھ نہ ہوگا!

کیا معاشرتی اور ابتدائی فطری حقوق کے لحاظ سے تمام افراد کی حیثیت مساوی و مشابہ ہے؟

انسانی حالات کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ افراد بشر میں کوئی بھی حاکم یا محکوم، افسر یا ماتحت، سپاہی یا وزیر نہیں پیدا ہوا، یہ خصوصیات کتابی حقوق ہیں اور افراد کو قابضیت و صلاحیت و کارکردگی کے ذریعے معاشرے سے اپنا یہ حق لینا چاہیے۔ معاشرہ بھی ایک طے شدہ قرارداد کے ذریعے یہ حق دیتا ہے۔

انسان اور حیوان کی معاشرتی زندگی میں یہی فرق ہے جیسے ہمد کی مکھی، اس کے مکھی کے حیوانات کی زندگی کا ڈھانچہ فی صد فطری ہے ان کے منصب اور ان کے کام نصرت سے تقسیم دیے ہیں خود انھیں کوئی اختیار نہیں۔ فطری طور پر ان میں کوئی عدم مساوات نہیں۔ دن کا کام کرے کوئی انجینئر، کوئی پہرے دار بید ہو ہے۔ انسانی معاشرہ میں عروج کا نہیں ہے۔

اسی وجہ سے بعض دانشوروں نے، قدیم فلاسفہ کے نظریے کو رد کر دیا ہے



”انسان فطرًا معاشرتی مخلوق ہے۔“ یہ دانش ور کہتے ہیں کہ نہیں، انسانی معاشرہ سو  
 عے شدہ اصولوں کا پابند ہے۔

**عائلی حقوق:** یہ غیر خانوادگی و عائلی (گھریلو) معاشرے کی بات تھی۔ گھریلو معاشرہ  
 کیسے؟ کیا افراد، گھریلو معاشرے میں ابتدائی فطری حقوق میں  
 مشابہت و یکسانیت رکھتے ہیں وراثتی حقوق میں فرق ہے؟ یا، گھریلو معاشرہ یعنی  
 وہ معاشرہ جس میں میاں بیوی، ماں باپ، اولاد اور بہن بھائی ہوں۔ غیر خاندانی  
 معاشرے ابتدائی حقوق میں فرق رکھتا ہے اور فطرت کے قانون نے خاندانی  
 حقوق کو خاص شکل و صورت میں وضع کیا ہے۔

یہاں دو مفروضے موجود ہیں:

پہلا مفروضہ: میاں بیوی، باپ بیٹا، ماں اور اولاد ہونا دوسرے معاشرتی  
 اور امداد یا بھی جیسے تعلقات کی طرح قومی یا سرکاری اداروں میں اس کا سبب نہیں کہ  
 چند افراد فطری طور پر خاص صورت و حالت حاصل کریں مثلاً ایک افسر بن جائے دوسرا  
 ماتحت، ایک حکمران ہو دوسرا محکوم، ایک زیادہ خواہ لے دوسرا کم۔ بیوی یا شوہر  
 باپ یا ماں اور اولاد ہونا بھی اس کا سبب نہیں کہ اس بنیاد پر وہ خاص پوزیشن حاصل  
 کرے۔ فقط کارکردگی کی بنیاد ہی پر ایک شخص کا منصب معین ہو سکتا ہے۔

”عائلی حقوق میں عورت مرد کے حقوق کی مشابہت“ کا مفروضہ۔ جسے غلطی سے  
 ”مساوی حقوق“ کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی فرض کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس مفروضہ کا  
 مطلب یہ ہے کہ زن و مرد (میاں بیوی) کی صلاحیتیں اور ضرورتیں مشابہ ہیں اور مشابہ  
 حقوق کی دستاویزیں فطرت کی طرف سے انھیں مل چکی ہیں اور یوں، خاندانی زندگی  
 میں وہ شریک ہیں لہذا عائلی حقوق، یکسانیت، مماثلت اور مشابہت کی بنیاد پر مرتب  
 ہوں۔

دوسرا مفروضہ: نہیں، ان کے ابتدائی طبیعی فطری حقوق بھی الگ الگ ہیں۔  
 شوہر، شوہر بننے کی بنیاد پر خاص فرائض و حقوق ثابت کرتا ہے اور بیوی ہونا، بیوی بننے  
 کے خاص ذمہ داریوں اور حق ثابت کرتی ہے۔ اسی طرح باپ یا ماں اور اولاد ہونے  
 کے سبب بہن بھائی خاندانی معاشرہ دوسری کمپنیوں اور امداد یا بھی کے اداروں سے  
 جدا ہے۔ ”عورت و مرد کے عائلی حقوق میں مشابہت نہیں“ کا مفروضہ۔ جسے اسد  
 نے منظور کیا ہے۔ اسی کلیہ پر مبنی ہے۔

ان دونوں مفروضوں میں کون سا مفروضہ صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے کی  
 سورت کیسے ہے۔ اس کو سمجھنا ہے۔

# عالمی حقوق کی فطری بنیادیں

(۲)

محترم مطالعہ کرنے والے اچھی طرح نتائج دریافت کر سکیں، اس لیے گزشتہ پیراگراف میں جو حقائق عرض کیے ہیں ان کا خلاصہ دیکھتے چلیں:

۱۔ فطری حقوق اس لیے پیدا ہوئے کہ فطرت کا ایک مقصد ہے، اس مقصد کی خاطر موجودات کے اندر صلاحیتیں اور استحقاق ودیعت ہوئے۔

۲۔ انسان، انسان ہونے کے زاویے سے خاص حقوق اور ان کے سلسلے کا مالک ہے جسے 'انسانی حقوق' کا نام دیا گیا ہے۔ حیوانات اس قسم کے حقوق سے بہرہ ور نہیں ہیں۔

۳۔ فطری حقوق کا تعین اور ان کی پہچان اور کیفیت سمجھنے کے خلقت و تخلیق و پیدائش کا مطالعہ کرنا چاہیے، ہر فطری صلاحیت ایک فطری حق کے لیے ایک فطری دستاویز ہے۔

۴۔ انسانی افراد تمدنی اور بڑے معاشرے میں فطری حقوق میں مساوی و مشابہ حقوق رکھتے ہیں، البتہ کارکردگی کی بنیاد پر ان میں فرق ہوتا ہے۔ اس کا تعلق کام اور ذمہ داری انجام دینے سے ہے۔ نیز فرائض کی انجام دہی میں متبادلہ دیکھا جاتا ہے۔

۵۔ چونکہ تمام انسان انفرادی طور پر شہری سماج میں، مساوی اور مشابہ فطری حقوق کے مالک ہیں۔ انسانی فطرت کے مطالعے سے ثابت ہو چکا ہے کہ افراد

نہ دو سکے معاشرت پسند جانداروں کے۔ جیسے شہد کی مکھی۔ بخلاف فطرت کی طرف سے حاکم و محکوم، فرماں روا اور فرماں بردار، مزدور یا کارخانہ دار، جنرل سپاہی یا دریا میں نہیں آیا۔ کالم اور منصب اور ذمہ داریاں فطرت نے تقسیم نہیں کی ہیں۔

۶۔ خاندانی حقوق میں عورت و مرد کے حقوق کی مشابہت کا مفروضہ اس بات پر قائم ہے کہ خاندانی و عائلی معاشرے کا معاملہ، شہری معاشرے کے معاملے سے جلد ہٹاؤن و مرد، اپنی صلاحیتوں اور ملتی جلتی ضرورتوں کے ساتھ خاندانی زندگی میں شرکت نہیں کرتے۔ دونوں کے پاس فطرت کی طرف سے عطا کردہ ملتی جلتی دستاویزیں نہیں ہیں۔ قانون تخلیق نے انہیں ملتی جلتی شکل صورت میں نہیں قرار دیا، اس نے ہر ایک کے الگ الگ دائرہ کار اور معین وضع پیش نظر رکھی ہے۔

اب دیکھتے ہیں دونوں مفروضوں میں کون سا مفروضہ صحیح ہے اور کس انداز سے ان دونوں مفروضوں کو سمجھا جائے؟

اس معیار کی بنا پر جو پہلے مل چکا ہے، دونوں مفروضوں میں سے کون سا مفروضہ صحیح ہے؟ دریافت کرنا زیادہ مشکل بات نہیں۔ عورت و مرد کی فطری صلاحیتوں و ضرورتوں کا مطالعہ کر لیں۔ بالفاظ دیگر، قانون خلقت نے جو فطری دستاویز ہر ایک کو تک دی اسے دیکھیں، بات واضح ہو جائے گی۔

تمدنی زندگی کی فطری بنیاد ہے

۱۔ ہم گزشتہ مقالے میں بیان کر چکے ہیں کہ تمدنی زندگی کی معاشرتی زندگی کے بارے میں دو نظریے ہیں:

ا۔ انسان کی معاشرتی زندگی طبعی و فطری ہے۔ صراح میں

ب۔ تمدنی بالطبع کہتے ہیں۔

ب۔ معاشرتی زندگی ایک معاہدتی عمل ہے، جسے انسان خود



منتخب کرتا ہے اور اس انتخاب کا سبب اندرونی نہیں بیرونی عوامل کے دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

یہ تو بت ہوئی اجتماعی زندگی کی، خاندانی زندگی کیا ہے؟ یہاں بھی دو نظریے ہیں؛ نہیں۔ سسٹم میں ایک نظریے کے علاوہ کوئی نظریہ نہیں ہے۔ خاندانی زندگی سوئی صیغی اور فطری ہے۔ انسان فطرتاً گھریلو پیدا ہوا ہے۔ بالفرض، شہری زندگی کے بارے میں فطری ہونے نہ ہونے کی بات ہو بھی، اس وقت بھی انسان کی فطرت میں "گھریلو زندگی" کا نکار نہیں کر سکتے۔ اسی صرح بہت سے جانور جو فطرتاً اجتماعی زندگی تو نہیں رکھتے اس کے باوجود ایک قسم کی "عائلی زندگی" نہ جوڑا بن کر رہنے کی زندگی۔ بسکرتے ہیں جیسے کبوتر اور بعض حشرات جو فطرتاً "جفت" رہتے ہیں۔

خاندانی زندگی کا معاملہ اجتماعی زندگی کے معاملے سے مختلف ہے۔ فطرت میں کچھ ایسا نازک عمل ہوا ہے کہ انسان اور بعض جانور گھریلو زندگی اور خاندانی مرکزیت حاصل کرتے ہیں، انہیں صاحب اولاد ہونے کی خواہش ہوتی ہے۔

تاریخی قرینے کسی ایسے عہد کی نشان دہی نہیں کرتے جب انسان گھریلو زندگی نہ رکھتا ہو۔ یعنی میان بیوی الگ الگ زندگی بسر کرتے ہوں۔ یا جنسی تعلقات مشترک و عمومی رہے ہوں۔ آج، دنیا میں وحشی قبیلے موجود ہیں وہ بھی ایسے نہیں ہیں، انہیں سے ہمیں ماضی کے وحشی قبیلوں کا سماج سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ماضی میں انسانی زندگی۔ ماں کی بادشاہی۔ یا۔ باپ کی بادشاہی کی صورت ہی میں پائی جاتی ہے۔

**چار عہدوں کا مفروضہ:** ملکیت کے مسئلے میں پس منظر ہے کہ شروع میں مالکیت مشترک تھی، اور نجی و خصوصی

ملکیت بعد میں وجود پذیر ہوئی۔ لیکن "جنسیت" کے بارے میں یہ بات نہیں ہے۔

جنسیت بندہ زندگی انسان میں اس وجہ سے مشترک تھی کہ انسان ایک قبیلہ تھا اور خاندانی صورت رکھتا تھا۔ یعنی قبیلے کے افراد ایک ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ خاندانی احساسات سے بہرہ ور تھے۔ لہذا ملکیت بھی مشترک تھی۔

شروع کے ادوار میں فرض کریں کہ قوانین و رسم و رواج نہ تھے جس کی بنیاد پر عورت مرد دونوں ایک دوسرے کو ذمہ دار اور جواب دہ قرار دیتے۔ اس دور میں خود ان کی فطرت اور طبعی احساسات ان کو فرائض و حقوق کا پابند کرتے تھے۔ ہرگز ان کی جنسی زندگی بلا شرط و بے پابندی کے نہیں تھی۔ یونہی وہ جانور جو "جفت" زندگی گذارتے ہیں ان کے پاس کوئی اجتماعی یا قراردادی قانون نہیں رکھتے، اس کے باوجود فطری قانون کے مطابق حقوق و فرائض کی نگہداشت کرتے ہیں اور ان کی زندگی بے شرط و قید و پابندی نہیں ہے۔

یگم مہرا نگیمنو چہریاں نے اپنی کتاب "انتقاد بر قوانین اساسی و مدنی ایران" کے مقدمے میں لکھا ہے:

"میں شہرتی جائزہ رکھنے والے زاویہ نظر سے زن و مرد کی زندگی میں کے مختلف خطوں میں چاروں سے ایک راستے سے گذرتی ہے:

۱۔ فطری مرحلہ۔

۲۔ مرد کے غلبہ کا دور۔

۳۔ عورت کے احتجاج کا زمانہ۔

۴۔ زن و مرد کے مساوی حقوق کی منزل۔

پہلے مرحلے میں زن و مرد بالغیر کسی قید و شرط کے باہم جنسی میل مل پ رکھتے تھے ...."

معاشرہ شناسی کو یہ دعویٰ منظور نہیں۔ جامعہ شناسی و معاشرہ آگاہی زیادہ

سے زیادہ بات مان سکتی ہے کہ کہیں اور اتفاقاً کچھ وحشی قبائل میں چند بھائیوں نے چند بہنوں سے مشترکہ طور شادیاں کی ہوں۔ اور وہ سب بھائی، ان سب بہنوں سے جنسی عمل کرتے ہوں، کچھ بھی سب کے مشترک بونا بڑے لڑکیاں، شادی سے پہلے محدود و مخصوص نہ ہوں لیکن شادی انھیں محدود و مخصوص کر دیتی ہو۔ اور اگر اتفاق و اتفاق بعض وحشی قبائل میں جنسی عمل اس سے بھی زیادہ عام تھا یہاں اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ عورت "قومی" ہوتی ہوگی۔ یہ صورت استثنائی ہے، عام دستور اور وضع فطرت سے انحراف۔

ویل ڈیورنٹ نے تاریخ تمدن "جلد اول" صفحہ ۱۱۱ پر لکھا ہے:

"ازواج ہمارے حیوانی اجداد کی ایجاد ہے۔ کچھ پرندوں میں دیکھا گیا ہے کہ دراصل ہر پرندہ ایک جفت پر کثافت ہے۔ گوریٹے اور نگوٹان، نر و مادہ کا سلسلہ بچے کی پرورش تک باقی رکھتے ہیں، اور یہ تعلق بڑی حد تک عورت مرد کے حلق جیسا ہوتا ہے، اور جب مادہ کسی دوسرے نر سے نزدیکی کرتی ہے تو اسے اپنے نر کی بڑی سختی سہنا پڑتی ہے۔"

دوی گریس پگنی نے بورنیو کے اوزنگوٹن کے بارے میں لکھا ہے کہ۔ وہ ایسے خاندانوں میں زندگی گزارتے ہیں جو نر و مادہ اور ان کے بچوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ساوٹھ (Dr. SAVAGE) نے گوریلوں کے سلسلے میں کہا ہے:-

ان کے عادت ہے کہ ماں باپ درخت کے نیچے بیٹھ کر پھل اور میوے کھاتے اور آپس میں کھیتے ہیں۔ ان کے بچے درختوں پر ماں باپ کے گرد ایک شاخ سے دوسری شاخ پر رتے جاتے ہیں۔

شادی تو بہور انسان سے پہلے تاریخ میں موجود ہے، ایسے سماج جن میں شادی نہ ہو بہت کم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر کوئی تحقیق کرے تو کچھ سماج ڈھونڈ سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خاندانی (گھروں) احساس، انسان کا ایک فطری احساس ہے۔ تمدن پر ت کو پیدا کردہ نہیں ہے۔ جیسے بہت حیوانات فطری اور شریک کے طور پر خاندانی رہتے تھے ہیں۔

لہذا انسان پر کوئی دوسرا ایسا نہیں گذر کہ جنس زن اور جنس مرد کی طور پر باقی و شرط و معاہدہ۔ خواہ وہ فطری ہی کیوں نہ ہو۔ زندگی بسر کرتے ہوں۔ اس طرح کے دور کا مفروضہ جنسی اشتراک کی دعویٰ ہے اور یہ دعویٰ خود اشتراک کی طرفداروں نے بھی دولت کی اشتراک کے آغاز میں نہیں کیا تھا۔

زن و مرد کے جنسی تعلقات میں چار ادوار کا مفروضہ، ایک تقلیدی مفروضہ ہے جو تاریک کے بارے میں سوسائٹوں کے چار دوروں سے حاصل کیا ہے۔ سوشلسٹ کہتے ہیں کہ انسان نے مالکیت کے چار دور گزارے ہیں:

پہلا دور۔ ابتدائی مشترک ملکیت۔

دوسرا دور۔ فیوڈل ازم (جاگیر داری)

تیسرا دور۔ کپٹل ازم (سرمایہ داری)

چوتھا دور۔ سوشل ازم اور کمیونزم۔

جو ابتدائی اشتراکیت کی طرف بازگشت ہے مگر ذرا اونچی سطح پر۔

وحشی کی بات ہے کہ یکم منوچہریان نے چوتھے دور کا نام "حقوق زن و مرد کی برابری" رکھا ہے۔

انہوں نے سوشلسٹوں کی تقلید نہیں کی، اور آخری دور کو ابتدائی اشتراکیت کی طرف بازگشت کا نام نہ دیا۔

گرچہ محترمہ کے خیال میں بقول ان کے چوتھے دور اور پہلے دور میں زیادہ مشابہت ہے۔

پھر نے اشتراک کی ہے:

چوتھا مرحلہ، پہلے مرحلے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ عورت و مرد کسی بار دہی



اور برتری کے بغیر مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے۔“

شبہ بہت زیادہ مشابہت۔ کامطلب میں ابھی نہیں سمجھ سکا۔

اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ۔ بالادستی و برتری مرد کو حاصل نہ ہو، اور ایک دوسرے کے درمیان برابر کے معاشرے اور شریعے ہوں، تو یہ بات تو دلیل بننے کے قابل نہیں ہے، کہ یہ دور، ان دوروں سے مشابہت رکھتا ہو محترمہ کے نزدیک، شرط و قید و پابندی کے ہر بندھن سے آزاد تھے۔ جب مرد و زن گھریلو زندگی ہی نہ رکھتے تھے۔

اور اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ۔ چوتھے مرحلے میں آہستہ آہستہ ترمیم بندھن ٹوٹ جائیں گے اور گھریلو زندگی منسوخ ہو جائے گی اور افراد بشر میں ایک قسم کا جنسی اشتراک حکمرانی کرے گا معلوم ہوتا ہے کہ حقوق کی برابری سے ان کا مطلب اس مطلب مدعا کے علاوہ ہے جو برابری حقوق کے حامیوں کے نزدیک صحیح ہے۔ کیونکہ محترمہ مذکورہ بالا مفہوم و مدعا کی بڑی سخت حامی ہیں اور یہ بات ان کے لئے اتفاق سے بڑی وحشت ناک ہوگی۔



اب ہمیں زن و مرد کے گھریلو حقوق کی فطرت کی طرف توجہ کرنا چاہئے اس بارے میں دو چیزوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

ایک سوال یہ کہ۔ زن و مرد طبیعت و فطرت کے لحاظ سے فرق رکھتے ہیں یا نہیں؟  
بالفاظ دیگر عورت و مرد میں فقط تولید و تناسل کے اعضا کا فرق ہے یا اس سے زیادہ گہرا فرق موجود ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ۔ اگر دوسری نوعیت کے اختلافات بھی معلوم ہیں تو کیا وہ اختلافات ایسے ہیں جو حقوق و فرائض پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یا ایسے اختلاف ہیں جن کا فطرت انسانی سے تعلق نہیں ہے جیسے رنگ و نسل۔

## عورت فطرت کے زاویہ نظر سے

پہلی بات کے بارے میں خیال ہے کہ بحث

کی گہنی کش نہیں ہے۔ اس بارے میں تھوڑا

سبھی مطالعہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ فرق و اختلاف زن و مرد فقط تولید و تناسل کے اعضا ہی میں نہیں، دوسری باتوں میں بھی فرق ہے، بحث اس میں ہے کہ باقی اختلافات عورت و مرد کے حقوق و فرائض پر اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں۔

مغربی دانشوروں اور ماہرین نے پہلے حصے پر مناسب طریقے سے گفتگو کی ہے، حیاتیاتی و نفسیاتی اور معاشرتی پہلوؤں کے مطالعے کے بعد ان لوگوں نے تھوڑے سے بھی انکار کی گہنی کش نہیں چھوڑی ہے۔ ان لوگوں نے جس طرف توجہ نہیں کی وہ ہے ان اختلافات کا جائزہ جو خاندانی حقوق اور ذمہ داریوں پر اثر ڈالتے ہیں اور مرد و عورت کو غیر مشابہ قرار دیتے ہیں۔  
فرانس کے مشہور فینریاوجسٹ ایکسس کارنیز، جو بیالوجسٹ اور اعلیٰ درجے کے سرجن تھے، موصوف نے اپنی بہت عمدہ کتاب میں دونوں باتوں کا اعتراف کیا، موصوف کی کتاب فارسی ترجمہ ”انسان موجودہ ناشدختہ“ کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یعنی موصوف کے بقول۔ زن و مرد قانون تخلیق کے مطابق مختلف طور پر پیدا ہوئے ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ دونوں کے خدات اور فرق ان کے فرائض و حقوق پر اثر انداز بھی ہوتے اور ان میں بھی فرق ڈالتے ہیں۔

جنسی عمل اور تولید مثل کے عنوان سے ایک فصل قلم بند کی ہے (مجموع سوم صفحہ ۱۰۰) کہتا ہے:

”یعنی، ورنہ مردان بڑے وسیع عمل کرتے ہیں۔ پہلے تو نر یا مادہ خلیے بناتے ہیں جن کی پیوستگی سے نیا انسان وجود میں آتا ہے۔ اور عین اسی دوران ایسے مردوں کی خون پر ریزش کرتے ہیں، جو رگوں، پتھوں اور ڈھانچے نینر شعور میں مرد و عورت کے اثر ظاہر کرتے ہیں۔ یوں وہ ہمارے تمام بدنی عمل میں تیزی بخشتے ہیں۔“

بیضوں سے ہونے والی ریزش، تھور، جوش و خروش اور خشونت و سختی پیدا کرتی ہے۔ یہی خصوصیات جنگی بیوں کو اس گائے سے ممتاز کرتے ہیں جو کھیتوں میں جنائی کا کام کرتی ہے۔ تمدن بھی وجود زن میں اسی طرح کے اثرات ڈالتا ہے۔  
... مرد و عورت میں جو اختلاف موجود ہے۔ وہ فقط جنسی بدن، بچہ دانی اور نظام تولید اور خاصہ تعلیم ہی پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ ایک اور گہری علت ہے اس اختلاف کی۔ ورنہ ان کیمیائی مادوں کی ریزش ہے جو نسی غدودوں سے خون پر ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ نرسہ کی وجہ سے انقلاب خواتین کے صرف سوچنے میں کہ دونوں جنسوں کو ایک تعلیم و تربیت دی جائے۔ دونوں کے مصروفیات اختیار اور ذمہ داریاں ایک قسم کی دی جائیں۔ عورت بہت سے پہلوؤں سے مرد سے مختلف ہے، بدن کے خیمے، اعضاء کی قوت ساخت، خاص کر اعصابی سندسہ، اس کی جنس کی نشانیوں سے چہرے پر نمایاں ہیں۔

فزیولوجی کے قانون فاعل سے، ستاروں کی دنیا جیسے ہیں، سخت اور ناقابل تبدیلی۔ ممکن نہیں کہ انسانی جمادات وراثت میں دھن دے سکیں، ہم مجبور ہیں جس صورت وہ ہیں، اسی طرح انہیں مان لیں۔

نرسہ کو مردوں کی مذہبی تقلید کے بغیر کوشش کرنا چاہئے کہ اپنی فطرت کے عصب کے ہوسے انعامات کو وسعت دیں، ورنہ اپنی خاص شرت و خمیر کے مطابق سی راہ میں آگے بڑھیں۔ بشریت کے ارتقا میں ان کی ذمہ داریاں مردوں سے زیادہ اہم ہیں، ان ذمہ داریوں کو سبک نہ سمجھیں اور ان سے پہلو تہی نہ کریں۔

کارل نے مرد کے مادہ تولید اور عورت کے مادہ تولید میں خیموں اور ان کے باہم پیوست ہونے کی کیفیت بتائی اور یہ کہ تولید کے لیے مادہ کا ہونا ضروری ہے برضد وجود نرسہ کے اور یہ کہ جنس

ت کے جسم کو مکمل کرنا ہے۔ فصل کے خیمے میں لکھا ہے:

”ہیں جوان ترکیبوں کے لیے وہ طرز فکر اور اس قسم کی زندگی اور فکری اشتعالیات، اور مقاصد و تدبیریں نہ رکھنا چاہئے جو نوجوان نرسوں کے لیے ہو کرتے ہیں تعلیم و تربیت کے ماہرین کو مرد و زن کے اختلاف اعضاء، جنس، مرد و زن کے غیبتا اور ان کے فطری فرائض کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ہماری آئندہ نرس کی بنیاد و تعمیر بنیادی نکتے پر بڑی اہمیت حاصل کرے گی۔“

آپ نے مدد فرمایا، اس پرے دانشور نے زن و مرد کے برے فطری فرق بھی بتائے۔ یہ نکتہ بھی غائب کیا کہ ان اختلافات کے سبب فرائض و حقوق میں مشابہت نہیں ہے۔ آئندہ فصل میں ہم دوسرے دانشوروں کے نظریے بیان کریں گے کہ وہ لوگ زن و مرد میں کیا کیا اختلاف مانتے ہیں، پھر نتیجہ حاصل کریں گے کہ زن و مرد کن حصوں میں صلاحیتوں اور تدبیرتوں میں مشابہ ہیں اور اس وجہ سے انہیں مشابہ حقوق رکھنا چاہیے اور کن حصوں میں مشابہت نہیں رکھتے، اور ایسے حالات میں حقوق و فرائض غیر مشابہ حاصل ہونا چاہئے۔ اور مرد کے عائلی حقوق و فرائض میں یہ حصہ کتب نازک ترین و اہم ترین حصوں میں ہے۔



## سائواں حصہ :

### عورت و مرد کے فرق

- — کیا عورت و مرد میں فرق کا خیال قرون وسطیٰ کی سوچ ہے۔
- — عورت کے حقوق نے افلاطون و ارسطو کو آمنے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔
- — عورت و مرد کی تخلیق میں قانون خلقت نے دونوں کے جوڑ کو زیادہ منطوط بنایا ہے۔
- — مرد، دنیا پر قبضہ کرنے والا ہے اور عورت مرد کو قابو میں رکھنے والی ہے۔
- — مغرب کے نئے مقلدوں کو زن و مرد کے جن تعلقات نے غرقِ سرور کر رکھا ہے، خود اہل مغرب اس خمار کا دور گزار رہے ہیں۔

## عورت و مرد میں فرق و اختلافات

۱۔

عورت و مرد کے فرق و اختلافات : عجیب مہیں بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باوجود کہ بیویں مردی کے نصف آخر میں زندگی گذر رہی ہے۔ پھر بھی کوئے کھدے میں اب بھی یہ لوگ موجود ہیں جن کے سوچنے کا انداز قرون وسطی جیسا ہے۔ پرانے خیالت گھے پیسے افکار، خد ف زن و مرد سمجھتے ہیں۔ عورت و مرد کے درمیان فرق ہے۔ شاید چاہتے ہیں کہ قرون وسطی کے لوگوں کی طرح یہ نتیجہ نکالیں کہ عورت کی جنس گھٹیا ہے، عورت انسان کا س نہیں ہے۔ عورت حیوان و انسان کے درمیان برزخ ہے۔ عورت میں یہ قدرت و قابلیت نہیں ہے کہ زندگی میں مستقل و آزاد ہو، اسے بہر حال مرد کے ماتحت اور اس کی سرپرستی میں رہنا چاہیے۔ آج کی دنیا میں ان پرانی باتوں کا فائدہ کیا ہے۔ آج سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ یہ باتیں بھوت و جمل ساز ہیں۔ مردوں نے زور و ظلم سے عورت کو دبا رکھا تھا۔ اب سب جان گئے ہیں کہ بات برعکس تھی عورت کی جنس برتر اور مرد کی جنس پست اور ناقص تر خیر، مذہب، عوام کی تیرت انگیز ترقی کی روشنی میں عورت و مرد کا فرق کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ جس نے مذہبی و بہتان کی بات نہیں۔ علمی اور تجرباتی حقیقتیں ہیں مگر یہ فرق اس بحث سے قطعاً غیر متعلق ہیں کہ مرد یا عورت برتر جنس ہے۔ دوسری جنس گھٹیا ہے اور ناقص ہے۔ قانون خنقی کے ساتھ ان کی اونچ نیچ سے مقصد ہی کچھ اور ہے۔ قانون نے یہ فرق نہیں یہ رکھا تھا کہ زن و مرد کی خاندانی زندگی کے تعلق کو زیادہ مضبوط کرے۔ ان کی اکائی کی بنیاد بھی رکھی جائے قانون حقت نے یہ فرق سامنے رکھا تھا کہ زن و مرد اپنے ہاتھوں اپنے عائلی فرائض خود بانٹ لیں اور جسم کے دوسرے اعضاء کی طرح اختلاف کے باوجود ایک جسم بنائیں۔ مگر قانون حقت نے

نکچہ، کمان، ہاتھ، پاؤں اور ریڑھ کی ہڈی کے جوڑ بنائے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ ان پر خاص نظر رکھتا اور ان میں فرق چاہتا ہے۔ ایک پر دوسرے کے مقابلے میں نقصان نہ سمجھتا ہے۔

### نقص و کمالات یا تناسب

یہ موضوع میرے تعجب کا باعث ہے۔ بعض حضرات اس پر اصرار کرتے اور زور دیتے ہیں کہ جسمانی و نفسیاتی سرچیتوں کے لحاظ سے زن و مرد کا فرق، عورت کے ناقص اور مرد کے کامل ہونے کی دلیل ہے۔ اس کا تمہارے یوں کرتے ہیں کہ قانون حقت نے مصلحت کی بنا پر عورت کو ناقص پیدا کیا عورت کے ناقص اخلاق ہونے کی بات ہم مشرق کے رہنے والوں سے پہلے اہل مغرب میں پہل چکی ہے۔ وہاں مذہب و کلیسا کہتے ہیں:

عورت کو عورت ہونے پر شرمندہ ہونا چاہیے۔ کبھی کہا جاتا ہے۔ عورت وہ مخلوق ہے جس کی زینس بری اور عقل چھوٹی ہے۔ عورت آخری وحشی ہے جسے مرد نے رام کیا ہے۔ وغیرہ اس سے زیادہ عجیب یہ بات کہ، اخیر دور میں کچھ یورپ والے ایک سوا سی درجے کی روشنی ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ایک ہزار ایک دیلوں سے مرد کو مخلوق ناقص و پست و زبون و عورت کو مخلوق کل و برتر ثابت کر دکھائیں۔

پرنسپل اشلے مونٹیگو کی تالیف "زن جنس برتر" مجلد "زن روز" میں پڑھی ہے۔ تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کس زور و آوری اور بے معنی تانے بانے سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عورت مرد سے زیادہ برتر ہے۔ کتاب میں فزیالوجی، نفسیات اور معاشرتی شماریات کی حد تک کارآمد اطلاعات دی گئی ہیں۔ اس کے بعد جو مصنف نے نتائج حاصل کرنا چاہے ہیں وہ اپنا مقصد کتاب کے نام سے عیاں ہے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں زمین آسمان کے فرق سے مدد دیتے ہیں۔ آخر، ایک دن عورت کو اتنا حقیر و پست و زبون کیوں کہا تھا کہ آج ہجرت ہو کر گذشتہ کی تلافی کرنا پڑ رہی ہے اور اس میں بھی وہ سب نقائص اور کمزوریاں جو



عورتوں کے ذمے لگائی تھیں اب انھیں کو مرد کے سر تھوپنے کی مہم شروع کرنا پڑی ہے۔ کیوں ضروری ہے کہ زن و مرد کے فرق کو کسی کے نقص اور کسی کے کامل ہونے پر زور دیں پھر کبھی مرد کا دامن پکڑیں کبھی عورت کا۔

ایشلی مونٹیگو ایک طرف تو زور دیتے ہیں کہ زن کو جنس کے اعتبار سے مرد پر برتری حاصل ہے اور دوسری طرف مرد کے خصوصیات جاتے ہیں کہ مرد تاریخی اور اجتماعی لحاظ سے تاریخ کا خالق ہے، فطری عواص نہیں۔

مرد و عورت کا فرق "نسب" (ایک مناسبت پر مبنی ہے) نہ نقص و کمال قانون خلقت چاہتا تھا کہ ان اختلافات سے عورت و مرد میں زیادہ مناسبت رہے، کیونکہ دونوں بہر حال شریک زندگی گذریں گے۔ الگ الگ زندگی بسر کرنا قانون خلقت سے منحرف ہے۔ یہ مطلب بعد میں آنے والے توضیحات میں زیادہ روشن ہوگی اور تفاوتوں کی نوعیت اور کھلے گی۔

پسند کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے جو ہماری صدی میں زیر بحث آیا۔ کم از کم ایک ہزار چار سو برس پہلے یہ بحث ہو چکی ہے۔ افلاطون کی کتاب جمہوریت میں اس کا تذکرہ ہے۔

افلاطون نے بڑی صفائی سے کہا ہے کہ عورت و مرد مشابہ صلاحیتوں کے مالک ہیں عورت بھی وہی ذمہ داریاں سنبھال سکتی ہیں جو مرد سنبھالتے ہیں۔ انھیں وہی حقوق ملنا چاہئے جن کے مرد فائدہ اٹھاتے ہیں۔

عورت کے بارے میں بیسویں صدی کے مسائل جنہیں نیا کہا جاتا ہے سب کا سرچشمہ افلاطون کے افکار میں ہے۔ بلکہ اس صدی کے لوگ جسے حد افراط اور ناقابل قبول کہتے ہیں وہ افلاطون کے یہاں موجود ہے۔ لوگ اتنے بڑے آدمی سے تعجب کرتے ہیں، جو شخص "پدر فلسفہ" ہو وہ ایسی باتیں کرے: افلاطون نے رسالہ جمہوریت کی پانچویں فصل اسی موضوع سے مخصوص کی ہے اور زن و فرزند کی اشتراکیت، نسل کی صلاح و بہبود، بعض زن و مرد افراد کی تولید

ناس سے محرومی اور ان افراد کو یہ حق دینا جو اعلیٰ درجے کے صفات سے متصف ہوں خاندان پر۔ مرد کی تربیت و پرورش کا ضابطہ، ناس و ولد کے لیے معین عمروں کا تعین یعنی زن و مرد جنسی عمل اور اولاد پیدا کرنے کے لیے ایسی عمروں کا تعین جن میں جوش اور زندگی کی ن بھر پور تہو۔

افلاطون کا عقیدہ ہے جس طرح مردوں کو جنگی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے، عورتوں کو بھی اسی طرح تربیت دی جائے، مردوں کی طرح خواتین بھلی و زشتی مقابلوں اور کھیلوں میں شرکت کیا کریں۔

اس کے باوجود دونوں افلاطون نے ضروری لکھے ہیں:

وہ مانتا ہے کہ عورتیں جسمانی، روحانی اور دماغی طور پر مردوں سے کمزور ہیں۔ یعنی وزن کے تفاوت کو کمیت و مقداری کے لحاظ سے تسلیم کرتا ہے۔ اگرچہ کیفیت میں اور مردیتوں میں اس کے خلاف ہے۔ افلاطون کے خیال میں مرد و زن میں مماثل صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ ہر شعبے میں وہ مردوں سے زیادہ کمزور ہیں اور اس سے کام لینے کے لیے عورت کو کوئی اثر نہیں پڑتا جو کام مرد کر سکتا ہے وہ عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔

فلاطون، عورت کو مرد سے کمزور تر ماننے کی بنیاد پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ مرد پیدا ہوئے ہیں۔ عورت نہیں۔ وہ کہتا ہے:

خدا کا شکر ادا کرتا ہوں یونانی پیدا ہوا ہوں، غیر یونانی نہیں ہوں۔ آزاد خلق ہوا۔ غلام نہیں۔ مرد پیدا ہوا ہوں، عورت نہیں۔

فلاطون نے نسلی بہبود، عورت و مرد کی مساوی صلاحیتوں کے مطابق پرورش، زن و غیرہ کی مشترک ملکیت (اشتراکیت) کا جو نظام بنایا ہے اس میں حکم حق کو ذمہ دار ہے۔ یعنی فلسفی حاکم اور حاکم فلسفی۔ جنہیں افلاطون تنہا حکومت کے لائق سمجھتا ہے۔

بات ہے کہ افلاطون سیاسی رویوں میں ڈیموکریسی کے خلاف اور اسٹوکریسی کا حامی

گذشتہ نظریوں میں سازی باتیں ارسطو کثرت سے وابستہ ہیں ان کے علاوہ دوسرے جہات کے بارے میں وہ کوئی رائے نہیں دیتا۔

### ارسطو۔ افلاطون کے مقابلے میں

میں ہیں وہ س کے شاگرد ارسطو کہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب سیاست میں زن و مرد کے فرق پر اظہار رائے کرتے ہوئے اپنے استدلالوں کی سخت مخالفت کی ہے۔ ارسطو کے نزدیک زن و مرد میں اختلاف کثرت (مقداری) ہی پہلو سے نہیں۔ کیف و کیفیت کے لحاظ سے بھی ہے۔ قانون خلقت نے ہر ایک کے لئے جو فرائض عائد کیے اور جو حقوق تجویز کیے ہیں ان میں زیادہ مقامات باہم مختلف ہیں۔ ارسطو کے عقیدے میں عورت و مرد کے اخلاقی فضائل بھی اکثر مقامات پر جدا جدا ہیں۔ ایک صنفی مرد کے لیے باعث شرف ہوتا ہے اور وہی صنفی عورت کے لیے فضیلت نہ ہو۔ اسی طرح اس کے برعکس ایک صنفی عورت کے واسطے فضیلت ہو اور مرد کے لیے نہ ہو۔

ارسطو کے نظریات نے پرانے زمانے میں ہی افلاطون کے خیالات کو منسوخ کر دیا اس کے بعد آنے والے دانشوروں نے اس کے نظریات کو افلاطون کے خیالات پر ترجیح دی یہ باتیں تھیں ماضی بعید کی، اب دیکھیں نئی دنیا کیا کہتی ہے

### آج کی دنیا کی نظر

آج کی دنیا، اندازہ و گمان کی بات کے بجائے مشاہد و تجربہ پر بنیاد رکھتی ہے۔ جب اعداد و شمار کی بات ہوتی ہے تو چشم دید حقائق سامنے ہوتے ہیں جدید دنیا میں فزیکس کے گہرے مطالعات نفسیات و معاشرے کے حقائق کی روشنی میں بہت زیادہ اختلاف اور فرق معلوم ہوئے ہیں، ایسے اختلافات جسے پرانی دنیا دریافت نہیں کر سکی تھی۔

ماضی بعید میں مرد و زن کے اقدار متعین کرتے ہوئے فقط ایک کے جسم کی قوت اور موٹائی

دوسرے جسم کی چھوٹائی، ایک کا جسم بھاری بھر کمزور اور نازک اندام، ایک قد آور دوسرا دب و قد والی، ایک کی آوازیں زیادہ گرج دوسری کی آوازیں لطافت و نرمی، ایک کا جسم خستہ بال، دوسرے کا جسم آمینہ اور کندہ۔ اس سے آگے بڑھ کر تو بونگ کی حد تک جو دونوں میں ایک ایک سن و سال میں ہے۔ یا پھر عقل و احساسات کا حساب لگاتے تھے۔ مرد کو منہ پر عقل و عورت کو منہ پر محبت کہتے تھے۔

آج۔ ان باتوں سے آگے بڑھ کر متعدد پہلو اجاگر ہوئے ہیں، یہ معلوم ہوا کہ زن و مرد کی دنیا اکثر معاملات میں الگ الگ اور ان معاملات میں فرق ہے۔

اب تحقیق نے جو کچھ لکھا ہے، ہم اس سے زن و مرد کے مجموعی تفاوت اور اختلافات کا ذکر کریں گے اور اختلافات کے فلسفے پر روشنی ڈالیں گے۔ یہ بھی غور کریں گے کہ ان اختلافات کی بنیاد کثرت ہے و کثرتی باتیں ہیں جو ماریخی، ثقافتی و معاشرتی عوامل سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ غلط ہے۔ یہ جنس برائے شخص تھوڑے سے مطالعے اور تجربے سے دریافت کر سکتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کا امکان نہیں ہے۔

### مرد و عورت کی تفاوت

مرد، متوسط طور پر، بھاری اور گتھے بدن کا اور، عورت، چھوٹی و زیادہ نازک اندام ہوتی ہے۔ مرد کا قد لمبا، عورت کا قد چھوٹا ہوتا ہے۔ مرد میں کھردراہٹ و نرمی و صفت، مرد کی آواز موٹی اور بھاری، عورت کی آواز نازک اور دلکش۔ مرد کی جلد بڑھتی ہے، مرد کی جسمانی نشوونما سست ہوتی ہے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ مرد درمیان لڑکے سے زیادہ جلدی بڑھتی ہے۔ مرد کے رگسپٹھے اور جسمانی قوت عورت کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ عورت میں پیاری سے مقابلہ کرنے کی قوت مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔ مرد سے پہلے بالغ ہو جاتی ہے۔ اس میں مرد سے پہلے تولید کی قوت آ جاتی ہے ورنہ پہلے ہو جاتی ہے۔ مرد کے یہاں اس کے برعکس ہے۔ لڑکی، لڑکے سے پہلے ہوتی ہے۔ عورت سے تو مغز سے، مرد کا متوسط مغز بڑا ہوتا ہے۔ لیکن مجموعی جسم کی نسبت سے عورت کا



مغز بڑا ہوتا ہے۔ مرد کے پھیپھڑے عورت کے پھیپھڑوں سے زیادہ سانس میں ہوا کھینچتے ہیں۔ عورت کے دل کی دھڑکن مرد کے دل کی دھڑکن سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔

**نفسیاتی فرق :** مرد، ورزش، نکل اور دور دوڑ چھوپ کے کام سے بہ نسبت عورت کے دل چسپی رکھتا ہے۔ مرد کے احساسات رزم و مقابلہ و جنگجوئی، عورت کے جنات بزم دوستی صلح پسندی چاہتے ہیں۔ مرد، حد سے آگے بڑھنے اور ہنگامہ بازی عورت پر سکون و خاموشی ترجیحات رکھتی ہے۔ عورت اپنے لیے اور غیروں کے لیے سخت رویے سے بچتی ہے، اسی وجہ سے عورتوں کی خودکشی مردوں سے کم ہے۔ مرد، خودکشی کے معاملے میں بھی عورت سے زیادہ سخت ہے، بددق، پستول سے اور پھندا ڈال کر مرنے کے واقعات اور اونچی عمارتوں سے کود کر جان دینے کے قصے مرد کے زیادہ ہیں۔ عورت، خواب اور گولیاں، ایون... کھا کر مر جاتی ہیں۔

عورت کے نفسیات اور احساسات مرد کے مقابلے میں زیادہ مشتعل ہو جاتے ہیں عورت مرد سے جلد کی جوش میں آجاتی ہے یعنی عورت جن معاملات میں اسے خاص لگاؤ یا خطرہ ہو، تیزی اور جلدی سے اپنے احساسات میں بہہ جاتی ہے اور مرد بہ نسبت عورت کے زیادہ سرد مزاج ہے۔ عورت طبعاً زیور و آرائش جہاں و زیبائش چاہتی ہے اسے رنگارنگ فیشن درکار ہیں۔ مرد اس کے خلاف ہے۔ مرد کے مقابلے میں عورت کے احساسات زیادہ ناپائیدار ہیں۔ عورت مرد سے زیادہ تناسل طلب زیادہ مذہبی، زیادہ باتوئی، زیادہ ڈرپوک اور زیادہ تکلف پسند ہے عورت نفسیاتی طور پر مادرانہ جذبات رکھتی ہے، یہ نفسیات بچپن ہی سے اس میں موجود ہوتی ہیں۔ اسے مرد سے زیادہ خاندان اور گھر سے تعلق خاطر ہوتا اور بلا ارادہ گھر لوٹ کر رہتی ہیں۔ عورت دلیل و استدلال اور خشک عقلی بحثوں میں مرد کے برابر نہیں پہنچ سکتی، ہاں ادب، نقاشی، اور ذوق و نفسیات سے نازک تعلق رکھنے والوں میں مرد سے کم نہیں۔ مرد راز کو چھپانے اور تکلیف دہ معاملات کو اپنے اندر محفوظ رکھنے کی زیادہ قوت رکھتا ہے۔

سی دیں سے رازداری کی بدولت پیدا ہونے والی آزمائشیں مرد کو زیادہ جھیلنا پڑتی ہیں۔ بخلاف عورتوں کے۔ خواتین، مرد سے زیادہ رحم دل ہیں، فوراً انھیں رونا آتا اور کبھی کبھی ان بھی کھاجاتی ہیں۔

**احساسات کا تناظر :** مرد، اپنی خواہشات کا غلام ہے، عورت محبت کی بندھی ہوئی ہے۔ مرد جس عورت سے محبت کرتا ہے اسے پنتا، درپند کرتا ہے عورت اس سے محبت کرتی ہے جس کی قدر و قیمت جانتی ہو اور جس نے اس سے محبت کا اظہار دیا ہو۔ مرد کی خواہش کہ عورت کے ساتھ رہے اور عورت بھی اس کا ساتھ دے اسے تیار دے۔ عورت، مرد کا دل موہنے اور دل کی راہ سے اس پر چھپا جانے کی فکر میں رہتی ہے۔ عورت کے سر پر سوار ہونا چاہتا ہے، عورت، مرد کے دل میں سمانا چاہتی ہے۔ مرد، عورت کو پکڑنا چاہتا ہے، عورت بھی مرد کو جذب کرنا چاہتی ہے۔ عورت، مرد میں دلیری و بہادری اور مرد عورت میں دلیری و زیبائش دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ عورت کے نزدیک سب سے بڑی چیز ہے کہ مرد اس کی حمایت کرے۔ عورت، مرد سے زیادہ خواہشات کا شکار ہوتی ہے۔ مرد کی خواہش حملہ آور اور پہل کرتے والی ہے۔ عورت کی خواہش میں تسکین و تحریک ہے۔

## عورت مرد کے فرق

(۲)

پروفیسر ریک کے نظریات | مشہور امریکی نفسیات پروفیسر ریک کے نظریات "زن و مرد" کے شمارہ نمبر ۹ میں ہیں چھپ چکے ہیں پروفیسر ریک "زن و مرد" کے مسئلہ پر تحقیق کرتے اور نتائج حاصل کرتے رہے پھر انہوں نے ایک ضخیم کتاب میں دونوں کے درمیان فرق بتائے ہیں۔ پروفیسر موصوف کے بقول :

مرد کی دنیا، عورت کی دنیا ہے بہت مختلف ہے۔ اگر عورت مرد کی طرح نہیں سوچتی یا اس جیسا کہ نہیں کرتی تو اس کا سبب دونوں کی دنیاؤں کا فرق ہے۔

پروفیسر نے لکھا ہے :

تورات کے بموجب "زن و مرد ایک گوشت سے وجود میں آئے" ٹھیک ہے دونوں ایک گوشت سے پیدا ہوئے ہیں، مگر دونوں کے جسم مختلف ہیں۔ پھر دونوں کی عیادت میں مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ عیادتیں بریں، دونوں کے احساسات کبھی مماثل نہیں ہو سکتے۔ حادثات اور اتفاقات کے وقت دونوں کو رد عمل یک نہیں ہو سکتا۔ زن و مرد اپنے جنسی تقاضوں کے مطابق مختلف اقدام کرتے ہیں جیسے دوسرے دوسروں میں الگ الگ حرکت کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کریں، ممکن ہے مگر کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یعنی دونوں زندگی ساتھ بسر کر سکتے ہیں، ایک دوسرے کے عاشق اور

ایک دوسرے کے صفات و اخلاق قبول کر کے ٹھکراوٹ اور اکٹھا ہٹ محسوس نہ کریں۔

پروفیسر ریک نے زن و مرد کے تقابلی معاملے میں جو اختلافات قلم بند کیے ان میں سے :

(۱) مرد اپنے چاہنے والی عورت کے ساتھ ہمیشہ رہنے کے خیال سے اکٹھا ہٹ محسوس کرتا ہے۔ لیکن عورت کے لیے اس سے بہتر کوئی لذت نہیں کہ وہ ہمیشہ ایک چاہنے والے مرد کے پہلو میں رہے۔

(۲) مرد کا دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ ایک حالت میں رہے۔ عورت کی خواہش رہتی ہے کہ ہر آن نئی ٹوپی ہو۔ ہر صبح کونے حلیے میں بستر سے اٹھے۔

(۳) بہترین جملہ جو ایک مرد کسی عورت سے کہہ سکتا ہے وہ عام محاورہ ہے "پیاری میں تمھیں چاہتا ہوں" خوبصورت ترین جملہ جو عورت اپنے چاہنے والے سے کہہ سکتی ہے، وہ ہے "مجھے تم پر ناز ہے"۔

(۴) اگر کوئی شخص زندگی میں کئی محبوب عورتوں کے ساتھ رہ چکا ہو تو دوسری عورتوں کی نظریں وہ جاذب توجہ ہوتا ہے۔ مرد کو وہ عورت بدی معلوم ہوتی ہے جو کئی مردوں کے ساتھ زندگی گزار چکی ہو۔

(۵) مرد کو بڑھاپے میں بد بختی کا احساس ہو جاتا ہے، کیونکہ اپنے روزانہ مشغلے یعنی کام کو ہاتھ سے دیتے ہیں۔ مگر عورت بڑھاپے سے خوش ہوتی ہے کہ بہترین چیزیں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ گھر اور چند نو اسے پوتے۔

(۶) مرد کی نظریں خوش نصیبی کے معنی میں معاشرے میں ایک شخصیت اور مقام حاصل کرے۔

(۷) عورت کے نزدیک خوش نصیبی کے معنی ہیں ایک آدمی کے دل پر قابو اور اسے زندگی بھر کے لیے اپنا بنا لینا۔

(۸) مرد ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ محبوب عورت کو اپنے مذہب و قوم میں داخل کرے۔

(۹) عورت کے لیے شادی کے بعد خاندانی نام، دین و ملت اپنے محبوب مرد کی خاطر بدل لینا آسان کام ہے۔



**شاہ کارِ خلقت** زن و مرد کے لیے فرق جن سے دونوں کی خاندانی ذمہ داریوں اور حقوق میں فرق پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ اس سے قطع نظر۔ یہ مسئلہ بچائے

خود خلقت کا شاہکار ہے۔ درسِ توحید و معرفت خدا ہے، جہان و کائنات کے حکیمانہ و مدبرانہ نظام پر ایک آیت و نشان ہے۔ ایک وضعِ مثال سے کہ خلقت کے معاملات کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں۔ فطر اندھیرے میں اندھے کی طرح رستہ نہیں ملے کر رہی ہے۔ علتِ غائی کے عمل و فعل بغیر تخلیق و وجود کائنات آئے دن رونما نہیں ہو رہا ہے اس دعوے پر یہ بخت دلیل ہے۔

تخلیق کی عظیم قوت نے، خفیف نوع اور مقصد تک پہنچنے کے واسطے تولید و ناس کا انتظام کیا ہے۔ اس کے کارخانے سے ہمیشہ جنسِ نر اور جنسِ مادہ وجود میں آرہی ہے۔ پھر نسل کی بقا و دوام کے لیے دونوں جنسوں کی باہمی مدد و تعاون و وحدت کی نیور کھی ہے، خصوصاً نوعِ انسان میں، ان دونوں کی مدد سے وہ سن دور کو مکمل کر رہی ہے۔ قوتِ تخلیق نے ہر صاحبِ حیات کی خاصیت خود خواہی و منفعت طلبی کو خدمت و تعاون، عفو و ایثار سے بدل دیا ہے، ان کو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا صلب بنادیا ہے۔ اس نے منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے اور دونوں کے جسم و روح کو جوڑنے کے واسطے عجیب قسم کے جسمانی و روحانی فرق رکھے ہیں تاکہ وہ آپس میں زیادہ سے زیادہ جذب و انجذاب حاصل کر سکیں ایک دوسرے کے عاشق و مطلق گاہوں۔ اگر عورت میں جسم و جانِ خلق و مزاجِ مردانہ ہوتا تو مرد سے کام لینا اور مرد کو اپنا شیفتہ وصال بنانا محال ہوتا۔ اور اگر مرد میں وصالِ جسمانی و روحانی وہ ہوتا جو عورت میں ہیں تو، عورت اسے اپنی زندگی کا ہیرو نہ مانتی وہ اس کے دل کو جیتنا اپنے فنِ شکار کا بہترین شاہکار نہ سمجھتی۔ اصل مرد جہاں گیر اور زن مرد گیر پیدا ہوئی ہے۔

قانونِ خلقت نے زن و مرد کو ایک دوسرے کا طلب گار بنایا ہے۔ یہ ربط عام چیزوں کا عام چیزوں جیسا نہیں، وہ تعلق جو انسان خود خواہی سے محسوس کرتا ہے۔ یعنی انسان چیزوں کو اپنی خواہش کی بنا پر طلب کرتا ہے۔ انھیں استعمال کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انھیں حاصل کر کے اپنے وجود

آرام پر قربان کرتا ہے۔ میانِ بیوی کا تعلق یہ کہ دونوں ایک دوسرے کی خوش نصیبی و راحت کی فکر میں رہتے ہیں خود فراموشی اور ایک دوسرے پر چاں تئاری سے لذتِ یاب ہوتے ہیں۔

**خواہشاتِ بلند و مرتبہ** بعض حضرات "شہوت" اور "رافت" خواہش و دل جوئی میں فرق نہیں کرتے۔ تعجب تو اس پر ہے۔ ان

میان میں بیوی کو صرف لالچ اور شہوت کا رشتہ جوڑتا ہے۔ نفع اندوزی و حسنِ خدمت جیسے آدمی، کھانے، پینے، پہننے اور سواریوں سے ربط رکھتا ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ خلقت و نصرت میں خود خواہی اور نفع اندوزی کے علاوہ اور بھی رابطے موجود ہیں۔ یہ رابطے خود بخود جذبے سے نہیں پیدا ہوتے۔ ان کے علاوہ حشر و شمول سے ابھرتے ہیں، وہ رشتے، جانی و غود و درگزر، اپنی تکلیفوں کو بھولنا، غیر کی راحت و آرام کا خیال رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ رشتے انسان کی انسانیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ باتیں جانوروں کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہیں جب وہ اپنی بیعت یا بچوں پر وقت آنے یا حفاظت کے لمحے ان کا اظہار کرتے ہیں۔

ان لوگوں کا خیال ہے کہ مرد ہمیشہ عورت کو سی نظر سے دیکھتا ہے جیسے شادی شدہ جو ان ایک ہر جانی عورت کو کبھی دیکھ لے۔ یعنی دونوں کا تعلق شہوتِ کلبہ اور بس۔ حقیقت ایسا نہیں یہ رشتہ، شہوت سے بالاتر ہے۔ اور وہی بلند بندھن دونوں کا پیوند ہے، وہ رشتہ عالی قرآن مجید کی زبان سے "موت و رحمت کہنا چاہئے؛

ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیہا  
وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (اروم/۲)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس میں جوڑا پیدا کیا کہ تم اس کے پاس سکون حاصل کرو اور تم دونوں میں "مودۃ" (پر خلوص محبت) اور رحمت (مہربانی) پیدا کی۔

کتنی بڑی غلط فہمی ہوگی، اگر ہم تاریخ و روابط زن و شوہر فقط خدمت حاصل کرنے اور استعمال اور تزاریع بقاء کے نام سے تعبیر کریں اور کیا کیا مہل بائیں اس سلسلے میں کہی گئی ہیں۔ یہ سچ عرض کرتا ہوں بعض اوقات ان تحریروں کو پڑھا اور دیکھا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ یہ لوگ زن و مرد کے روابط کی تاریخ میں صرف ایک اصل اور ایک قانون استعمال کرتے ہیں "نظام" زن و مرد سماجی و حیوانی کی طرح الگ الگ برسر پیکار رہنے والے دو طبقے ہیں۔ ان کے مفروضے سر تعجب و حیرت و نادانی پر قائم کھاتا ہوں۔ اگر والدین اور اولاد کی تاریخ روابط کو مستحکم اور حسن خدمت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو روابط زن و مرد کی تاریخ بھی اس نظر سے دیکھی جاسکتی ہے۔ ٹھیک ہے۔ مرد ہمیشہ عورت سے زیادہ زور آور تھا۔ لیکن قانون اخلاق نے مرد کے خیر کو ایسا بنایا ہے کہ وہ غلاموں اور کینروں اور کمزوروں کی طرح اپنی بیوی پر ظلم و ستم کو روا نہ رکھے، جیسے وہ سلوک اپنی اولاد پر جائز نہیں جانتا۔

مرد، عورتوں پر ستم کرتے ہیں۔ میں اس کا منکر نہیں ہوں۔ ہاں، وہ تشریح نہیں مانتا جو اس رویے کے بارے میں کی جاتی ہے۔ مردوں نے پوری تاریخ میں عورتوں پر بہت ستم ڈھائے ہیں، لیکن ان منصہ کی بنیاد وہی سبب تھے، جس کی وجہ سے انھوں نے اپنی محبوب و زہر پر ستم ڈھائے تھے۔ بلکہ انھیں اسباب کی بنا پر خود انسان نے اپنے اور بھی ظلم کیے۔ اس کی بنیاد تھی جہالت و عادت یا تعصب، اس کا حس فائدہ طلبی سے کیا تعلق۔ اگر کبھی مناسب وقت ملا، تو تاریخ تعقیبات زن و شوہر پر تفصیلی گفتگو کروں گا

گھر پر روابط ہی عورت و مرد میں مختلف چیزوں کے روابط میں فرق پیدا نہیں کرتا، بلکہ خود ان دونوں کا باہمی تعلق بھی مشابہ نہیں رہتا۔ مرد کا عورت سے ربط اور اس کی نوعیت ویسی نہیں ہوتی جو نوعیت عورت کی رشتے کی بنیاد پر مرد سے ہوتی ہے دونوں میں دونوں طرف سے فرق ہوتا ہے۔ صرف میں کشش کے باوجود لیکن اجسام بے جان کے برعکس چھوٹا

## زن و مرد کے باہمی نفسیات و احساسات

بڑے جسم کو اپنی طرف کھینچتا ہے، کیونکہ قوت نیچر نے مرد کو منہمک طلب و عشق اور عورت کو منہمک محبت و عشوقیت بنایا ہے، مرد کے احساسات نیاز مندانه، عورت کے احساسات ناز آفرینی ہے مرد کے احساسات غالبانه اور احساسات زن مطلوبانه ہیں۔

کچھ دن پہلے ایک روزنامے میں اس روسی لڑکی کی تصویر چھپی تھی جس نے خود کشی کی تھی۔ اس نوجوان نے ایک تحریر چھوڑی جس میں تھا کہ مجھے اب تک کسی مرد نے نہیں چھوا اس لیے مجھے زندگی برداشت نہیں۔

ایک لڑکی اگر کسی مرد کی محبوب نہیں بن سکتی تو اپنے اندر بہت بڑی شکست محسوس کرتی ہے۔ اسے کسی مرد نے چھوا نہیں۔ نوجوان لڑکا زندگی سے کب مایوس ہوتا ہے؟ جب اس کو کسی لڑکی نے چھوا ہو؟ نہیں۔ وہ مایوس اس وقت ہوتا ہے جب کسی لڑکی کو چوم کے۔

طویل اور جامع بحث کے دوران "ویل ڈیورنٹ" لکھتا ہے، اگر شوہر کے حصول میں دخترانہ تیار فقط علم و فکر میں ہوتا، دل ربائی و بھول پن اور چالاک بے کار ہوتی تو ساتھ فی صد اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں بن بیامی نہ رہیں۔۔۔۔۔

اعلیٰ درجے کی مفکر و تعلیم یافتہ خاتون یکم مونیہ کو اس کی شکایت کرتی تھیں، کوئی شخص ان سے شادی نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا: مجھے کوئی کیوں نہیں چاہتا؟ میں دوسری عورتوں سے بہتر ہو سکتی ہوں، باوجود اس کے بے حیثیت و کم اہمیت عورتوں سے غرق کیا جاتا ہے مگر مجھ سے نہیں۔

آپ نے دیکھا، یہ محترمہ کس طرح کے احساس شکست میں مبتلا ہیں اور وہ بھی مرد کے مقابلے میں۔ وہ کہتی ہیں، مجھے کوئی کیوں نہیں چاہتا؟

مرد، اس وقت شکست محسوس کرتا ہے جب شادی کے مرحلے میں وہ اپنی محبوبہ کو حاصل نہ کر سکے یا محبوبہ تول جائے مگر وہ اس کے قابو میں نہ آئے۔

ان سب چیزوں کا ایک فلسفہ ہے۔ گہرا اور مضبوط اتحاد و تعلق۔ یہ رشتہ استوار کیوں



درکار ہے؟ تاکہ زن و مرد، زندگی سے زیادہ لذت حاصل کر سکیں؟ نہیں! فقط یہی نہیں۔  
انسانی معاشرے کی اساس اور نسل آئندہ کی نیواسی سطح پر استوار ہوتی ہے۔  
رسالہ "زن روز" شمارہ ایک سو ایک میں "کلوا السن"  
ماہر نفسیات خاتون کا نظریہ کے قلم سے ایک نفسیاتی بحث شایع ہوئی ہے۔

یہ محترمہ خاتون کہتی ہے:

ایک خاتون نفسیاتی ماہر کے طور پر، میرا سب سے زیادہ رجحان مردوں کے نفسیات  
کے مطالعے کی طرف تھا، کچھ دن پہلے مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں زن و مرد کے  
نفسیاتی عوامل پر تحقیق کروں، اس تحقیق کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا:  
۱۔ تمام عورتوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی شخص کی نگرانی میں کام کریں، انھیں  
محکوم ہونے اور نگران کار کے ماتحت کام کرنے میں خوشی ہوتی ہے۔  
۲۔ عورتیں یہ چاہتی ہیں کہ لوگ ان کے وجود کو موثر اور ان کو نیا زندگی کا مرکز بنا لیں۔  
اس کے بعد یہ محترمہ اپنی رائے کا اظہار یوں کرتی ہیں:

میرے خیال میں ان دونوں نفسیاتی احساسات کی بنیاد یہ ہے کہ خواتین جذبات  
کی تابع اور مرد عقل کے تابع ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ خواتین ہوشمندی میں مردوں  
کے برابر ہی نہیں بلکہ بعض اوقات اس معاملے میں وہ برتری بھی نکلتی ہیں۔ خواتین کا  
نقطہ کمزوری فقط ان کے جذبات کی شدت ہے۔ مردوں کی سوچ ہمیشہ عملی ہوتی  
ہے۔ وہ بہت فیصلہ کرتے ہیں۔ اچھے قسم کا نظم و نسق قائم کرتے ہیں، ان کی رہنمائی اچھی  
ہوتی ہے۔ لہذا مردوں کی برتری کا سبب خود فطرت کی اساس ہے۔ اس حقیقت  
سے عورتیں جتنی بھی ٹکریں۔ فائدہ مند نہ ہوگا۔ خواتین، مردوں سے زیادہ حساس  
ہیں لہذا انھیں یہ باور کرنا چاہیے کہ انھیں زندگی میں مردوں کی سرپرستی درکار ہے  
..... خواتین کا مقصد زندگی "حفاظت" ہے۔ جب انھیں یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے

سی وقت کم سے ہاتھ روک لیتی ہیں۔ اس مدعا کو حاصل کرنے کے لیے خطرات کا  
سامنا کرتے بچکچاتی ہیں، ان کا احساس خوف ایک ایسا احساس ہے جسے دور کرنے  
کے لیے مدد کی ضرورت پڑتی ہے، جس کاموں میں لگاتار سوچنا پڑتا ہو، عورتوں  
کو بھکا دینے والے کام ہیں.....

جلد بازی کی کا انقلاب: عورتوں کے پامال شدہ حقوق کی بحالی کے لیے جو انقلاب  
برپا ہوا اس میں بہت زیادہ بے حواسی اور جلد بازی سے

وہ سوا وجہ تھی کہ انھیں یہ خیال ہی دیر میں آیا۔ ان کے جذبات نے مہلت نہ دی کہ علم ان سے  
ایسا فیصلہ مت وراسے رہنا نہ تھا۔ آخر کار خشک و تر سب کچھ جل گیا۔ اس سلسلے سے عورتوں کی کچھ  
خود میں کمزوریوں مگر حقوق کچھ زیادہ دے دیے گئے۔ بند دروازے کھولے۔ مگر بد سختیاں اور  
سے چاکیاں بدلے میں زیادہ ملیں۔ یہ سب کچھ خواتین ہی کو نہیں بلکہ معاشرے کے مفکر کو بھی ملارہے تھے  
بات سے کہ تھی جلد بازی نہ ہوتی تو خواتین کے حقوق بہت اچھے انداز میں ملے اور حالات کی تہری  
سے ورنہ دروں کی چیخ پکار، حال اور مستقبل کے واسطے ان کی یہ گھبراہٹ اور فریاد فلک تک پہنچتی  
اچھے۔ سدھاتی ہے۔ علم و دانش روا نکالے گی۔ انقلاب خواتین جذباتیت کے بجائے علم و دانش پر  
قائم ہوگا۔ جوپ کے دانش وروں کے نظریات کا اظہار اس بارے میں امید افزا ہے۔

یہ دعائی دے رہا ہے۔ جو، اتوں تے مقلدین مغرب کونٹے میں مد ہوش کر رکھا، خود بہل  
مغرب میں شے کے خمار اور آخری، ہم دیکھ چکے ہیں۔ ان کا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔

ویل آہ رینٹ کا نظریہ: لذات فلسفہ حصہ چہارم میں ویل آہ رینٹ نے جنسی ویل  
مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ہم اس کتاب سے اپنے

پتہ چلے گا کہ کچھ اقتباسات لکھیں گے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ مغربی افکار کے  
روئے کار نہیں در جلد بازی کے فیصلوں سے احتیاط کریں۔

سہ ماہی، فصل ہفتم میں "عشق" کا عنوان قرار دے کر کہتا ہے:

”عشق کا پہلا صاف نغمہ، آغاز بلوغ میں شروع ہوتا ہے۔ (PUBERTY) پوجو برٹی جس کے معنی انگریزی میں ”بلوغ“ ہیں، لاطینی اصل کی بنا پر اس کا مطلب ہے ”بالوں کا کن“ وہ عمر جب لڑکے کے بدن پر بال اگنے شروع ہوتے ہیں، خاص کر سینے کے بال جن پر لڑکے ناز دکھاتے ہیں وہ پہرے کے بال ترشوانے میں سی سی پوس (SISYPHUS) کی طرح جبراً اٹھاتے تھے۔ بالوں کی ترش ترش دونوں پہنوں کے بالوں کی چھوٹ۔ بظاہر قوت توالد و تناسل سے وابستہ ہے۔ اس کی جڑیں شکل اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب نشا ط زندگی اپنے عروج پر پہنچتا ہے۔ پھر عورتی کا زمانہ بالوں کے ساتھ اچانک آواز میں سختی بھی لے آتا ہے۔ جنس کی ثانوی صفات ہے جو لڑکوں کے بلوغ پر نہیں ملتی ہوتی ہے۔ اسی عمر میں لڑکیوں کو فطرت کی طرف سے اعضا و حرکات میں لوج و بچک عطا ہوتی ہے جس سے آنکھوں میں خیرگی آتی ہے، ان کے کولھے چوڑے ہو جاتے ہیں کہ ماو۔ نہ عمل آسان ہو۔ سینہ بھر جاتا ہے، پستان ابھرتے ہیں کہ بچوں کو دودھ پینے میں بہولت ہو۔ ان ثانوی خصوصیات کے نہجور کی علت کسی کو معلوم نہیں۔ پروفیسر سٹر لنگ کے نظریے نے کچھ حامی پیدا کیے ہیں، ان کا خیال ہے کہ بلوغ کے دوران نہ صرف تناسلی خلیے لطف پیدا کرتے ہیں بلکہ ایک نوع کے ”ہرمون“ بھی بتاتے ہیں جو خون میں داخل ہو کر جسمانی نفسیاتی تبدیلیاں بھی لاتے ہیں۔ اس عمر میں جسم میں نئی قوت تو جنم لیتی ہی ہے، خود روح اور مزاج و عادات میں بھی ہزاروں قسم کے تاثرات کروٹ لینے لگتے ہیں۔ رومن رولانڈ کے بقول: زندگی کے برسوں میں ایک زمانہ وہ آتا ہے جب جسمانی تبدیلیاں آہستہ سے ایک مرد کا وجود مردی اور ایک عورت میں بدل دیتی ہیں یہی بڑی تبدیلیاں ہیں..... دیری تو انسانی نرم دلوں کو گرم کر کے پگھلاتی ہے اور نرمی و لطافت زور آوروں کی ہوس کو بھڑکاتی ہے۔

لے سی سی پوس ایک قدیم فسادوی بہادر جس کا عبرت ہو۔ تھا مصنف کا مصعب ہے کہ اس زمانہ میں بال کٹوانے اہل مذہب و اس میں بڑی سختی سمجھنا پڑتی تھی کیونکہ خط بنانے کے اوزار دستیاب نہ تھے۔ اس کے باوجود لڑکے صبر و جہد کا مظاہرہ کرتے اور خط بنواتے تھے۔

نہ سنا کہتا ہے:

ب مرد، جھوٹے، مکار، شہینچی خورے، دورے، جھگڑا، لوہوتے ہیں اور تم عورتیں خود پسند، دکھاوے اور خیانت کی عادی ہوتی ہیں۔ ہاں، دنیا میں فقط ایک چیز بلند و مقدس ہے اور وہ ہے ان دونوں ناقصوں کا بندھن.....“

جوڑے کی تلاش، بڑی عمر کے آدمیوں میں، ایک طرف تو مردوں پر تسلط طبی کے سے ہوتا ہے اور دوسری و دل ربائی سے فرار کی خاطر عورتوں کے لیے۔ (مگر یہ مکمل کلیہ نہیں ہے) چونکہ مرد فطری طور پر جنگ جو اور شکاری جانور واقع ہوا ہے اس وجہ سے اس کا عمل مثبت و تملد آوری ہے۔ اس کے لیے عورت، العام سے جو اسے حاصل کرنا چاہیے۔ وہ اسے اڑا لینا، اس کا مالک بننا چاہتا ہے۔ بیوی کی تلاش جنگ و پیکار ہے اور شادی، شریک زندگی، تلاش اور اقدار ہے۔

عورت میں پاک دامنی کی فراوانی توالد و تناسل کی خدمت انجام دیتی ہے، کیونکہ پردہ نشینی واجب جنس میں مددگار ہوتی ہے۔ پاک دامنی، عورت کو قوت بخشی ہے وہ اپنے عاشق کی جستجو میں بات شکلیں اٹھاتی ہے۔ عاشق سے مراد اس کا وہ ساتھی جو اس کی اولاد کے باپ بننے کا فخر حاصل کرے۔

عورت کی زبان سے گروہ اور نوع خواتین کے فائدے کی بات ہوتی ہے اور حلقوم مرد سے فائدے پر گفتگو۔

عشق کے کھیل میں، عورت مرد سے زیادہ ماہر ہے۔ کیونکہ اس کے رجحان میں اتنی شدت ہوتی کہ عقل کی آنکھ اسے دیکھ سکے۔

ڈارون نے مبالغہ کیا ہے کہ ماہ جان داروں میں دنیا کے عشق سے تعلق رکھنے والی مخلوق ہے۔

و پیچ اور کرافٹ ایبیلگ کہتے ہیں:

عورتیں، مردوں کی مکھم تعریفوں کے پیچھے بولتی ہیں، وہ مردوں سے اپنی خواہشات



زیادہ توجہ کی طلب کار ہوتی ہیں، اس کا سبب ان کا جنسی لذت گہرا تعلق ہے۔

لمبرزو کہتا ہے :

عورت میں عشق کا عنصر ایک ثانوی صفت ہے جو اس نے ماں سے لی ہے۔ اس کے علاوہ تمام جذبات و احساسات جو ایک عورت کو مرد سے ملاتے ہیں۔ وہ جسمانی اسباب کے پیدا کردہ نہیں بلکہ اس کے خمیر سے سراٹھاتے ہیں جن میں یہ پس پوشیدہ ہوتی ہے کہ وہ کسی کی تابع اور کسی کی سپردگی میں۔ مرد کی حمایت اسے حاصل ہو۔ وہ اپنے حالات کو اپنے وجود کے معاملات کو اس سے منطبق کرنا چاہتی ہے۔

ول ڈیورینٹ نے "مرد و عورت" کے عنوان سے ایک فصل میں لکھا ہے :

- عورت کا خاص کام تقابلی نوع کی خدمت ہے۔
- مرد کا خاص کام عورت اور بچے کی خدمت ہے۔ اور دونوں اس اساسی کام کے لیے حکمت و تدبیر کے پابند کیے گئے ہیں۔ یہ بنیادی مقصد ہیں۔ مگر آدمی مخلوق بے خبر ہے۔ حالانکہ انسان خوش نصیبی کی روح اس میں پوشیدہ ہے۔۔۔۔
- عورت کی فطرت میں زیادہ رجحان پناہ جوئی کا ہے جنگ طلبی کا نہیں۔ کچھ مادہ مخلوق ایسی دیکھی ہے جس میں جنگ کا اندرونی محرک موجود ہی نہیں ہے۔ مادہ اگر کہیں لڑتی ہے تو اپنی اولاد ہی کے لیے لڑتی ہے۔

● عورت، مرد سے زیادہ صابر ہوتی ہے، اگرچہ بڑے بڑے کام اور بہادری کے معاملے اور زندگی کے بحران میں مرد کی شجاعت زیادہ کام دکھاتی ہے۔ لیکن لگاتار تحمل و برداشت، چھوٹے چھوٹے پریشاں کن حالات اور تکالیف میں عورت کا صبر زیادہ ہے۔ عورت کی جنگ جوئی ایک دوسرے وجود میں ہوتی ہے۔ عورت فوج بند کرتی ہے سپاہی اسے اچھا لگتا ہے۔ دلیری کے مظاہروں میں اس کے اندر ایک عجیب محرک پیدا ہوتا ہے۔

... جسے میچوٹینک ( MASOCHISTIC ) کہا جاتا ہے۔ وہ اس وقت موت پر چوڑھتی ہے۔

● اس کی پرانی خوشی اور قوت و مردانگی سے لذت اندوزی کبھی نئی عورت کے جذبات سرمایہ دوستی پر غالب آجاتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ پاگل بہادر سے بھی شادی کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔

● عورت ایسے شخص سے بخوشی شادی کرنا چاہتی ہے جو شہر کا حاکم ہو۔ اگرچہ آج کل بڑی دفرانہ برداری کم ہو چکی ہے، لیکن اس میں کچھ مردوں کی قوت اور اخلاقی کمزوری کا بھی دخل ہے۔

● عورت کی توجہ گھریلو معاملات پر مرکوز رہتی ہے، اس کا ذہنی پس منظر عموماً اس کا گھر ہوتا ہے۔

● عورت، فطرت کی طرح بہت گہری ہے۔ مگر گہری طرح اپنے اندر محدود۔

● عورت کا خمیر اسے پرانے رسم و رواج سے باندھ رکھتا ہے۔

● عورت نہ تجربہ کاروں کے ذہن میں آتی ہے نہ عادت میں۔

— اس میں بڑے شہروں کی عورت مستثنیٰ ہے۔ وہ اگر عشق میں آزادی چاہتی ہے تو کسی وجہ سے ذمہ دار مرد کی شادی سے اس کی مایوسی ہے۔

● اگر جوانی میں کبھی اسے سیاسی اصطلاحات اور سیاسی باتوں سے دلچسپی رہی ہو، تو وقت بھی وہ اپنے ہی جذبات کو تمام انسانوں میں پھیلاتی ہے۔ اور ایک وفادار شوہر دیتے ہی وہ اپنی تمام سرگرمیاں چھوڑ بیٹھتی اور شوہر کو وفاداری کا جذبہ زیادہ دلا کر گھر کا بند بٹاتی ہے۔

● عورت، سوچے بغیر، یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ اچھے قسم کے اصلاحی کام گھر سے شروع ہوتے ہیں۔

● جب عورت اپنے سرگردان مفکر شوہر کو گھر کا فدائی، اور اپنے بچوں کا پابند بنالیتی ہے تو اس میں اس کا سبب احساس حفظ و بقا، نوع ہوتا ہے۔

● عورت کا عشق گھر اور بچوں سے ہوتا ہے۔ اگر وہ ان کی نگہداشت میں کامیاب ہوگئی تو اسے دولت و حکومت کی پروا نہیں رہتی۔ جو لوگ اس نظام کو بدلنا چاہتے ہیں، یہ عورتان کا مذاق اڑاتی ہے، آج کی عورت فطرتاً گراں دان اور بچوں کی دیکھ بھال میں کمزور نظر آتی ہے تو اس کا سبب اس کا شہری ہونا ہے وہ اپنی فطرت کو بھول گئی ہے لیکن فطرت کی شکست دائمی نہیں ہوتی۔ وہ جب چاہے اپنے اندر کے ذخیروں اور دہنیوں کے سہارے پلٹ سکتی ہے۔

● دنیا میں پھیل ڈ اور عدد کے اعتبار سے بہت سی قومیں اور نسلیں ہم سے زیادہ موجود ہیں۔ ان قوموں نے اپنی فطرت کے قوانین محفوظ اور باقی لا محدود رکھے ہیں۔

زن و مرد کا یہ مختصر سا تعارف اختلاف جو ہم نے اس مسئلہ کے ماہرین کے نظریات کی روشنی میں پیش کیا۔

”از تفاوتہا“ نامواری کے راز پر کچھ تاریخی عوامل کا جائزہ بھی لینا چاہتا تھا کہ کس حد تک اس کے اثرات ہیں؟ مگر مطالب کا دامن موضوع سے آگے نکل جا کے گا اس لیے نظر موڑتا ہوں، گفتگو کے ضمن میں کچھ باتیں روشن ہوتی جائیں گی۔

لے ایک مدت کا سروے اور زمین پر پھیلی ہوئی کرداروں قبول اور سنوں کو چھوڑ کر نتائج پر بحث اور ان پر اپنے فلسفہ و قوانین کی عام بنیاد رکھنا غلط ہے۔

## آٹھواں حصہ :

### مہر اور نان و نفقہ

- مہر و نفقہ، عورت کی کینٹری کے دور کا بقیہ ہے؟
- قرآن مجید نے مہر کو مرد کی طرف سے عورت کو ہدیہ اور اس کے خلوص کی نشانی کہا ہے۔
- مہر کا نقطہ اول، فطرت کا وہ تقاضہ ہے جو عشق کی بنیاد پر مرد اور عورت سے دو الگ الگ چیزیں چاہتا ہے۔
- اسلام نے مہر کے بارے میں جاہلیت کی رسمیں منسوخ کر دیں۔
- عورت کا عشق اگر خود اس کی طرف سے شروع ہو تو عشق بھی شکست کھاتا ہے اور عورت کی شخصیت بھی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔
- ہمیں ان مردوں کی اصلاح کرنا چاہیے جو اسلامی قانون پر عمل نہیں کرتے۔ قانون کو خراب کرنے کی ضرورت کیا ہے؟
- مہر کا سسٹم اسلام سے مخصوص ہے، اس کو ہر سسٹم سے الگ ہو کر دیکھنا چاہیے۔
- یورپ نے سو سال اور اسلام نے چودہ سو برس پہلے عورت کو اقتصادی آزادی دی ہے۔
- فقہ اسلامی کے نقطہ نظر سے نفقہ کی تین قسمیں۔
- یورپ کی خواتین شہین کی شکر گزار ہوں، قانون سازی کی نہیں۔



اسلام نے اقتصادی آزادی دی، خانہ بربادی نہیں۔

عورت، سرمایہ مرد سے کم حاصل کرتی ہے اور سرمایہ استعمال زیادہ کرتی

آج کا مرد چاہتا ہے، نفقہ کا حق ختم کر کے، عورت سے فکری قید کا انتقام لے

عورت کا حق نان و نفقہ شوہر سے ختم کرنا، سکا۔ یہ مردوں کی راہ ہموار

کرنا ہے۔

کیا، منشور حقوق انسانی نے عورت کی توہین کی ہے؟

## مہر اور نفقہ

①

شادی کے مرحلے میں مرد "مہر" مانے۔ اور اپنی ملکیت ل یا املاک میں سے کچھ رقم بڑی کے باپ یا ماں کو دے۔

جب تک میاں بیوی کے تعلقات باقی ہیں، شوہر، بیوی بچوں کے تمام اخراجات پوسے کرے۔

خانگی رشتوں کے بارے میں انسانوں کی یہ پرانی رسم چلی آرہی ہے۔ اس رسم کی بنیاد کیا ہے؟ یہ رسم کیوں اور کیسے شروع ہوئی؟ یہ مہر کی مدد کیا ہے؟ عورت کو نفقہ دینا، یعنی چہ؟

اگر زن و مرد، اپنے فطری و انسانی حقوق سے بہرہ ور ہوں اور ان میں عادلانہ و انسانی رشتے برقرار ہوں، بیوی سے انسان جیسا رویہ حکم نہ ہو تو بھی مہر و نان و نفقہ کا سوال پیش آسکتا ہے؟ ایسا تو نہیں کہ مہر و نان و نفقہ اس زمانے کی یادگار ہو جب بیوی شوہر کی ملوک ہو کرتی تھی؟

عدل اور حقوق انسانی کی برابری۔ خصوصاً بیسویں صدی کا۔ تقاضہ یہ ہے کہ مہر و نان و نفقہ کا سسٹم ختم کیا جائے۔ شادیاں، بلا مہر ہوں، نفقہ کا مسئلہ ختم کیا جائے، عورت خود اپنی مالی ذمہ داریاں برداشت کرے، اولاد کے معاملات میں بھی دونوں برابر کے کنفیسن ہوں۔

تو ہم مہر سے بات شروع کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں، مہر، کیسے پیدا ہوا، اس کا فلسفہ کیا ہے

ورہ میں معاشرتی علوم نے مہر کی وجہ کیا بیان کی ہے؟

**مہر کا تاریخی پس منظر:** کہا جاتا ہے: قبل از تاریخ، انسان وحشیانہ زندگی گزارتا تھا، قبیلوں کی صورت میں رہتا، اور نامعلوم اسباب کی بنا پر اپنے خون شریک سے شادی کرنا جائز نہیں جانتا تھا۔ شادی کے خواہش مند جوان، مجبوراً دوسرے قبیلے سے معشوقہ و شریک زندگی مانگے جاتے تھے۔ ان دنوں مرد اولاد کی پیدائش میں اپنا کردار نہیں جانتا تھا۔ اسے واقفیت نہ تھی کہ جنسی شریک، پیدائش اولاد میں موثر ہے۔ اولاد کو بیوی کی اولاد سمجھتے تھے اپنی اولاد نہیں جانتے تھے۔ نسب، باپ کے بجائے ماں کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ بچوں میں آپا سے مشابہت محسوس ہو کر تے تھے مگر اس کی وجہ معلوم نہ تھی۔ ان کے نزدیک مرد قوت تولید سے محروم مخلوق تھی، شادی کے بعد شوہر ایک ضمنی شخصیت کے طور پر بیوی کے ساتھ اسی کے قبیلے میں رہتا اور بیوی اس کی جسمانی قوت اور رفاقت سے فائدہ اٹھاتی تھی۔ اس عہد کو ماں کی حکومت کا دور کہتے ہیں۔

جلد ہی مرد کو عمل تولید میں اس کا حصہ معلوم ہو گیا اب وہ فرزند کا اصل مالک بن گیا۔ اسی وقت سے اس نے عورت کو اپنا تابع بنالیا اور خود گھر کا سربراہ بن گیا۔ یہاں سے "باپ کی حکومت" کا عہد شروع ہوا۔

اس پیرائے میں بھی خونی رشتوں سے شادی جائز نہ تھی۔ مرد کو دوسرے قبیلے میں بیوی ڈھونڈنا، بچہ بے اپنے قبیلے میں لانا پڑتا تھا۔ قبائل میں عموماً جنگ تھی لہذا، لڑکی کو بے بجا گناہ پڑتا، یعنی جو، نوجوان لڑکی، لڑکے کو پسند آتی اسے اس کے قبیلے سے نکال دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ جنگ کے بجائے صلح کا راج ہوا، اور مختلف قبائل مل جل کر جینے کے دھمک سیکھ گئے۔ اب لڑکی کو بھگالے جانے کی ضرورت نہ رہی۔ لڑکا اپنی پسندیدہ لڑکی حاصل کرنے، دوسرے قبیلے جاکر لڑکی کے باپ کی خدمت مزدوری کرتا، باپ اس کی محنت مزدوری کے بجائے اپنا داماد بنالیتا اور لڑکے کا اسے اپنے قبیلے لے جاتا۔

دولت میں اضافہ ہوا تو مردوں نے سوچا، مدتوں منگیتر کے باپ کی خدمت کرنے بہتر ہے کہ مناسب ہدیہ لے پیش کر کے منگیتر لے لی جائے۔ یہاں سے "مہر" ایجاد ہوا۔ اس ترتیب کی بنیاد پر پہلے دور میں شوہر، بیوی کا کچھ لگو اور خدمت گار تھا عورت مرد پر حکومت کرتی تھی۔ اس کے بعد، حکومت مرد کے ہاتھ آئی، مرد دوسرے قبیلے سے عورت اٹھالتے تھے۔ تیسرا دور وہ آیا جب لڑکا منگیتر کے گھر جاتا، باپ سے مل کر بات کرتا اور منظوری کی صورت میں یہ لڑکا خدمت گاری بجاتا اور محنت مزدوری کر کے ہونے والے سسرے کو رانسی کرتا تھا۔ چوتھا مرحلہ وہ تھا جہاں مرد ایک معین رقم "پیش کش" کے طور پر لڑکی کے باپ کو دیتا تھا، یہاں سے "مہر" کا سلسلہ شروع ہوا۔

کہتے ہیں: مرد نے جب "ماں کی حکومت" کا دور ختم کر کے "پدر شاہی" کا عہد شروع کیا تو عورت کم از کم، مزدور بنائی گئی، اسے ایک اقتصادی ذریعہ سمجھ لیا گیا، اس سے کبھی کبھی جنسی تسکین بھی حاصل کی جاتی تھی۔ اس نے عورت کو معاشرتی و اقتصادی آزادی نہیں دی اس کی محنت مزدوری کا ثمر، باپ یا شوہر کو ملتا تھا۔

○ عورت اپنی پسند سے شوہر نہیں چن سکتی تھی۔

○ عورت خود مختار اقتصادی و مالی حیثیت کی مالک نہ تھی۔

دراصل مہر جیسی چیز اور نان و نفقہ کے نام سے جو اخراجات ہوتے تھے، اس کے حصے میں بیوی سے یک جانی کے زمانے تک جو محنت مزدوری لیتا تھا اس کا عوض نہ تھا۔

انسانی معاشرے کی ترقی کا پانچواں دور جسے علوم معاشرہ کے ماہرین

## مہر - نظام قانون اسلامی میں

نے فراموش کر دیا اور اہل نظر خاموش گذر گئے۔ یعنی وہ دور جب شادی کے وقت اپنی طرف سے براہ راست عورت کو کچھ "پیش کش" کرنے لگا۔ لڑکی کے ماں، باپ اس "پیش کش" پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ عورت پیش کش قبول کرتے ہی اپنی معاشرتی



۱۔ اقتصاد کی آزادی محفوظ کر لیتی ہے۔

اونا، وہ اپنا شوہر خود اپنے ارادے سے منتخب کرتی ہے، ماں اور باپ کے ارادے سے نہیں۔

نایا، جب تک باپ کے گھر میں رہے اور جب سے شوہر کے گھر چلے کسی کو حق نہیں کہ اس سے خدمت گاری لے اور استثمار کرے۔ محنت مشقت سے جو کمائے وہ اسی کی ملکیت ہے۔ دوسرے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے حقوق کے معاملات میں کسی سربراہ مرد کی محتاج نہیں ہے۔

مرد، عورت سے فائدہ اٹھانے کے معاملے میں فقط یہ حق رکھتا ہے کہ رشتے کی بد میں اس کے وصال سے بہرہ مند ہو۔ اس پر ذمہ داری ہے کہ جب تک رشتہ ازدواجی جاتی ہے اس سے وصال کرتا رہے اور اس کی زندگی کی نگہداشت رکھے۔

اس نظام کو قرآن نے قبول کیا ہے۔ اس نے شادی کی اساس یہی مانی ہے۔ قرآن کریم میں متعدد آیتیں بتاتی ہیں کہ۔ مہر۔ عورت کا مال ہے کسی کا اس پر حق نہیں

مرد کو شادی کی پوری مدت تک بیوی کے اخراجات کی ذمہ داری پوری کرنا ہوگی اس زمانے میں محنت مزدوری کا کم کاج کر کے جو کچھ کھائے وہ اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ باپ یا شوہر کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

یہاں پہنچ کر ”مہر و نفقہ“ معائنہ جاتا ہے۔ جب مہر باپ کی ملکیت ہوتا تھا، اس وقت لڑکی اپنے شوہر کے گھر میں لونڈی کے طور پر آتی اور شوہر اس سے ہر قسم کا فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس وقت مہر کا فلسفہ تھا، باپ لڑکی خرید اور ضروری اخراجات نان و نفقہ کا فلسفہ تھا وہ اخراجات جو ہر مالک اپنی مملوکہ چیز پر کیا کرتا ہے۔ یہ صورت کہ باپ کو کچھ نہ دیا جائے، شوہر کو استثمار کا حق نہ ہو، بیوی سے اقتصادی فوائد نہیں لے سکتا بیوی، اقتصادی پہلو سے مکمل طور سے آزاد ہے۔ اسے حقوق کے لحاظ سے بھی کسی

”مہر و نفقہ“ سربراہی و سرپرستی و اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر مہر دینا و رمان

نایا، جب تک باپ کے گھر میں رہے اور جب سے شوہر کے گھر چلے کسی کو حق نہیں کہ اس سے خدمت گاری لے اور استثمار کرے۔ محنت مشقت سے جو کمائے وہ اسی کی ملکیت ہے۔ دوسرے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے حقوق کے معاملات میں کسی سربراہ مرد کی محتاج نہیں ہے۔

نایا، جب تک باپ کے گھر میں رہے اور جب سے شوہر کے گھر چلے کسی کو حق نہیں کہ اس سے خدمت گاری لے اور استثمار کرے۔ محنت مشقت سے جو کمائے وہ اسی کی ملکیت ہے۔ دوسرے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے حقوق کے معاملات میں کسی سربراہ مرد کی محتاج نہیں ہے۔

نایا، جب تک باپ کے گھر میں رہے اور جب سے شوہر کے گھر چلے کسی کو حق نہیں کہ اس سے خدمت گاری لے اور استثمار کرے۔ محنت مشقت سے جو کمائے وہ اسی کی ملکیت ہے۔ دوسرے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے حقوق کے معاملات میں کسی سربراہ مرد کی محتاج نہیں ہے۔

نایا، جب تک باپ کے گھر میں رہے اور جب سے شوہر کے گھر چلے کسی کو حق نہیں کہ اس سے خدمت گاری لے اور استثمار کرے۔ محنت مشقت سے جو کمائے وہ اسی کی ملکیت ہے۔ دوسرے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے حقوق کے معاملات میں کسی سربراہ مرد کی محتاج نہیں ہے۔

نایا، جب تک باپ کے گھر میں رہے اور جب سے شوہر کے گھر چلے کسی کو حق نہیں کہ اس سے خدمت گاری لے اور استثمار کرے۔ محنت مشقت سے جو کمائے وہ اسی کی ملکیت ہے۔ دوسرے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے حقوق کے معاملات میں کسی سربراہ مرد کی محتاج نہیں ہے۔

اس کی نظر میں تاریخ مشین کا نام ہے جب اسے کچھ کھاتے کو نہ دیا جائے (فیڈ نہ کیا جائے) پھٹتی ہی نہیں۔ اگر جنسی مسائل کے گیسر میں گیا تو انسانیت و تاریخ بشریت اپنے تمام ثقافتی و صنعتی، اخلاقی و مذہبی، تجلیوں اور روحانی جاہ و جلال سمیت صرف جنس کی بدلتی صورتوں میں کھیل کھلونے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ اور اگر . . . سرداری اور برتری کے گیسر میں چڑ گیا تو سرگذشت بشریت ان کے نزدیک کیسر، خون ریزی و بے رحمی ہے۔ اہل حرب گذشتہ و سبھی عہد میں مذہب اور مذہب کے نام لیواؤں کے ہاتھوں بڑے شکنجے میں رہے۔ بہت دکھا اٹھا لے زندہ آگ میں ڈالے گئے اسی وجہ سے لوگ خدا اور مذہب، کائنات کی پورے کھینچنے والی چیز سے بھی ڈرتے ہیں۔ چنانچہ تمام علمی علامات و آثار دیکھنے کے باوجود، طبیعت کے ہاتھ بندھنے اور کائنات کے لیے ایک مذہب ہونے کا اعتراف یا "علت غالی" کے وجود کا اقرار کرنے کی جرات نہیں کرتے۔

ہم ان شاعریں سے یہ نہیں چاہتے کہ پوری تاریخ میں پھیلے ہوئے پیغمبران خدا کو ان پیغمبروں سے عدت و انسانیت کا لغو بند کیا، انحرافات کا مقابلہ کیا، ان مقابلوں کے اچھے نتائج حاصل کیے، ہم یہ منوانا نہیں چاہتے۔ مگر اتنا تو ضرور چاہتے ہیں کہ یہ لوگ کم از کم طبیعت کے باخبرانہ و آگاہانہ نظر انداز نہ کریں۔

تعلقات مرد و زن کی تاریخ میں یقیناً بہت ظلم اور بڑی بے رحمیاں ہوئی ہوں گی۔ قرآن مجید نے اس بے رحمی کی بہترین مثالیں بھی بیاں کی ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سراسر تاریشت میں قساوت اور سختی کا انداز ہی رہا۔

**مہر کا حقیقی فلسفہ :** ہمارے عقیدے میں "مہر" ایک ماہرانہ تدبیر کا نتیجہ ہے۔ آغاز فطرت و تخلیق سے زن و مرد کے روابط اور ان کے رشتے کو زیادہ مستحکم کرنے کے واسطے "مہر" ایجاد کیا گیا۔

ہر خلقت میں زن و مرد کا مسئلہ عشق الگ الگ ہے عورت کا عشق کچھ اور مرد کا

کا ہے اور مرد کا کچھ اور۔ مہر کی ضرورت و ایجاد اسی مرحلے میں ہوئی۔ صوفی، اس قانون کی پوری ہستی میں کارفرما مانتے ہیں۔ ان کا تو عقیدہ ہے کہ عشق و جذبہ و انجذاب تمام موجودات و مخلوقات پر حکمران ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ موجودات میں سے ہر ایک کا کام الگ ہے ذمہ داری الگ ہے۔ اسی وجہ سے ان کے مقام میں فرق ہے۔ ایک جگہ موز سے ایک کے لیے ساز، فخر الدین عراقی نے کہا:

ساز طرب عشق کہ داند کہ چہ است؟ عشق کے طرب انجمن ساز کو کوئی کیا جانے  
گزر زخم آں نہ فلک اندر رنگ و باشت بس مختصر ہے کہ اس کے زخم کی چھیر نے تو  
آسمان رواں کر رکھے ہیں۔

لازیت دریں پردہ کہ گران رہ شناسی اس پردے کے پیچھے ایک راز ہے گروہ راز  
دانی کہ حقیقت لہجہ در بند مجاز است معلوم ہو جائے تو سمجھ میں آئے گا کہ حقیقت کو  
مجاز کا پابند کیوں رکھا گیا ہے۔

عشق است کہ ہر دم بدگر رنگ در آید عشق بر آن سے رنگ میں جلوہ نما ہوتا ہے۔  
ناز است بجائی و بیکٹائی نیاز است وہی ایک جگہ ناز اور دوسری جگہ نیاز نظر آتا ہے۔

در صورت عشق چہ در آید ہمہ سوز عاشق کے سراپا میں جو کچھ سما یا ہوا ہے  
در کوت مشوق چہ آید، بہ نیاز است وہ "سوز" ہے اور مشوق کے لباس میں  
"ساز" ہی ساز ہے۔

زن و مرد کے اختلاف پر گفتگو کے دوران گذشتہ صفحات میں ملاحظہ ہو، ہم نے کہا ہے زن و مرد کے جذبات کی نوعیت اور ایک دوسرے کے بارے میں احساسات ایک طرح کے نہیں ہیں۔ قانون تخلیق نے حسن و غرور و بے نیازی، عورت کے حصے میں۔ اور۔ نیاز مندی و طلب، عشق و تغزل مرد کے حصے میں رکھا۔ اسی تقسیم کی وجہ عورت



کے کمزور پہلو کی تلافی مرد کی بدنی قوت سے ہوگئی۔ ترازو کے پلے برابر ہو گئے جب ہی تو مرد و طلب کے لیے عورت کے دروازے پر جاتا ہے۔ معاشرہ شناس ماہرین کے تادمہ شاہی "عہد میں بلکہ" پدر شاہی" دور میں بھی یہی دیکھا اور بتایا گیا ہے کہ مرد نے عورت کے گھر جا کر رشتہ مانگا ہے۔

دانشور حضرات کہتے ہیں:

مرد، عورت سے زیادہ سہوانی ہے۔ اسلامی روایت میں اس کے برعکس ہے۔ لیکن عورت بہ نسبت مرد کے جنسی خواہش پر زیادہ قابو رکھتی ہے۔ وہ زیادہ خود دار پیدا ہوئی ہے۔ دونوں باتوں کا نتیجہ ایک ہے یعنی بہر حال مرد اپنے خیمہ کے مقابلے میں عورت کی بہ نسبت زیادہ کمزور ہے۔ اس خصوصیت نے عورت کو موقع دیا ہے کہ مرد کے پیچھے چلنے سے بچے اور آسانی سے اس کے قابو میں نہ آئے، اس کے برخلاف، مرد کو فطرت مجبور کرتی ہے کہ عورت سے نیاز مندی کا اظہار کرے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے ذرائع استعمال کرے، ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ جو اس کی رضا اور رفاقت حیات پر آمادگی کی راہ ہوا کرتا ہے وہ ہے "ہدیہ" جو اس پر شمار کیا جائے۔

جنس نر کے افراد، رفاقت کے لیے افراد جنس مادہ کا تعاقب کیوں کرتے اور باہم رفاقت کیوں رکھتے ہیں؟ کیوں آپس میں لڑتے اور خون ریزی کرتے ہیں؟ اس کے مقابلے میں جنس مادہ نے لالچ، حرص اور نر کے ساتھ رفاقت کے لیے از خود رفتگی ظاہر نہیں کی۔ اس کا سبب دونوں جنسوں کے فطری تقاضے مختلف ہیں ایک نہیں ہیں۔ نر میں ہمیشہ تقاضا و طلب کا جذبہ رہتا ہے جنس مادہ میں یہ جذبہ نہیں ہے۔ جنس مادہ، نر کے لالچ اور از خود رفتگی کو دیکھ کر اس کے پیچھے نہیں دوڑی بلکہ ایک قسم کی بے نیازی اور بے خیالی کا اظہار کرتی رہتی ہے۔

مہر کا حیا اور عورت کی پاک دامنی سے گہرا رشتہ ہے۔ عورت اپنے فطری الہام

... جہان بچی ہے کہ اس کی عزت و حرمت اس پر موقوف ہے کہ وہ اپنے تئیں گھر پر کے اختیار میں نہ دے دے۔۔۔۔۔

یہی سبب ہیں کہ عورت باوجود جسمانی نزاکت کے مرد کو درخواست گزار کے بنے آستانے پر کھینچ بلاتی ہے۔ مردوں کو رفاقت میں برسر پیکار کھڑا کرتی، اور خود اس درشتی کے بہانے مرد کے پیچھے سے نکل جاتی ہے۔ کتنے مجنون ہیں جو لیلادوں کے بے سرگرداں ہیں، اور وہ اس وقت تک کسی سے رفاقت کا بندھن نہیں باندھتی کہ وہ اتنے اپنے دامن تک نہیں آنے دیتی جب تک اس سے عطیہ و پیش کش، صداقت و سندی میں حاصل نہ کر لے۔

کہتے ہیں، کچھ وحشی قبیلوں میں یہ دستور تھا کہ جو لڑکی کئی میرواروں اور عاشقان سے دوچار ہوتی وہ "ڈول" کا پیام بھیجتی تھی۔ وہ رقیب آنے سے مانع زور کرتے جو شخص موت یا شکست سے بچ جاتا تھا وہی اس لڑکی کے شوہر بننے کی اہلیت رکھتا تھا۔

کچھ روز ہوئے کہ تہران کے روزناموں میں خبر چھپی تھی کہ ایک لڑکی نے اپنے دو سنگاروں سے "ڈول" کو کہا۔ وہ دونوں اس کے سامنے چھری بجنے لگے کہ ایک دوسرے سے پڑے۔

جن کی نظر میں قوت فقط زور و بازو کا نام ہے اور زن و مرد کے رشتے شروع سے عورت پر ظلم اور استعمار مرد پر منحصر ہے۔ یہ لوگ باور نہیں کر سکتے کہ عورت و نر ایک جنس ہیں درشت و سخت گیر مرد کو یوں ایک مرد کے خون کا پیاسا بگتی ہیں، جو شخص عورت کی تخلیق میں ماہرانہ تدبیر میں اور عجیب عجیب نسوانی قوتیں سمجھ سکتا ہے اسے معلوم ہے کہ باور آنے کا کہ بے شک وجود زن میں چھپا رکھی ہیں اور ایسے امور عجیب نہیں ہیں۔

عورت، مرد پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ عورت کی مرد پر اثر آفرینی مرد کے اثرات سے زیادہ ہے۔ ہنر مرد کی نمود اس کی دلاوری و بہادری اس کی شخصیت کا ابھار اور بڑا پن بہت کچھ عورت کی خوبصورت خود داری و بہت افزائی اس کی پاک دانی و دنیا کی بدولت ہے۔ مرد کی بڑائی عورت کی گراں بہا ہونے کی حیثیت ہے۔ ہمیشہ عورت نے مرد کا کردار بنایا ہے وہ مرد جس کے معاشرے سے تعلق ہے اور جب پاک دانی و حیا اور خود داری، عورت سے الگ ہو جاتی ہے اور عورت جب بھی مرد کے کردار کا پرکھنے کے لیے ہوتی ہے تو سب سے پہلے تو وہ اپنا مہر کا استعمال غلط کرتی ہے۔ پھر مرد اپنی مردانگی بھول جاتا ہے اور معاشرہ کا ایوان ڈھس جاتا ہے۔

عورت کی وہ قوت جو پوری تاریخ میں اپنی شخصیت کو محفوظ رکھ سکی، اور مرد کے پیچھے دوڑنے سے روکتی رہی اور مرد کو اپنے آستانے پر طلب گار کی حیثیت سے طلب کرتی رہی جس نے اپنی خاص مردوں کو رقابت و جنگ میں ابھایا، وہ مقابلے میں جان کی بازی لگا چکے، حیا و رشتہ کو اپنا گرو بنائے، اپنا بدن لوگوں کی نگاہوں سے چھپائے اور اپنے منہ پر اسرار بٹھا کر رہے۔ مرد کو الہام اور اس میں عشق کو جنم دے۔ اسے شجاعت و ہنرمندی میں شخصیت کے درجے پر پہنچائے، مرد میں غزل کا جذبہ، خاکساری و ناجہیزی کا احساس پیدا کر کے پتے سامنے جھکائے۔ اس عالم میں مرد کو خوشی بھی ہو۔ عورت کی یہی قوت مرد کو تادی کے وقت مہر کے نام سے عطیہ و ہدیہ پیش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

مہر، وہ عمومی آئین کی قانونی نشی ہے جس کی تحریر تین تخلیق میں قلم قدرت نے فطرت کے قلم سے لکھوائی ہے۔

**قرآن میں مہر** | ہم نے کہا ہے کہ سماج کے پانچویں دور میں مہر کی ایک شکل ابھر کر سامنے آئی، یہ صورت فطرت کی ایجاد ہے، قرآن مجید نے سماجی آلودگیوں سے اسے پاک صاف کر کے فطرت کا صحیح روپ نکھار دیا، قرآن کریم

بے مثال لطافت و خوش اسلوبی کے انداز میں کہتا ہے:

وَالْوَلِيُّ لِلنِّسَاءِ صَدَقْتَهُنَّ نَحْلَةً (النساء ۴)

یعنی عورتوں کا مہر جو انھیں کا ہے وہ باپ یا بھائی کا اس سے کوئی تعلق نہیں (عطیہ و پیش کش کے طور پر خود ان کو دے دو۔

قرآن مجید نے اس چھوٹے سے جملے میں تین نکتوں کی طرف اشارے کیے ہیں:

۱۔ مہر کو مہر کے بجائے "صَدَقَہ" (دال پر پیش) کے نام سے یاد کیا۔ صَدَقَہ کا وہ صدق ہے۔ مہر کو صَدَقَہ اس لیے کہا کہ وہ مرد کے رشتے کو سچا قرار دیتا ہے تا ف کے تفسیر نگار (زمخشری) جیسے حضرات نے اس نکتے کی تشریح کی ہے۔ اور رافع عثمانی کے بقول (مفردات الفاظ القرآن) "صَدَقَہ" (دال پر زبر) کو صَدَقَہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ایمان کی دلیل ہے۔

۲۔ صدقات "ہن" میں ضمیر کے الحاق نے یہ اشارہ کیا ہے کہ مہر براہ راست عورت کو ملتا ہے۔ ماں باپ کا کوئی حصہ نہیں کہ انھوں نے دودھ پلایا، پالا پوسا، بڑا کیا لہذا یہ بچہ کا عوضانہ ہو۔ نہیں۔

۳۔ آیت میں "نَحْلَہ" سے مزید توضیح ہو گئی کہ مہر ہدیہ اور پیش کش کے علاوہ کوئی نہیں قبول کر سکتا۔

**حیوانات میں احساسات کا فرق** | انسان ہی نہیں، تمام جانداروں میں جہاں بھی دو جنسی کا عمل موجود ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ ہے اس کے بات و احساسات میں نیاز مندانه رجحان زیادہ ہے اسی وجہ سے وہ اپنی ضرورت کے لئے مادہ کی خوشی اور رضا مندی حاصل کرنے کی خاطر گے بڑھے۔ اسی بنیاد پر دونوں کے تعلقات میں برابری ہو۔ جن میں نر اپنی طاقت و قوت کی وجہ سے غلط فائدہ



نہ اٹھانے پائے لے عاجزی و فروتنی میں رہنا چاہیے۔

**غیر شرعی شادیوں میں بدیہ اور کھنے:** شرعی طور پر ہونے والی شادیوں کے خاص ربط نہیں غیر شرعی شادیوں

میں بھی جہاں ایک دوسرے کے وجود سے آزاد لطف اندوزی اور آزاد عشق بازی کی جاتی ہے۔ وہاں بھی مرد کو ایک بدیہ نذر کرنا پڑتا ہے۔ اتفاق سے اگر کہیں چائے کافی یا سمٹا کو دل پیاسے تو موٹل کابل مرد کو ادا کرنا فرض ہے۔ مرد کے لیے عورت پیسے خرچ کرے تو مرد اپنے لیے ایک قسم کی توہین سمجھتا ہے۔ مرد کے لیے عیش پرستی کے لیے امکانات اور دولت مند ہونا ضروری ہے۔ عورت کی عیش پرستی بدیوں اور تحفوں کے جمع کرنے کا ایک بہانہ ہے۔ غیر قانونی اور ناجائز روابط زن و مرد میں یہ رسم موجود ہے۔ اس کی بنیاد زن و مرد کے غیر مشابہ جذبات ہیں۔

**فرنگی کا عشق اس کی شادی سے بہتر ہے:** مغربی دنیا میں جہاں حقوق

”گھریلو زندگی“ کے حقوق کو فطری طور طریقوں سے دور کر دیا گیا ہے۔ جہاں قانون فطر کے خلاف کوشش جاری ہے کہ زن و مرد کو ایک دوسرے کا مشابہ بنا دیا جائے۔ اور گھریلو زندگی میں بیوی اور شوہر کو برابر کا مشابہ کر دیا اپنا ہوگا۔ جہاں عشق کا آزاد قدم گھڑیل داخل ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود زن و مرد کے مقررہ قوانین فطرت اپنی رفتار سے باہر نہیں جاسکے وہاں اب بھی مرد اپنا فطری فریضہ ادا کرتا ہے۔ یعنی اظہار نیاز، طلب و درخواست، دولت نچا کرنا، دولت نذر کرنا۔ عورت کو بدیہ پیش کرنا، بلکہ اس کے اخراجات برداشت کرنا۔ آج بھی یورپ میں رائج ہے۔

فرنگی شادی میں مہر کا وجود نہیں ہے۔ نفقہ و اخراجات کا بوجھ بیوی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ یعنی فرنگی معائنہ، فرنگی شادی سے فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

مہر ایک مثال ہے جو ہمیں اس گہرائی تک پہنچاتی ہے کہ زن و مرد غیر مشابہ انداز میں ہوتے ہیں۔ اور قانون تخلیق نے فطری و طبیعی صلاحیتوں کے لیے غیر مشابہ دستاویز لکھ رکھوں میں دس دی ہے۔

## مہر اور نفقہ

(۲)

گذشتہ فصل میں مہر کی ایجاد کا فلسفہ اور اس کی علت کا بیان ہم نے کیا ہے اور بتایا کہ مہر کی ایجاد کا سبب دونوں جنسوں کے رشتے قانون تخلیق کے ہاتھوں دو الگ الگ ذمہ داریوں کا باعث ہیں۔ یہ بھی آپ جان چکے کہ مہر "مرد کے نرم اور محبت آمیز جذبات کی پیداوار ہے۔ سخت اور مالکانہ احساسات کا اس میں دخل نہیں۔ عورتوں کی طرف سے جو جس زیادہ اثر ڈالتی ہے وہ اس کی خاص خود داری ہے یہاں اس کی کمزوری یا ارادے کی ناپختگی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مہر قانون تخلیق کی طرف سے عورت کی قدر بڑھانے کے لیے اور اسے ایک بلند درجہ دینے کے لیے ہے۔ "مہر" عورت کو شخصیت عطا کرتا ہے "مہر" کی حقیقی قیمت عورت کی نظر میں اس کی مادی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔

**جاہلیت کے رسم و رواج**  
اسلام نے منسوخ کر دیے

قرآن مجید نے مہر کے بارے میں جاہلیت کی رسمیں منسوخ کر دیں اور اسے اپنی پہلی اور فطری حالت میں بحال کر دیا۔

جاہلیت میں ماں باپ مہر کو حق زحمت اور اپنا حق "شیر بہا" جانتے تھے۔ تفسیر کشاف وغیرہ میں لکھا ہے کہ عرب میں لڑکی کی ولادت پر مبارک باد دینے والے کہتے تھے "حنیئاً لک"۔

"لک" شیر بہا "وہ رقم ہے جو دو لہا لڑکی کے والدین کو پیش کرتا ہے۔ یعنی "دودھ کی قیمت" یہ رسم اب بھی عراق اور دوسرے علاقوں میں بطور رسم جاری ہے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بخاری میں ۵۳۸ھ میں جن کی تفسیر کا نام "الکشاف من حقائق التشریہ وایوان الاقاویل فی وجوہ تاویل" یہ عربی تفسیر بڑی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور الکشاف کے نام سے مشہور ہے۔

منجھہ "۔ یعنی۔ فرائض دولت کی اساس مبارک ہو۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ خدا کی پناہ لے لو یا میں اور اس کا مہر پائیں۔

جاہلیت میں باپ و دہ بھول تو بچائی۔ چونکہ ولی ہوتے کے دعویدار تھے۔ یہ خدمت دوسروں کی کہ حق انھیں حاصل ہوتا تھا۔ لہذا وہ اپنی پسند کا شوہر لاتے تھے۔ لڑکی کی رائے ضروری نہ تھی۔ اسی طرح مہر خود دیتے تھے۔ لڑکی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ لڑکیوں کا بہانہ کرتے تھے یعنی ایک مرد دوسرے مرد سے کہتا تھا وہ اپنی لڑکی یا بہن دیتا ہے بشرطیکہ فرقی مقبول بھی نہ لڑکی یا بہن اس کے ازدواج میں دے۔ اس طرح ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر فرار پاتی تھی اور یہ مہر باپ یا بھائی لیتے تھے۔ اس طریقہ ازدواج کو نکاح شغار کا نام دیا گیا ہے۔ اسلام نے اس رسم کو منسوخ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لا شغار فی الاسلام اسلام میں لڑکی یا بہن کا عوض معاوضہ ممنوع ہے۔ اسلامی روایات کے مطابق صرف یہی نہیں کہ باپ و مہر پر کوئی دست رسی نہیں بلکہ اگر شادی کے شرائط میں مہر کے عداوہ کوئی چیز مان لی جائے زمین دی جائے گی یا کچھ دے تو اس میں باپ حق دار و حصہ دار نہیں ہوگا۔

اسلام نے وہ رسم منسوخ کر دی جس میں داماد اپنے خسر کی خدمت کرتا تھا۔ معاشرہ شناس سما کے نزدیک یہ اس دور میں ہوتا تھا جب ان کو نقد بٹا دے کا علم نہ تھا۔

داماد اپنے خسر کی خدمت فقط اسی لیے نہیں کرتے تھے کہ باپ بچی لڑکے کے رشتے سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، بلکہ اس کے اور اسباب بھی تھے اور ان میں بسا اوقات تمدن کے ارتقا کا بھی دخل ہوتا تھا۔ اور بچائے خود ظالمانہ انداز نہ تھا۔ بہرحال قطعی طور پر ان میں یہ رسم موجود تھی۔

واقعہ موسیٰ اور شعیب، علی نبیہما السلام قرآن مجید میں موجود ہے اسے مذکور بالا سورہ واقعہ دیکھئے سورہ لقمان آیت ۲۳ سے ۲۸ تک



رسم کے وجود کا سراغ ملتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے وقت "مدین" کے کنویں پر پہنچے ، اس وقت شعیب علیہ السلام کی لڑکیاں اپنی بھیڑیں لیے ذرا دور کھڑی تھیں، کسی کو ان کی باری کا خیال نہ تھا، موسیٰ کو رحم آیا، انہوں نے ان لڑکیوں کی بھیڑ بکریوں کے پینے کے لیے پانی کھینچی اور انھیں میزب کیا۔ لڑکیاں باپ کے پاس آئیں، اور قصہ بیان کیا، شعیب نے آدمی بھیج کر موسیٰ کو اپنے گھر بلایا۔ ایک دوسرے عارف ہوا۔ ایک دن شعیب نبی نے موسیٰ سے کہا، میں اپنی دو لڑکیوں میں سے ایک کی تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں، مگر تمھیں آٹھ سال میرے یہاں کام کرنا ہوگا۔ پھر اگر تمہارا دل چاہے تو مزید دو سال اور کام کرنا۔ یعنی دس سال تک۔ حضرت موسیٰ نے بات مان لی، اور وہ حضرت شعیب کے داماد بن گئے۔ یہ رسم اس زمانے میں بہر حال تھی۔ اس کی بنیاد دو باتوں پر نظر آتی ہے۔

۱۔ سرمایہ نہ ہونا۔ داماد اپنے خسر یا بیوی کی جو خدمت کر سکتا تھا وہ کرتا تھا۔  
۲۔ جہیز دینا۔ علم معاشرہ کے ماہر سمجھتے ہیں کہ جہیز کی رسم یعنی لڑکی کی طرف سے باپ کا کچھ ساز و سامان دینا پرانے زمانے سے چلا آتا تھا۔ اس ضمن میں داماد کو بطور اجیر کے لے لیتا یا اس سے کچھ مال وصول کرتا۔ عملی طور پر باپ جو کچھ داماد سے لیتا وہ لڑکی کے مفاد اور لڑکے کے کام کے لیے ہوتا تھا۔

اسلام نے یہ آئین ختم کر دیا۔ خسر، مہر کو اپنا مال نہیں سمجھ سکتا، خواہ اس کا یہ ارادہ ہی کیوں نہ ہو کہ وہ اس مال کو لڑکی کے لیے استعمال کرے گا۔ یہ حق فقط لڑکی ہی کو ہے جسے اپنے مال کا اختیار ہے جس طرح چاہے خرچ کرے۔ اسلامی روایات میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ اس طرح مہر مقرر کرنا درست نہیں۔

جاہلیت میں ایک اور رسم تھی جو عملاً لڑکی کو مہر سے محروم کر دیتی تھی۔ دستور تھا کہ مرنے والے کے ترکے میں اس کی بیوی بھی شمار ہوتی تھی۔ جب کوئی شخص مر جاتا تھا تو اس کے وارث مثلاً اولاد یا بھائی جیسے مرنے والے کے سرمایے سے ترکہ لیتے اور مالک بنتے، اسی طرح

اس بیوی کی زوجیت بھی ترک کے میں پاتے مرنے والے کا رٹہ کا یا بھائی اس کا مختار ہوتا اور جسے چاہتا وہ عورت نکاح میں دیتا اور مہر کا خود مانگ بنتا۔ یا نیا مہر مقرر کیے بغیر اپنی بیوی قرار دے لیتا تھا۔

قرآن کریم نے زوجیت کی میراث کا دستور منسوخ کر دیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرِهًا  
بِغَيْرِ أَوْ قُرْآنٍ ۖ لِلزَّوْجِ وَالْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ مِمَّا قَدْ خَلَائِلَ عَلَيْهِنَّ مِمَّا تَرِثُونَ ۚ

یہ غمخوار قرآن پر ایمان لانے والو! یاد رکھو، تمہارے لیے جائز نہیں کہ اپنے  
مورثوں کی بیویوں کو میراث بناؤ، وراثت والے کہ وہ عورتیں تمہاری بیوی

نہ بننا چاہیں۔

تو بیچا چھرتے اور نئی شادی چانے کی خاطر دیا ہوا بھاری مہر واپس لینے کی فکر میں عورت پر  
بہتان باندھتا ہے اس کی برو پر داغ لگاتا اور یہ جھٹاتا تھا کہ عورت پہلے ہی سے شادی کے لائق  
نہ تھی اس کا نکاح منع ہونا اور میر مہر واپس سنا چاہیے۔ قرآن مجید نے اس سے ہم کو بھی منوع کر دیا۔  
**مہر کا نظام خاص**  
**اسلام کا نظام ہے**  
دین اسلام کے مسلمات میں ایک بات ہے کہ مرد، عورت کے  
مال اور کاروبار سے سروکار نہ رکھے۔ وہ بیوی کو کام کرنے کا حکم  
نہیں دے سکتا کہ یہ کام میرے لیے کرو وہ نہ کرو۔ اگر عورت  
کوئی ایسا کام کرے جس سے اسے پیسہ حاصل ہو تو مرد کو عورت کی مرضی حاصل کیے اس رشتہ  
میں تصرف کا حق حاصل ہے۔ اس بہت سے مرد و زن میں برابری ہے۔ بیویں صدی کے  
اول تک مسیحی ریم اس کے برعکس تھی۔

اسلام کی نظر میں شوہر دار بیوی اپنے حقوق معاملات میں شوہر کی سرپرستی سے آزاد  
ہے۔ وہ اپنے کاروبار خود کر سکتی ہے۔ عین اس اقتصادی آزادی کی صورت حال میں بھی  
جبکہ اسلام نے شوہر کو مال اور کاروبار زوجہ پر حق نہیں دیا، مہر کی معافی نہیں کی، یہ حکم بجائے  
خود بتاتا ہے کہ مہر، اسلام کی نظر میں اسی لیے نہیں ہے کہ مرد کچھ عرصے بعد عورت کی ذات کے  
مالی فائدہ اٹھائے اور اس کی جسمانی قوت کا استثمار کرے۔ اسی وجہ سے اسلام کا نظام مہر  
اس کے خصوصیات سے ہے۔ مہر کے اس سسٹم کو دوسرے نظام اور فلسفے سے مخلوط نہ کرنا چاہیے  
جو اعتراضات و بان ہوتے ہیں اسلام کے نظام مہر پر نہیں ہو سکتے۔

**آئین فطرت**  
ہم نے کہا ہے کہ قرآن مجید نے مہر کو "نخلہ" عقیلہ کہا ہے۔ قرآن نے  
اس عقیلہ و پیش کش کو لازمی کر دیا۔ قرآن نے بڑی باریک بینی  
سے فطرت کی گہرائیوں کو پیش نظر رکھا۔ زن و مرد کے خاص رویوں کے بارے میں جو  
فطرت نے دونوں میں چھپا رکھے ہیں، اسلام نے دوستی کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے  
منحوط رکھتے ہوئے مہر کو نظر انداز نہ کرنے کی تاکید کی۔ عورت کا رویہ، مرد کی محبت کا شکریہ

ہونا چاہیے۔ عورت کی محبت ہی اچھی ہے اس کے رد عمل میں مرد کی محبت ہوگی۔ ابتدا میں  
نہیں۔ دکھ ہے عشق میں عورت کی پہل۔ یعنی جو عشق عورت کی طرف سے شروع ہو اور مرد  
کی درخواست ابتدا کی شریک نہ ہو وہ ہمیشہ شکست پاتا ہے اور عورت کی شخصیت چرمر جاتی ہے۔  
اس کے برخلاف عورت کا جو عشق مرد کی محبت کے جواب میں ہو، ایسا عشق نہ خود ناکام ہوتا ہے۔  
نہ عورت کی شخصیت کو نقصان و شکست دے دیا کرتا ہے۔

کیا یہ سچ ہے کہ عورت بے وفا ہوتی ہے؟ عورت کی محبت کمزور ہوتی ہے؟ عورت  
کے عشق پر اعتبار نہ کرنا چاہیے؟

یہ بات سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی سچ ہے، اگر عشق کی ابتدا عورت کی طرف سے ہو۔  
اگر کوئی عورت کسی مرد پر عاشق ہو جائے، کسی کو دل دے دے عشق کی آگ جلدی بھج  
جاتی ہے۔ ایسے عشق پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ جھوٹ ہونے کی صورت وہ ہے جہاں عورت  
کے دل میں آگ بڑھکے اور عشق بطور عشق مرد کے رد عمل میں شعلہ فشاں ہو۔ مرد کے عشق صادق  
کے جواب میں جبکہ محبت عورت کے دل میں بیدار ہوا ہو۔ عشق عملاً فسخ ہو جائے، بعد از قیامت  
ہے۔ ہاں، مرد کا عشق ٹھنڈا ہونے لگے تو عورت کا جذبہ عشق بھی تمام ہو جائے گا۔ عورت کا  
فطری عشق اس نوع کا ہوتا ہے۔

عورت کی وفائی کی شہرت نوع اول (پہلی قسم) کی محبت و عشق سے متعلق ہے۔ وہ جہاں  
عورت کی وفاداری مشہور ہے وہ عشق کی دوسری قسم سے وابستہ ہے۔ معاشرے کو اگر زن  
و شوہر کے رشتے میں مضبوطی کی ضرورت ہے تو وہ ایسے راستہ پر چلنے کے لیے مجبور ہے جو  
قرآن مجید نے اختیار کیا ہے۔ یعنی قوانین فطرت کی نگہداشت۔ جس میں ایک مسئلہ محبت میں  
زن و مرد کا فطری رویہ ہے۔ اس رویہ پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ تو ان مہر بھی فطرت کے  
ہم ننگ ہے۔ مہر زمین ہوا کرتا ہے وہ شافی ہے کہ عشق و محبت مرد کی طرف سے شروع  
ہوتی ہے۔ عورت اس محبت کی جوابدہ ہے اور مرد نے اس کے احترام میں ایک ہدیہ شکر کیا



ہندو قانون مہر کو جو بھی و مجموعی آئین اساسی کی دفعہ ہے۔ اور خالق فطرت کی طرف سے تدوین یافتہ ہے۔ حقوق مرد و زن کی برابری کا بہانہ بنا کر کا عدم قرار دینا غلط ہے۔

آپ نے دیکھا ہے کہ قرآن نے مہر کے سلسلے میں جاہلیت کے رسم و رواج کو اس عہد کے مردوں کی خواہش کے باوجود بدل دیا۔ قرآن مجید میں مہر کے بارے میں جو کچھ ہے وہ جاہلیت کی رسم نہیں تھی جو ہم یہ کہہ سکیں کہ قرآن مہر کے ہونے نہ ہونے کو براہ راست کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ قرآن مہر کو غیر منہج کر سکتا تھا وہ مردوں کو اس پابندی سے بچا سکتا تھا مگر اس نے کیا۔

**نقد و نظر** مہر کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر آپ سمجھ لیا، یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں مہر کا فلسفہ کیا ہے۔ اب مناسب کہ اسلامی قوانین اس مسئلہ پر نقد کرنے والوں کی بات میں سنیں۔

خانم منوچہریان نے اپنی کتاب "انتقاد بر قوانین اساسی و مدنی ایران" میں مہر کے اوپر ایک فصل میں لکھا ہے:

"جیسے باغ، مکان، گھوڑے یا خچر کے لیے مرد کو روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح عورت جو خریدنے کے واسطے جب سے پیسے نکالنا پڑتے ہیں اور جس طرح گھر، باغ اور خچر کی قیمت بڑے چھوٹے، خوبصورت اور بد شکل ہونے کے گھٹتی بڑھتی ہے۔ یونہی عورت بھی بد صورتی، زیبائی، دولت مندی اور غربت کی بنیاد پر کم و زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ ہمارے مہربان و جوانمرد قانون ساز حضرات نے عورت کی قیمت پر بارہ دفعات قلمبند کیے ہیں۔ فلسفیان کا یہ ہے کہ اگر میاں بیوی کے رشتے میں۔ ویسے کا ذکر نہ ہو تو یہ رشتہ کمزور اور جلد ٹوٹ جاتا ہے۔"

اگر مہر کا قانون کسی اجنبی نے بنایا ہو، کیا اس وقت بھی اتنی ہی بے توجہی و تہمت و افترا کا سبب ہوگا؟ کیا جب بھی روپیہ پیسہ کوئی کسی کو دیتا ہے تو وہ اسے خریدا جاتا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو افش و ہدیہ و تحفہ کی رسم کو ختم کر دینا چاہیے۔ قانون مدنی میں

مہر کی بات قرآن مجید کی اساس پر ہے۔ قرآن نے صاف صاف کہا ہے کہ مہر، نسیہ و پیش کش کے عدا و اور کوئی عنوان نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ اس مہر سے اقتصادی قوانین سمجھ س طرح بنائے، جس جن میں شوہر کو بیوی کے مال سے اقتصادی فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ اس صورت میں مہر کو قیمت زن کے نام سے کیوں پاؤ کیا جاسکتا ہے۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایرانی مرد اپنی بیویوں سے اقتصادی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں بھی ماننا ہوں، واقعاً بہت سے ایرانی مرد بیوی کے مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس کا مہر سے کیا تعلق ہے۔ مرد یہ تو نہیں کہتے کہ جو کہ ہم نے مہر دیا ہے ہم اپنی بیویوں پر کچھ اپنی کرتے ہیں۔ ایرانی مردوں کی اپنی بیویوں پر حکمرانی کا مرکزی کلمہ کچھ اور ہے۔ مردوں کی صلاح کے بجائے قانون فطرت کو بگاڑنے، اور مزید خرابیوں کو جنم دینے کی وجہ کیا ہے؟ اس پوری گفتگو میں صرف ایک بات پردے کی ہے اور وہ ہے کہ ایرانی، مشرق کے باشندے اپنے انسانی معیار، اور زندگی کا فلسفہ بھول جائیں اور اجنبی رنگ و شکل بنالیں، کہ ان کا ٹکنا آسان ہو جائے خانم منوچہریان کہتی ہیں:

"اگر عورت اقتصادی حیثیت سے مرد کے برابر ہو تو اس کے لیے نان و نفقہ و لباس و مہر کے قائل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح عورت کے لیے اور بہت سی پیش بندیاں اور مرد سے معاملات کو پکا کرنے کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہو۔ اگر اس گفتگو کی چھاں پھٹک کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا، جن تاریخی ادوار میں عورت کو حق مالکیت اور اقتصادی آزادی حاصل نہ تھی اس دور میں مہر و نفقہ کی کسی حد تک معقول و موجود تھی، مگر جب عورت کو اقتصادی آزادی دے دی گئی۔ جیسے اسلام میں، تو اب مہر و نفقہ کا جواز باقی نہیں۔"

ان لوگوں کے خیال میں مہر کا صرف فلسفہ یہ ہے کہ عورت کے اقتصادی حقوق چھین کر فقط مہر دے دیا جائے۔ بہتر ہو تا کہ یہ حضرات مختصر سا مطالعہ قرآن بھی کر لیتے اور مہر کی جو

تفسیر یہ ہے جس کی کمی ہے اللہ پر غور کر کے مہر کا اصلی فلسفہ دریافت کرتے اور جب انہیں اس کتاب کے عقلی منطقی دلائل معلوم ہوتے تو بہت خوش ہوتے کہ ان کے ملک کی آسمانی کتاب ایسی عالی مرتبہ ہے۔

چالیس کتنی تجویز کے مختلف رسائل "زن روز" کے شمارہ ۸۹ صفحہ ۱۱ پر بہت میں عورت کے فحش نکالت اور اس بارے میں اسلامی مذہبات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: "چونکہ عورت و مرد مساوی پیدا کیے گئے ہیں لہذا قیمت یا اجرت کی یکطرفہ ادائیگی عقلی دلیل و منطق کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ جیسے مرد کو عورت کی ضرورت ہے اسی طرح عورت کو بھی مرد کی ضرورت ہے۔ تخلیق میں ان کو ایک دوسرے کا محتاج پیدا کیا گیا ہے۔ دونوں برابر کی ضرورت کے محتاج ہیں۔ لہذا ایک کو کسی چیز کا پابند کرنا اور دوسرے کو چھوڑ دینا بے دلیل بات ہے۔ اس نقطہ نظر سے کہ خلاق مرد کے اختیار میں ہے اور عورت کی مشترک زندگی محفوظ نہیں تھی لہذا مہر کا حق عورت کو دے کر شوہر کی شخصیت پر بھروسے کے ساتھ ایک مالی مطالبے کا بھی وثیقہ بنکا گیا۔۔۔۔۔"

صفحہ ۷۲ پر فرماتے ہیں:

"اگر دفعہ ۳۳ قانون مدنی جس میں تصریح ہے: "مرد جب چاہے اپنی بیوی کو صدق دے سکتا ہے۔"

اس کی اصلاح کر دی جائے اور مرد کی خواہش و رائے پر طلاق نہ ہو تو مہر و صدق

کا فلسفہ وجود خود بخود ختم ہو جائے گا۔

اس قسم کی باتوں کی وقعتی ہماری سابقہ گفتگو کے بعد واضح ہو چکی۔ مہر قیمت یا اجرت نہیں، عشق و عفتی بات بھی کبھی جا چکی۔ زن و مرد باہم برابر کی محتاجی نہیں رکھتے۔ فطرت نے دونوں کو مختلف بہتوں میں رکھا ہے۔

سب سے زیادہ بے اساس یہ بات ہے کہ مرد کے حق طلاق کے مقابلے میں مہر کا فلسفہ

سنا دینا بیان کیا گیا ہے اور دعویٰ ہے کہ اسلام نے اسی بنیاد پر مہر مقرر کیا ہے۔

اس قسم کے حضرات سے پوچھنا چاہیے:

اسلام نے مرد کو حق طلاق کیوں دیا جو عورت کو مالی دستاویز کی ضرورت پڑی؟

اس کے علاوہ آپ کی بات کا تو مطلب یہ ہوا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی

زوج محترمہ کا مہر اس لیے مقرر کیا کہ حضرت اپنے مقابلے میں مالی دستاویز دینا چاہتے تھے۔

حضرت علی و حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہما کے درمیان مہر اس وجہ سے تھا کہ حضرت فاطمہ کو

مالی دستاویز دے کر علی کے بارے میں ذہنی اطمینان حاصل کر لیں۔

اگر حقیقت یہ ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں کو یہ نصیحت کیوں فرماتے

پنا مہر شوہروں کو بخش دیا کریں۔ اور ان بخشش کے ذیل میں ثواب کیوں بیان فرماتے؟

سریہ کہ یہ نصیحت کیوں فرماتے کہ حتی الامکان مہر زیادہ نہ رکھا جائے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک شادی کا ہدیہ مرد کی طرف سے عورت کے نام مہر کے طور پر دیا جاتا

اور عورت کی طرف سے مہر یا اس کے مساوی بخشش الفت و رشتہ ازدواج میں استحکام

و باعث نہ تھا؟

اگر اسلام کی نظر میں مہر مالی وثیقہ و دستاویز ہوتا تو آسمانی کتاب میں "وَلَا تَزِرُ

وَصْدَقَ قَاتِلِجَنَاحُكُمَا" کیوں ہے۔ یہ کیوں نہیں کہ "وَأَقْرَبُ النَّسَبِ صَدَقَاتُكُم"

سبقہ۔

ن باتوں سے بڑھ کر۔ مصنف مذکور نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صدر اسلام میں رسم

یہ ایسی ہی تھی جیسے آج ہے۔ آج کل کی رسم کے مطابق، مہر میں نمایاں پہلو مرد کی ایک

نئے داری و فریضہ ہے۔ یعنی مرد ایک رقم معین عقد و دستاویز کے مطابق قبول

کرتا ہے۔ عموماً اس رقم کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاتا، البتہ، اگر ٹی جھگڑے کے وقت مطالبہ

کرتا ہے، تو اس قسم کا مہر دستاویزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ صدر اسلام میں دستور



تھا کہ مرد، مہر کے نام سے جس کا وعدہ کرتا تھا وہ نقد ادا کر دیتا تھا۔ لہذا، مہر کو اسلام کے نزدیک دستاویز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی، مہر کے بغیر کسی زوجہ کو شوہر کے حوالے کرنے پر خوش نہ ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ شیعہ سنی کتابوں میں مذکور ہے:

ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حاضرین بزم کے سامنے کھنے لگی:

— یا رسول اللہ! مجھے اپنی زوجیت میں قبول فرمائیں۔

آنحضرتؐ نے سکوت اختیار فرمایا، کوئی جواب نہ دیا، وہ عورت بیٹھ گئی، ایک صحابی نے کھڑے ہو کر عرض کی:

— یا رسول اللہ! اگر آپ مائل نہیں تو میں حاضر ہوں!

آنحضرتؐ نے پوچھا:

— مہر کیا دو گے؟

— میرے پاس کچھ نہیں۔

— یوں تو نہیں ہو سکتا، گھر جاؤ، شاید کچھ مل جائے، جو ملے وہ لے آؤ اور اس

بی بی کا مہر دے دو۔

وہ آدمی گھر گیا، واپس آیا، اسے گھر میں کچھ نہ ملا۔

— اچھا دوبارہ جاؤ، ایک سو ہے کی انگوٹھی مل جائے تو وہی لے آؤ کافی ہے۔

دوسری مرتبہ گیا، گھر میں کچھ تھا ہی نہیں۔ عرض کرتے لگا، بس یہی کپڑے

میں جو پہنے ہوئے ہوں۔

ایک صحابی نے سے پہچان لیا اور کہا، یا رسول اللہؐ بخدا اس شخص کے پاس

اس لباس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسی کے نصف کو مہر قرار دے دیجئے۔  
آنحضرتؐ نے فرمایا:

اگر اسے دو حصے کر دیا جائے تو کسی کا بھی جسم تو نہ ڈھکے گا۔ نہیں، نہیں ہو سکتا۔  
وہ شخص بیٹھ گیا۔ عورت اسی انتظار میں دوسری طرف بیٹھی تھی۔ محفل میں باتیں ہونے لگیں اور دیر ہو گئی۔ وہ شخص اٹھا کہ جائے، آنحضرتؐ نے آواز دی:

— ادھر آؤ! — وہ حاضر ہوا۔

— اچھا یہ تباؤ، قرآن آتا ہے؟

— جی ہاں! یا رسول اللہؐ، فلاں فلاں سورہ آتا ہے۔

— زبانی سنا سکتے ہو!

— جی ہاں، سنا سکتا ہوں۔

— اچھا، ٹھیک ہے، یہ عورت تمہارے عقد میں رہتا ہوں، اور مہر یہ ہے کہ لے قرآن کی تعلیم دے دو۔

اس شخص نے بیوی کا ہاتھ ہاتھ میں لیا اور دونوں چلے گئے۔

مہر کے بارے میں اور بہت سی باتیں کہنے کی ہیں مگر اب ہمیں پر شہرہا ہوں۔

## مہر و نفقہ

(۳)

نفقہ :

مہر کے بارے میں اسلام کا نظریہ و فلسفہ بیان کر چکے، اب "نفقہ" کے متعلق بحث باقی ہے۔ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی قوانین میں نفقہ بھی "مہر" کی طرح ایک خاص نہج و انداز کی چیز ہے، اس کو ان معنوں میں نہ سمجھنا چاہیے جو غیر اسلامی دنیا میں تھے یا آج بھی اس کا کوئی مفہوم کہیں مراد لیا جاتا ہو۔

اگر اسلام نے مرد کو یہ حق دیا ہو تا کہ عورت کو اپنی خدمت گزاری کے لیے رکھو، بیوی کی محنت، کاروبار اور اس کی دولت کو اپنا مال سمجھو۔ تو نفقہ دینے کے معنی عیاں تھے۔ واضح یہی بات ہے، جب انسان کسی جانور یا آدمی سے اقتصادی فائدہ اٹھائے گا تو اس کے اخراجات زندگی بھی پورے کرے گا۔ گھوڑے والا اپنے گھوڑے کو دانہ پانی نہ دے گا تو جانور بھی گاڑی نہ کھینچے گا۔

اسلام، مرد کے اس حق کو نہیں مانتا، اس نے عورت کو حق ملکیت دیا ہے۔ وہ دولت کما سکتی ہے۔ مرد کو حق نہیں کہ بیوی کی خاص دولت میں تصرف کرے اور لازم قرار دیا کہ گھر کا بجٹ پورے کرے بیوی بچوں کا خرچہ نوکر چاکر، کام کاج، گھر وغیرہ کے اخراجات ادا کرے۔ کیوں، علت و سبب کیا ہے؟

افسوس ہے، مغرب نواز ایک لمحہ کے لیے ان معاملات پر ذرا بھی توجہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ آنکھیں بند کر کے بعینہ وہی اعتراض کرتے ہیں جو یورپ والے اپنے قانونی سسٹم پر کرتے ہیں۔ اور وہ صحیح بھی ہیں۔ یہ لوگ انھیں اعتراضات کو اسلامی قوانین

مرادیتے ہیں۔

گر کوئی کہتا ہے کہ مغرب میں بیوی کا نان و نفقہ انیسویں صدی میں وظیفہ خوار سی و نہونویں صدی و شان کینٹری تھا تو غلط نہیں کہتا، سچ کہتا ہے۔ آخر ایک عورت بے معاوضہ پابند و مرد کی گھرلو زندگی کی دیکھ بھال کرے اور ملکیت سے محروم بھی ہو تو جو دروہا لے سے دیے جائیں گے وہ تنخواہ و وظیفے سے زیادہ کیا ہوں گے، جیسے قیدی یا، بارکش جانور کا رتبہ۔

اگر دنیا میں کوئی قانون ایسا موجود ہو، جو خاص طور پر جو مرد کی گھرلو زندگی کی ذمہ داریوں کا بطور فرض والا بوجھ بیوی کی گردن سے اٹھائے، اسے دولت کمانے کا حق اور اقتصادی آزادی دے، گھرلو بجٹ میں شرکت سے معاف رکھے، جب تو یقیناً کوئی فلسفہ جدا نہ ہوگا۔ اور اس کے اوپر غور کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر شایگان نے "شرح قانون مدنی ایران کے صفحہ ۳۶۲ پر لکھا ہے :

**انیسویں صدی کے آخری حصے تک فرنگی عورت کی محرومی۔**

عورت اپنی ملکیت میں جو خود مختاری

کھتی ہے وہ فقہ شیعہ میں ابتدا سے تسلیم شدہ ہے۔ یونان، روم، جاپان اور کچھ عرصہ پہلے شرمالاک کے قوانین میں یہ بات مذکور نہ تھی۔ یعنی بیوی، نابالغ اور دیوانے کی طرح اپنی ملکیت سے "مجبور" یعنی وہ اپنی جائداد و املاک میں تصرف سے محروم تھی۔ انگلستان میں ایکٹ تھا کہ بیوی کی حیثیت، شوہر کے وجود میں محو تھی۔ ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۳ء میں باری باری وہ قانون وضع ہوئے جن کا نام شوہر رکھنے والی خواتین کا قانون ملکیت اس کی وجہ سے ورثہ آف وارڈس سسٹم کا خاتمہ ہوا۔

اٹلی میں یہ قانون ۱۸۷۵ء میں اور ستمبر میں جرمن کے قانون مدنی رسول لایونہی ۱۸۷۵ء میں سویزر لینڈ کے قانون نے بیوی کی اہلیت و حق ملکیت و تصرف کو تسلیم



کیا جیسے شوہر کو یہ حق حاصل تھے۔

لیکن پرتگال و فرانس میں، با شوہر بیوی مجبور شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ ۱۹۳۸ء کی ۱۸ فروری کو فرانس میں حجر لکورت آف وارڈس کے ضابطے کو ہموار کر دیا گیا ہے۔

ملاحظہ فرمایا اپنے صدی کی بات ہے یعنی بیوی کو شوہر کے مقابلے میں حق ۱۸۸۲ء میں ملا۔ وہ بھی۔ انگلستان میں یا بیوی کی ملکیت سے بہ اصطلاح قانون "کورت آف وارڈس" شپ ختم ہوئی۔

**یورپ نے عورت کو اپنا ایک اقتصادی خود مختاری کیوں دے دی؟**

ظالمانہ رویے کا احساس ہوا؟

ویل ڈیورینٹ نے اس کا جواب دیا ہے، اس نے کتاب "لذات فلسفہ" میں وجوہ و اسباب، کے عنوان سے ایک بحث کی ہے۔ یورپ میں آزادی خواتین کے اسباب و علل پر اس میں تفصیل مہیا کی ہے۔ افسوس ناک بات جو وہاں ملی وہ یہ ہے کہ یورپ کی آزادی و حق ملکیت عورت کو مشین کا شکر گزار ہونا چاہیے آدمیوں کا نہیں۔ اسے بڑی بڑی مشینوں کے پہیوں کے سامنے جھکنا چاہیے۔ مغربی مردوں کے سامنے نہیں۔ یہ تو کارخانہ داروں کی حرص تھی، انھوں نے عورت سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی خاطر مزدوری کم اور کام نیا کے نقطہ نظر سے انگلستان کی قانون ساز اسمبلی میں مسودہ قانون آزادی اقتصادی خواتین قابل پیش کر دیا۔

ویل ڈیورینٹ کہتا ہے :-

"رسم و رواج قدیم کی دگرگونی کا کیا سبب بناؤں وہ رسم و رواج جو تاریخی مسیحیت سے بھی پرانے تھے؟ ایک عام سبب اس تبدیلی کا، مشینوں اور

کارخانوں کی فراوانی ہے۔ "آزادی خواتین" منقہ نقیب کی پیداوار ہے۔۔۔۔۔

ایک صدی پہلے انگلستان میں مردوں کو کاروبار میں مشکل ہو گیا تھا۔ مگر روزانہ کارخانوں میں ان سے کہا جاتا تھا کہ اپنی بیوی بچوں کو کارخانوں میں بھیجیں۔ کارخانہ داروں نے منافع اور حصوں کی فکر تھی وہ حکومت کے اخلاق و رسم و رواج سے اپنا ذہن پریشان کر سکتے تھے۔ جن لوگوں نے بے خبری کے عالم میں "گھر بھونکنے" کا منصوبہ بنایا وہ وطن پرست انیسویں صدی کے وطن پرست کارخانہ دار تھے۔

"جماری پرانی ماؤں کی آزادی کے لیے پہلا قدم ۱۸۸۲ء کا قانون تھا۔ اس قانون کی رو سے عظیم برطانیہ کی خواتین نے بے مثال امتیازات حاصل کیے۔ وہ جو پیسے حاصل کریں اپنے منافع محفوظ کر سکتی تھیں۔ اس اعلیٰ درجے کا اخلاقی و سچی قانون، کارخانہ داروں نے مجلس میں پیش کیا تاکہ انگلستان کی خواتین کو فیکٹریوں میں کھینچ سکیں، اس وقت سے آج تک اس مقابلہ نفع اندوزی نے غلامی، جان کنی، گھروں سے نکلنے کی مہم جاری ہے۔ عورتیں جن میں گرفتار، نزع کے عالم میں بڑی بڑی دوکانوں اور کارخانوں میں زندگی گزار رہی ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ سرمایہ داروں اور مالکان کارخانہ نے انگلستان میں اپنے مادی نفع کی خاطر عورتوں کے حق میں یہ قدم اٹھایا تھا۔

**خواتین اور خواتین کی اقتصادی آزادی** اسلام نے چودہ سو برس پہلے ایک قانون دیا :-

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ  
مرد جو کچھ کماتے ہیں وہ ان کا حصہ ہے اور عورتیں جو کماتے ہیں وہ ان کا حصہ ہے۔

اس آیت کریمہ میں قرآن مجید نے مردوں کو ان کے نتائج کار و کوشش کا مالک اور عورتوں کو ان کے نتائج کار و کوشش کا حقدار قرار دیا ہے۔

دوسری آیت مبارکہ میں ارشاد ہے :-

لِّتَجَالِ نَصِيبُ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ  
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ

جو مال باپ یا ماں یا قرابت دار مرنے کے بعد چھوڑیں اس میں مردوں کا حصہ ہے اور جو مال ماں باپ یا قرابت دار مرنے کے بعد چھوڑیں اس میں عورتوں کا حصہ ہے۔

اس آیت سے خواتین کی وارث ہونے کی حیثیت ثابت ہوتی ہے۔ عورت کے وارث ہونے نہ ہونے کی تاریخ بھی تفصیل طلب ہے جسے انشاء اللہ ہم بیان کریں گے۔ جاہلیت کا عرب عورتوں کو میراث دینے پر تیار نہ تھا۔ قرآن نے عورتوں کا یہ حق ثابت کر دیا۔

**ایک مناظرہ:** قرآن کریم نے تیس سو برس پہلے یورپ میں عورتوں کو اقتصادی آزادی عطا کی فرق یہ تھا:

- ۱۔ اسلام کا خواتین کو اقتصادی آزادی عطا کرنے کا سبب، اسلام کی انسانی جہت عمل و دوستی والہیت کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ نہ انگلستانی کا خانہ داروں کی ہوس نفع اندوزی تھی جس نے اپنے پیٹ بھرنے کے لیے یہ مسودہ قانون پیش کیا ہو۔ اس کے بعد وہ ڈھول پیٹنے کہ ہم نے عورت کے حقوق کو قانونی طور پر منوایا، ہم نے زن و مرد کے حقوق کو برابر تسلیم کیا۔
- ۲۔ اسلام نے عورت کو اقتصادی آزادی بخشی لیکن بقول ویل ڈیورینٹ، "خانہ باندازی" نہیں کی۔ گھر میں آگ نہیں لگائی۔ خاندانوں کی نیو نہیں اکھیڑی، بیویوں کو شوہروں، بیٹیوں کو باپوں کے خلاف کشتی پر نہیں ابھارا۔ اسلام نے ان دو آیتوں سے ایک عظیم سماجی انقلاب برپا کیا مگر پرسکون ابے ضرر اور بے خطر۔

۱۔ قرآن، لکیم، النساء آیت ۷

یورپ نے جو کچھ کیا وہ بقول "ویل ڈیورینٹ"، یہ تھا کہ عورت کو گھر کی بندگی و جان کنڈ سے آزاد کر کے دوکانوں اور کارخانوں کی بندگی و جان کنڈنی میں ڈال دیا، یعنی مغرب نے ایک تنہا بی بی، عورت کے ہاتھ پاؤں سے کھوئی اور دوسری تنہا بی بی بی بی بی بی بی۔ اسلام نے عورت کو مرد کی بندگی و کینری سے گھر اور کھیت دونوں جگہ آزادی بخشی اور مرد کو گھر بوا اجتماعی زندگی کے اخراجات کا ذمہ دار بنایا، عورت کے کاندھوں سے اپنے اور گھر کے اخراجات اور ہر قسم کا جبر و پابندی کا بوجھ اتار دیا۔ اسلام کی نظر میں عورت انسانی خمیر کے مطابق دولت کے حصول، اس کی حفاظت و اضافہ کی سعی کر سکتی ہے۔ اسے زندگی کا جبر نہیں دیا سکتا اور اس کی خودداری و جمال و زیبائی ہمیشہ اطمینان خاطر کے ساتھ اس کے ہمراہ رہ سکتی ہے زندگی کا جبر اسے نہیں چھین سکتا لیکن کیا کیا جائے ہمارے کچھ لکھے والوں کی آنکھیں اور کان بند ہو چکے ہیں کہ ان مسلم تاریخی و فلسفی حقائق کو سوچیں۔

**استفاد اور جواب:** خانم منوچہریان نے "استفاد بر قوانین اساسی و مدنی ایران کے صفحہ ۲ پر لکھا ہے:

"ہمارا سول لا، ایک طرف تو مرد کو اپنی بیوی کا نفقہ دینے پر تیار کرتا ہے۔ اس کے لیے کپڑے تھے، خوراک اور مکان دے، جیسے مالک اپنے گھوڑے گدھے کے لیے خوراک اور تھان مہیا کرتا ہے اسی طرح بیوی کو کم از کم زندگی کے یہ اسباب فراہم کرے دوسری طرف نہ معلوم کیوں سول لا کی دفعہ ۱۱۰ میں لازم قرار دیتا ہے کہ عدہ و نفات میں بیوی کو نفقہ کا حق نہیں ہے۔ حالانکہ وفات شوہر کے وقت عورت مہربانی تسلی کی محتاج ہوتی ہے، وہ اپنے مالک کو ہاتھ سے کھونٹتے ہوئے پریشاں حال و آشفہ خاطر نہ ہو، ہمدردی و غم خواری چاہتی ہے۔ ممکن ہے آپ فرمائیں کہ تم تو آزادی کا دم بھرتی ہو، ہر منزل میں مرد کے برابر ہونا چاہتی ہو یہاں وظیفہ خوار و راتب دار بننے کی آرزو کیوں ہے۔ یہ امید کیوں کرتی ہو کہ شوہر کے بعد بھی زندگی و تنخواہ جاری ہے۔ جواب یہ ہے



کہ فلسفہ کینیزی زن کے مطابق جو "سول" کا سانچہ ہے۔ بقول سعدی اچھا ہوتا کہ "مارکا آادی" اپنے بعد کے لیے بھی بیوی کے لیے نفقہ مقرر کر جاتے۔ اور قانون اس پہلو کی نگہداشت کرتا ہے۔ محترمہ سے پوچھتے ہیں، قانون مدنی اور قانون اسلام یا بقول آپ کے فلسفہ کینیزی زن میں کہاں سے آپ نے دریافت کیا ہے کہ مرد، بیوی کا مالک ہے؟ اور مرد کا نفقہ دینا اس سبب ہے کہ عورت اس کی مملوک ہے۔ یہ کون سی ملکیت ہے کہ مالک اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ "پانی کا گلاس اٹھا دو" یہ ملکیت کسی ہے کہ مملوک جو کام کرے وہ مملوک ہی کا ہے مالک کا۔ اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کیسی ملکیت ہے کہ مملوک چھوٹا سا کام بھی مالک کے لیے انجام دے۔ اگر اس کی خواہش ہو۔ تو مزدوری طلب کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہ کیسا مالک ہے جو اپنے زیر دست سے اپنے بچے کو مفت دودھ نہیں پلا سکتا، حالانکہ مالک کے گھر میں بچہ اسی نے جانا ہے۔

دوسرے یہ کہ۔ جو بھی کسی کا کھانا پیتا ہو وہ مملوک ہو اگر تباہ ہے؟ اسلام ہو یا کوئی بھی قانون ہو، اولاد باپ یا ماں باپ دونوں کے واجب النفقہ ہیں۔ تو اس دلیل کے مطابق تمام دنیا کے قوانین، اولاد کو باپ کی ملکیت مانتے ہیں۔ اسلام کا حکم ہے کہ اگر ماں باپ غریب ہوں تو اولاد پر ان کا نان و نفقہ واجب ہے، یعنی اسلام نے باپ اور ماں کو اولاد کا مملوک قرار دیا ہے؟

تیسرے یہ کہ۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات ہے کہ فرماتی ہیں۔ بیوی کا نفقہ عدہ وفات میں کیوں واجب نہیں؟ اس وقت بیوی اپنے میاں کو ہاتھ سے کھو بیٹھتی ہے وہ شوہر کے روپے کی زیادہ محتاج ہے۔

جیسے محترمہ، سو سال پہلے کے یورپ میں رہتی ہیں، عورت کی احتیاج، شوہر کے نفقہ دینے کی رس نہیں ہے۔ اگر اسلام کی نظر میں عورت اپنے شوہر کی شریک حیات ہوتے ہوئے حق ملکیت سے محروم ہوتی تو یہ مطالبہ صحیح تھا کہ وفات شوہر کے بعد اس کا انتظام کیا

جائے کیونکہ اس کی زندگی کی وضع بدل گئی۔ لیکن جو قانون بیوی کو حق ملکیت دے چکا ہے اور بیویاں اپنے اس حق کی بنا پر اپنا پیسہ شوہر کی زندگی میں محفوظ کر سکتی ہیں تو آتش یا نہ ابرنے کے بعد کیا ضرورت ہے ایک مدت کے لیے ہی سہی وہ نفقہ لیں۔ نفقہ کا حق مرد کے آشیانے کی بنیاد کے لیے تھا، آشیانے کی ویرانی کے بعد کوئی ضرورت نہیں یہ حق جاری رکھا جائے۔

اسلام میں نفقہ تین نوع کا ہے،

### نفقہ کی تین قسمیں

۱۔ مملوک کو مالک کی طرف سے دیا جانے والا نفقہ، وہ اخراجات جو حیوانات کے مالک ان جانوروں پر کرتے ہیں اس نفقہ کی بنیاد ملکیت و مملوکیہ ہے۔

۲۔ وہ نفقہ جو کم سن اور محتاج اولاد کو دیا جاتا ہے یا وہ اخراجات جو غریب ماں باپ پر ہوتے ہیں۔ اس نفقہ کی بنیاد ملکیت و مملوکیہ نہیں ہے۔ اس کی بنیاد وہ فطری حقوق ہیں

جو اولاد اپنے وجود میں لا والوں پر رکھتے ہیں اور والدین کے وہ حقوق ہیں جو تولید میں شرکت اور بچے کی پرورش و تربیت میں کٹیف برداشت کرنے کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس نقطہ کے وجہ کی شراہ ہے کہ واجب النفقہ عاجز و غریب ہو۔

۳۔ وہ نفقہ جو شوہر اپنی بیوی کو دیتا ہے۔ اس نفقہ کی بنیاد نہ ملکیت ہے، نہ مملوکیہ، نہ وہ فطری حق جو نوع دوم میں بتایا گیا ہے، نہ اس کی بنیاد بیوی کا غریب و عاجز ہونا ہے۔

بیوی، عیالوں کی مالک اور بے حد و حساب آمدنی کی مالک ہو، اور شوہر کی آمدنی کم ہو جب بھی گھر کے اخراجات، جن میں بیوی کا نجی خرچ بھی شامل ہے۔ مرد کے ذمے ہے۔

پہلی اور دوسری نوع و قسم کے نفقہ سے اس نفقہ کا فرق یہ بھی ہے کہ ان دونوں مقامات میں اگر آدمی اپنی ذمہ داری پوری نہ کرے اور نفقہ نہ دے تو گنہگار ہو گا مگر وہ قرض نہیں جس کی ادائیگی یا مطالبہ کیا جاسکے۔ یعنی اس کی قانونی حیثیت نہیں ہے، تیسری قسم کے

نفقہ میں اگر آدمی غفلت کرے تو بیوی کو قانونی چارہ جوئی کا حق ہے وہ دعویٰ کر سکتی ہے و ثبوت کے بعد وہ عدالت کے ذریعے اپنے واجبات وصول کر سکتی ہے۔ اس نفقہ کی بنیاد کیا ہے؟ اس پر آئندہ فصل میں ہم بحث کریں گے۔

## کیا آج کی بیوی مہر نفقہ نہیں چاہتی؟

میں نے کہا ہے: اسلام کی نظر میں گھرلوہیت کی فراہمی جس میں بیوی کے ذاتی اخراجات بھی ہیں، مرد کے ذمے ہے، اس کی ذمہ داری عورت پر نہیں ہے۔ خواہ بیوی بہت بڑی سرمایہ دار اور شوہر سے کئی گنا زیادہ مال رکھتی ہو، اسے اخراجات میں شرکت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ نہ روپے کے لیے نہ کسی کام کے لیے فقط اور فقط وہ خود اپنے ارادے اور خواہش سے چوکنا چاہے وہ کرے۔

اسلام کی نظر میں باوجودیکہ زندگی کے اخراجات جن میں عورت کے مصارف بھی داخل ہیں، مرد کے ذمے ہیں، پھر بھی مرد کو کسی قسم کا اقتصادی تسلط اور بیوی کی فری قوت اور کام سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے وہ استیفاء نہیں کر سکتا۔ بیوی کا نفقہ اس خشت سے نفقہ والدین سے مشابہت رکھتا ہے کہ وہ بھی خاص حالات میں اولاد کو دینا پڑتا ہے اور اس کے عوض میں وہ مال یا باپ سے خدمت نہیں لے سکتا۔

## مالی معاملات میں عورت کی نگہداشت

اسلام نے بے مثال انداز میں عورت کی مالی حیثیت سے نگہداشت کی ہے۔ ایک طرف اسے اقتصادی آزادی دے کر مرد کی دست رس و بالادستی کو کم کیا ہے، عورت کے معاملات میں مرد کی قیودیت کو۔ جو پرانی دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور یورپ میں بیسویں صدی تک باقی رہی۔ شوہر سے لے لی۔ دوسری طرف گھرلوہیت کی اخراجات کی فراہمی کا بوجھ اس کے کاندھے سے اتار کر اسے پیسے کے پیچھے دوڑنے اور ہر قسم کے جبر و پابندی اور دواؤں سے معاف کر دیا۔

مغرب پرست جب خواتین کی حمایت کا نام لے کر اس قانون پر تنقید کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجبور ہو کر شاخ درشاخ دروغ بے فروغ کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ نفقہ کا فلسفہ ہے مرد کا اپنے بیوی عورت کا مالک سمجھنا اس سے اپنی خدمت لینا۔ جیسے جانوروں

کا مالک اپنے مملوکہ جانوروں کا خرچ برداشت کرنے پر مجبور ہے کہ وہ چوپائے اسے غی داری دے سکیں اس کے لیے بار برداری کر سکیں، قانون نفقہ زن بھی اسی لیے ضروری ہے کھاؤ پر نہیں۔

جو شخص ان معاملات میں قانون اسلام پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلام مرد سے زیادہ عورت پر نوازش کی ہے اور مرد پر دباؤ ڈالتا ہے۔ اسے بیگار میں پکڑ کر عورت کی مزدوری کروائی ہے۔ تو یہ کہنے والا اپنی بات کو بڑا آب رنگ سے کریش کر سکتا ہے نہ یہ کہ عورت کا نام اور اس کی حمایت کا ڈھونگ چاکر اس قانون پر حملہ کرے۔

درحقیقت اسلام عورت کے مفاد اور مرد کے خلاف یا مرد کے مفاد اور عورت کے خلاف، قانون نہیں بنانا چاہتا۔ اسلام نہ مرد کا حامی ہے نہ عورت کا، اسلام اپنے قوانین میں انسانی معاشرے کی ہیود کو ملحوظ رکھتا ہے، میاں بیوی اور ان کی آغوش میں پرورش پانے والے بچے خوش و خوشحال رہیں۔ اسلام کی نظر میں، میاں بیوی اور اولاد کی فلاح و ہیود کا راستہ یہ ہے کہ فطرت نے جو قوانین اور قواعد، جو رویے اور طریقے قدرت و توانا خالق سے حاصل کیے ہیں ان سے چشم پوشی نہ کی جائے۔

ہم نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ اسلام نے ہمیشہ اس کلیہ کی نگہداشت کی ہے کہ مرد کو خریدار اور عورت کو مالک مال و اسباب جانتا ہے۔ اسلام کی نظر میں مشترک زندگی و وصال میں مرد اپنے آپ کو فائدہ اٹھانے والا سمجھ کر اس عمل کا خرچ برداشت کرے۔ زن و مرد یہ نہ بھولیں کہ ان دونوں کی فطرت نے عشق کے دو جدا گانہ رویے انہیں بخشے ہیں شادی اس وقت پائدار و لذت بخش و مستحکم رہ سکتی ہے جب عورت و مرد اپنے اپنے فطری رویے کے مطابق سامنے آئیں۔

۲۔ مرد پر عورت کے نفقہ کا فرض اس علت و وجہ سے بھی ہے کہ فطرت کی طرف سے تولید نسل کی روح فرا اور رنج و زحمت کشی کی ذمہ داری عورت کے ذمہ رکھی گئی ہے۔



اور اس سے مرد کا ایک آن کے لیے لذت بخش عمل ہے اور بس عورت ہے کہ رکھ سنی اور بڑے صاپ کے عداوہ (ماہواری کی بیماری جیسے حمل کے دنوں کا بوجھ اٹھائے پھر ان دنوں کی مخصوص بیماری سے گذرے بچہ جننے اور اس کے غوارض و مشکلات سے دوچار ہو بچے کو دودھ دے اس کی دیکھ بھال کرے۔

ان مرحلوں میں بدنی اور اعصابی قوت صرف ہوتی ہے کام کات کے لیے اس کی توانائی میں کمی آتی ہے۔ ان سبب دوجہ کے بعد بھی اگر قانون زن و مرد کو اخراجات زندگی میں منسابہ صورت حال میں قرار دے اور عورت کی حمایت نہ کرے تو خواتین کی حالت بڑی مفلو مانہ ہو جائے یہی معاملات ہیں جن کی بنا پر جانوروں میں جنس نر جنس مادہ کی حفاظت کرتی ہے اور نر اپنی مادہ کو زمانہ حمل و تولید میں خوراک و آذوقہ مہیا کرنے میں مدد دیتا۔ زن و مرد، محنت و قوت، اقتصادی، اور تولیدی جیسے سخت کام میں ایک دوسرے کے مشابہ پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ اگر بیگانگی کی بات آپرے اور شوہر بیوی سے کہے کہ میں اپنی بدنی سے ایک پیسہ بھی تم پر خرچ نہیں کروں گا تو بیوی ہرگز اس قابل نہیں کہ وہ مرد کے ہم پل کھڑی ہو سکے۔

ان باتوں سے قطع نظر عورت کو مرد سے کہیں زیادہ پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زیب و زینت عورت کی زندگی کا حصہ ہے وہی اس کی اصلی ضرورت ہے۔ ایک عورت اپنی عام زندگی میں بھی زیب و زینت شان و شوکت پر خرچ کرتی ہے وہ کئی مردوں کے خرچ کے برابر ہوتا ہے۔ زیبائش و آرائش کے رجحان سے عورت میں خود بخود رنگینی و مغرور پیدا ہوتا ہے۔ ایک مرد کے لیے ایک جوڑا جب تک پہنا جاسکے پھٹ جائے قابل استعمال ہے مگر ایک عورت کے لیے عورت کے لیے ایک جوڑا اس وقت تک قابل استعمال ہے جب تک کہ وہ اسے نئے لباس میں ملبوس دکھائے بہت سے زیور آلات عورت کے لیے ایک دفعہ سے زیادہ پہننے کے قابل نہیں رہتے۔

حصول دولت کے لیے عورت کی محنت و کوشش مرد سے کم، مگر دولت کا استعمال مرد کے نہیں زیادہ ہے۔

پھر یہ کہ عورت کا عورت رہنا یعنی حسن و جمال، نشاط و غرور زن کی تھا، زیادہ نشاط، زیادہ راحت چاہتی ہے اس کے لیے محنت کم اور اطمینان خاطر زیادہ درکار ہے۔ عورت مرد کی طرح دائمی طور پر تلاش معاش اور فکر روزی میں، سرگرداں و رپیے کے پیچھے دوڑے پر مجبور ہو تو اس کا غرور ٹوٹ جائے مرد کی طرح مالی پریشانیوں سے اس کے منہ پر بل اور پشیمانی پر شکن پڑ جائے اس کی بھویں تنی ہوئی اور چہرہ شکستہ نظر آنے لگے۔ اکثر لوگوں سے سنہے، یورپ کی عورت تلاش معاش کے لیے کارخانوں اور دفاتروں میں مجبوراً جاتی ہے اسے مشرقی زندگی کی تمنا رہتی ہے۔ صاف سی بات ہے جس عورت کو ذہنی سکون نہ ہوگا اسے موقع ہی مل سکے گا کہ وہ مرد کے لیے سرمایہ مسرت و خوشی مہیا کر سکے۔

لہذا، فقط عورت کا مفاد نہیں، مرد اور گھر کی مرکزیت کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ عورت تلاش معاش کی تحکاک دینے والی جبری محنت سے معاف رکھی جائے۔ مرد بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کے گھر کا مرکز، آسائش اور تحکاک دور کرتے بلکہ بیرونی پریشانیوں کو بجلا دینے کا مرکز ہو۔ عورت کے امکان میں ہے وہ گھر کو ماحول کو آرام محل اور فراموش خانہ فکر تباہی سے کس قدر بنھ لے وہ شوہر جو تحکاک ماندا، گھر میں قدم رکھے اور اپنے سے زیادہ بھکی بوری کا سامنا کرے۔

یوں مرد کے لیے بہت ضروری ہے کہ بیوی، صحت و نشاط اور اطمینان خاطر سے رہ کرے۔

اسی نکتے کی خاطر مرد تیار رہتے ہیں کہ جان پر کھیل کر روپیہ کمائیں اور دونوں ہاتھ پر دولت رکھ کر بیوی کی نذر کریں کہ وہ کھلے ہاتھ سے اپنے جسم و جمال پر خرچ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد کو اپنی روحانی طلب کا احساس ہے، وہ سمجھ چکا ہے کہ لہنے عورت کو

سہ ماہی آرام و آسائش روح بنایا ہے :

وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۚ

اور اس سے اس کا جوڑا بھی بنایا تاکہ اس کے پاس رہے اور سکون حاصل کرے۔

سوہرہ سمجھتا ہے کہ اپنی بیوی کو جس قدر اطمینان خاطر عطا کرے گا اسی قدر بواسطہ اپنی بھلائی حاصل کرے گا۔ گھر کے ماحول کو بار و فتنہ بنائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ جوڑے میں کم از کم ایک تو افکار و نام سے آزاد رہے کہ دوسرے روح کو سکون اور دل کو خوشی دے سکے۔ تقسیم کار کے وقت بہتر رہی ہے کہ معرکہ حیات میں مقابلے کے لیے مرد کا باہر نکلنا ہی بہتر ہے اور کون و راحت روح کا سامان کرنے کے لیے دوسرا شریک حیات۔ بیوی۔ کو ہونا چاہیے۔

مالی اور مادی معاملات میں عورت کو مرد کا نیاز مند پیدا کیا گیا ہے اور مرد کو روحانی و نفسیاتی پہلو سے عورت کا نیاز مند بنایا گیا ہے، عورت مرد کا بہاویہ بغیر، مرد سے کئی گنا ضروریات کو پورا کرنے اور مالی احتیاجات سے فائدہ اٹھانے سے عاجز ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے عورت کے قانونی شریک حیات کو۔ فقط اس کے قانونی شریک زندگی۔ اس کے مرکز اعتماد بنایا ہے۔

عورت اگر اپنی پسند کی شان و زیبائش چاہنے لگے اور اپنے قانونی شوہر پر مری بھرو نہ کرے دوسرے مردوں پر بھی توجہ دینے لگے تو۔ بصدافسوس۔ یہ وہی حالت ہوگی جو آج کل مشائیں بن کر روز افزوں ہوتی جائے گی۔

**نان و نفقہ کے خلاف پروپیگنڈا** شکاری مردوں کو راز معلوم ہو گیا ہے۔ نان و نفقہ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک سبب یہ ہے کہ جب بیوی کی شوہر کے پیسے سے غرض ختم کر دی جائے گی تو وہ آسانی سے شکاری کی

... میں بیٹھ سکے گی کمپنیوں میں خواتین کو زیادہ رقم کی ادائیگی پر غور کیجئے تو میری بات کو بہتر سمجھیں گے۔

کسی بیوی کے لیے کیسے ممکن ہے کہ اپنی زندگی کا رابطہ شوہر سے توڑے پھر چاہے کہ وہ اپنے معاملات کو جس طرح چاہے چلائے۔

اگر سچی بات سمجھنا چاہتے ہیں تو۔ نان و نفقہ کی پابندی اڑانے۔ کی مہم میں ان مردوں کی ملک چھی ہے جو خواتین کی زینت و آرائش اور فضول خرچیوں سے عاجز آچکے ہیں۔ یہ لوگ آزادی و لذت کے نام سے فائدہ اٹھا کر فیشن پرست فصول خرچہ بیویوں سے اپنا انتقام لے رہے ہیں ویل ڈیورینٹ نے اپنی کتاب "پلیئر آف فلائمنی" میں نئی شادی کے بیاں میں لکھا ہے :

"قانونی شادی، قانونی طور پر محل سے دوری، اور صرغین کی رضامندی سے

طلاق، اور اولاد و نفقہ نہ ہونے کی ذمہ داری کا نام ہے۔"

... فیشن پرست، متوسط طبقے کی خواتین، محنت کش مردوں کے لیے بہت جلد انتقام کا باعث بنیں گی جس کا نشانہ جنس خواتین ہوگی۔ شادی کے معنوں میں ایسی تبدیلی آئے گی کہ ایسی عورتیں پیدا ہو جائیں گی جو سرمایہ زینت اور بڑے مصارف رکھنے والے گھروں کی وحشت کا سبب بنیں۔ مرد مطالبہ کریں گے کہ بیویاں خود پودے کریں۔ دوستانہ شادی (نئی شادی) کا غاصب ہے کہ بیوی محل کے وقت تک کام کرے۔ یہاں ایک نکتہ ہے جو عورت کی آزادی کو مکمل کر دے گا۔ وہ ہے کہ عورت شروع سے آخر تک اپنے اخراجات خود ہی بھرے کیا کرے۔ صفتی انقلاب اپنے ظالمانہ نتائج۔ عورت کے بارے میں۔ دکھا رہا ہے۔ عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ کارخانے میں کام کرنا چاہئے۔ بیوی کا کمرے میں اکیلے بیٹھے رہنا اور مرد کا بیوی کے بے کار رہنے کے عوض میں دو گنا کام کرنا کیوں ضروری ہے۔ بیوی کو بھی کام اور صلے، تنخواہ اور محنت کشی میں میاں کے برابر ہونا چاہیے۔"



## شوہر کی جگہ دولت

تولید نسل کی فطری ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ مالی و اقتصادی لحاظ سے کسی نقطہ اعتماد سے وابستہ ہو۔ یہ حقیقت قابل انکار نہیں

ہے۔ آج پورپ میں ایسے فرد ہیں جنہوں نے آزادی نسوان کو وہاں پہنچا دیا ہے کہ مادیاتی آج بگڑا اور باپ خاندان سے بالکل جدا کر دیا جائیگا۔ عورت کی مکمل اقتصادی آزادی، اور تمام حالت و صورت میں مرد کی برابری کے بعد باپ عضو زائد بن کر خاندان سے نظر انداز ہو جائے گا۔

یعنی اسی ماحول میں یہ لوگ باپ کی جگہ دولت کو بٹھاتے ہیں دولت کو باپ کی جانشینی قبول کرنے کی درخواست دیتے ہیں، وہ اس پر تیار نہیں ہوں گے کہ عورت تنہا خاندان بنائے اور ساری ذمہ داریاں اُسے دیں کہ وہی مالی امداد بھی فراہم کرے اور حمل و تولید نسل سے دور ہو جائے۔ انہیں معاشرے و نسل کے ختم ہو جانے کا بھی خیال ہوگا یعنی گھریلو عورت اگر گزشتہ دور میں "نفقہ خور" اور بقول معترض "مرد کی مملوکہ تھی، تو مستقبل میں وہ نفقہ خور اور دولت کی باندی ہوگی اور باپ کا منصب اور اس کے فرائض اُسے منتقل ہو چکے ہوں گے۔

کاش، جو لوگ نکلیں بند کر کے کنبہ کے مقدس ماحول کو جو قوانین مقدس آسمانی پر استوار ہے، کدیاں مار مار کر گرا رہے ہیں۔ وہ اپنے کرتوتوں کے نتائج اور اس دور کے اثرات کو بھی سوچتے ہیں۔

برٹرینڈ رسل نے "میرج اینڈ مورل" میں ایک فصل کا عنوان رکھا ہے۔ کنبہ اور حکومت۔ اس میں بچوں کی تعلیم اور صحت کے بارے میں حکومت کی مداخلت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

بظاہر باپ بیاہوجیکی وجود کے تمام اسباب تھے کچھ چکا ہے.....

باپ کو نکالتے ہیں ایک مؤثر عامل اور ہے اور وہ عورتوں کا مادی طور پر آزاد ہونے کا رجحان ہے۔ جو خواتین آج کل پیکشن میں دوتی ہیں۔ عموماً گھریلو نہیں ہیں۔ گھریلو کے اختراعات بھی مجرد خواتین سے زیادہ ہیں۔ اور باوجود فنی و امتیازات کے کام میں مقابلے کی وجہ سے پیچھے رہ جاتی ہیں... گھریلو بچوں کیلئے دوراتے ہیں جن سے وہ اپنی اقتصادی آزادی برقرار رکھ سکتی ہیں۔

۱۔ اپنے کام میں مصروف رہیں و دفتر جائیں بچوں کی دیکھ بھال کیلئے کھدیاں نوکر رکھیں اور بچوں کو ان کے حوالے کر دیں۔ اس کے نتیجے میں پورے گھریلو اطفال اور کنگڈ گارڈن نامی اداروں کی فراوانی ہوگی۔ آخر کار غنیاتی طبقے کے بچے کا نہ باپ رہے گا نہ ماں۔

۲۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ جوان بیویوں کو مالی امداد، ماہانہ خرچ دیں کہ وہ خود اپنے بچوں کی دیکھ بھال کریں۔

آخری طریقہ، بجائے خود اس وقت تک مفید نہ ہوگا جب تک اس کی نئی ذمہ داری یعنی بچے کی معین عمر تک پرورش کے بارے میں قانون وضع نہ ہو مگر یہی ایک راستہ ہے جس میں خصوصیت یہ ہے کہ ماں خود اپنے بچے کو پالے گی بڑھ کر رہے گی۔

اور اس عمل میں کسی طرح بھی مرد کی نظر میں حقیر نہ ہوگی..... اس قانون کی تکمیل کے بعد کنبہ کے اخلاق پر اس کے رد عمل کا انتظار کرنا ہوگا ممکن ہے قانون یہ بات کہ غیر قانونی بچہ جننے والی ماں شوہر کی مالی امداد کی مقدار نہ ہوگی یا پھر ماں کی زنا پر موجود دل لگی کے بعد خود باپ کو مالی امداد کی تجویز سامنے آئے۔ اس صورت میں مقامی پولیس کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ گھریلو خواتین کی نگرانی کرے۔ اس قانون کے نتائج بہت روشن نہ ہوں گے۔ اور یہ خسرہ بھی ہے کہ جو لوگ اس اخلاقی ارتقا کا مزہ کچھ رہے ہیں وہ اس موثر





ان دونوں دفعات میں ضمنیہ بات مافی گئی ہے کہ جو مرد کنبہ بنائے اسے زن و فرزند کا نظیر داشت کرنا ہوگا۔ اور ان کے خراجات مرد کے ضروری اخراجات میں محسوب ہوں گے۔ منشور حقوق نسائی نے باوجودیکہ توضیح کر دی ہے کہ مرد و زن کے حقوق مساوی ہیں پھر بھی شوہر کا بیوی کو نفقہ دینا مخالف مساوات حقوق مرد و زن نہیں قرار دیا ہے۔ بنا بریں جو لوگ ہمیشہ منشور حقوق نسائی کی تائید کرتے ہیں اور فخر پر سند پیش کرتے ہیں کہ ملک کے دونوں ایوانوں نے اس کی تائید کی ہے وہ۔ نفقہ۔ کے مسئلے کو حل شدہ اور مسلمہ سمجھ لیں۔ اور کیا مغرب پرست حضرت جو۔ سدھم کے رنگ سے ہر رنگی ہوئی چیز کو رجعت پرستی اور غیر ترقی یافتہ بات سمجھتے ہیں، وہ اجازت دیں گے کہ منشور حقوق نسائی کے آستانہ محترم کی بھی تو بین فہم اور۔ لے بھی مرد کی مالیت اور عورت کی ملکیت کی دستاویز قرار دیں گے۔

اور آگے بڑھیے منشور حقوق نسائی پچیسویں دفعہ ہے:

”بشر خاص کا حق ہے کہ بیکاری، بیماری، اعضا کی کمی، بیوگی، بڑھاپے یا اور دوسرے مقامات کہ جہاں اردو نسائی سے باہر ہونے کی وجہ سے معاشی انتظام ہاتھ نہ آ سکے، وہاں آبرو مندانہ زندگی سے فائدہ اٹھائے۔“

اس مرحلے میں منشور حقوق نسائی نے اس سے قطع نظر کہ شوہر کی موت کو بیوی کے لیے ذریعہ معاش کا خاتمہ مانے۔ بیوگی کو بیکاری، بیماری اور نقص اعضا کی فہرست میں رکھا ہے۔ یعنی خواتین کو بیکاروں اور بیماروں، بوڑھوں اور افراد ناقص اعضا کے برابر لکھا ہے۔ کیا یہ خواتین کی بہت بڑی توہین نہیں ہے؟ بڑے ہے، اگر مشرق کے کسی علاقے میں کسی کتاب یا قانون کے اندر اس قسم کی تعبیر لوگوں کے ہاتھ نہ جاتی تو اعتراضات و احتجاجات کا ہنگامہ آسمان تک جاتا جس کی مثال ہم اپنے بعض قوانین کے بارے میں دیکھ چکے ہیں۔

ایک حقیقت پسند اور متعلق پر نظر رکھنے والا آدمی جو ہنگامہ آرائی سے نہ ڈر ہو، وہ تو بات کے تمام پہلو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ:

نہ قانون تخلیق نے مرد کو، عورت کے لیے وسیلہ معاش بنایا ہے۔ نہ منشور حقوق نسائی۔ نہ مرد کو وسیلہ معیشت مانا ہے اگرچہ اس نے بیوہ کو وسیلہ کھو بیٹھنے والی کہا ہے۔ نہ قانون مذم ہے جو بیوی کو مرد کے لیے واجب النفقہ سمجھتا ہے کسی نے عورت کی توہین نہیں کی ہے۔ سب بات یہ ہے کہ فقیر کا ایک پہو یہ ہے کہ عورت مرد کی نیاز مند پیدا ہوئی ہے اور مرد عورت کے لیے نقطہ اعتماد ہے۔

زن و مرد کو زیادہ بہتر و بیشتر انداز میں باہم رہتے رہنے اور کہنے کے ماحول کو معاش و خوشحالی بشر سے استوار کرنے کی خاطر قانون خلقت نے ایک دوسرے کا نیاز مند پیدا کیا اس نے اگر مرد کو مالی اعتبار سے عورت کا مرکز اعتماد بنایا تو عورت کو نفسیاتی سکون کے اعتبار سے مرد کا نقطہ اعتماد خلق کیا۔ ان دو مختلف نیاز مند یوں کے سبب ایک کو دوسرے سے قریب اور متحد رہنے میں مدد ملتی ہے۔

## تواں حصہ :

### مسئلہ میراث

- اسلام نے عورت کی میراث میں عدم توازن کو ختم کیا۔
- بیوی کے وارث ہونے کا پہلو، مہر و نفقہ کی بنیاد پر ہے، اس کی علت و وجہ نہیں ہے۔
- اگر فقط اقتصادی پہلو زیر نظر ہوتا تو، زن و مرد کی میراث میں اسلام فرقی کا قائل نہ ہوتا۔
- مرد کی میراث کا دوگنا ہونا اس وجہ سے ہے کہ مرد کے بچے پر دوسرے بوجھ بھی پڑتے ہیں۔

خدمتِ معارفِ رضویہ



## مسئلہ میراث

قدیم دنیا میں یا تو عورت کو ترکہ بالکل نہیں دیا جاتا تھا یا ترکہ دیتے تو تھے مگر اس سے بچوں جب سوگ کرتے تھے۔ یعنی اسے آزادی اور قانونی حیثیت نہ دیتے تھے۔ پرانی دنیا قوانین میں کہیں بڑی کو میراث دی جاتی تھی مگر اس کی اولاد محروم رہتی تھی، برخلاف لڑکے کے، وہ خود بھی ترکہ تبا اور اس کی اولاد کو بھی دادا کا ترکہ لینے کا حق تھا۔ دنیا کے کچھ حصوں میں عورت کو مرد کی طرح ترکہ دیتے تھے، مگر کوئی قطعی حصہ معین نہ تھا، بلکہ قرآنی تعبیر کے مطابق نصیب مفروض۔ فرض کردہ حصہ۔ صورت یہ تھی کہ عورت کو حق تھا وہ اپنی لڑکی کے بارے میں اگر چاہے تو وصیت کر دے۔

میراث خواتین کی تاریخ بہت طولانی ہے، محققین اور باخبر حضرات نے بڑی بڑی نجی لکھی اور تحریریں چھوڑی ہیں ان کی لکھی اور کہی ہوئی باتوں کا دھڑا ضروری نہیں سمجھتا کہ انہیں نقل کر دیا، بحث، خلاصہ ذکر کر دیا ہے۔

**میراث سے عورت کی محرومی کے اسباب** عورتوں کی میراث سے محرومی کا اصل سبب تو یہ تھا کہ دولت ایک

خاندان سے دوسرے خاندان میں نہ جسنے پاسے، قدیم عقائد کے مطابق تولید فرزند میں ان کا حصہ کم سمجھا جاتا تھا، ماں، ایک طرف تھی جس میں بچہ لفظ رہتا اور پرورش پاتا اور ولاد کی صورت بن جاتا۔ ہذا وہ لڑکے اولاد کہلاتے اور اسی کے خاندان کا جز بنتے۔ لڑکیاں اولاد لڑکی کے خاندان کے افراد ہونے کے بجائے اس کے شوہر کے خاندان سے متعلق مانے جاتے تھے۔ لہذا، جب لڑکی وارث ہوتی تو اس کی وارثت اس کے بچوں کو ملتی اور

... جہاں دوسرے خاندان میں چلی جاتی۔

”ارت در حقوق مدنی ایران“ تالیف، ڈاکٹر موسیٰ عمید مرحوم کے صفحہ آٹھ پر یہ گفتگو ہے کہ قدیم ادوار میں خاندانوں کی بنیاد مذہب بناتا تھا، قطری روابط کا اثر نہ تھا۔ آگے لکھتے ہیں:

”مذہبی سربراہی کنہوں کے اندر ”پدر شاہی“ تھی جو بڑے باپ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے بعد مذہب کے رسم و رواج و آداب کی ادائیگی اولاد ذکور میں کیے بعد دیگرے منتقل ہوتی، گزشتہ زمانے کے لوگ بقا و نسل کا سبب مرد کو جانتے تھے۔ اور کہنے کا باپ جس طرح اپنے بیٹے کے لیے زندگی بخش ہوا اسی طرح اپنے رسم و رواج و مذہبی آداب کی نگہداشت، خاص بھجن بھی اسی کے سپرد ہوتے تھے۔ ہندوؤں کی وید، اور یونان و روم کے قوانین میں درج ہے کہ۔ قوت تولید فقط مردوں کے پاس ہے۔ اس قدیم عقیدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانوں کے مذہب مردوں سے مخصوص ہو گئے۔ اور خواتین باپ یا شوہر کے بغیر مذہب کے معاملے میں دخل نہیں دے سکتی تھیں۔۔۔۔۔ چونکہ مذہبی امور انجام دینے سے محروم تھیں لہذا خاندانی امتیازات سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ اس کے بعد دالے مرحلے میں جب ”وراثت“ ایجاد ہوئی تو عورتیں اس حق سے محروم ہو گئیں۔“

خواتین کی وراثت سے محرومی کے اسباب و علل اس کے علاوہ بھی ہیں، ایک ان میں سپاہی و فوجی بننے کے لیے طاقت کی کمی ہے جس تمدن میں پہلوانی و دلاوری کی بنیاد۔ غزاز و اختیار ملتا تھا، ایک فوجی کو ہزاروں غیر فوجیوں پر برتری دی جاتی تھی، لہذا عورت دفاعی اور فوجی کام نہ کرنے کی بنا پر وراثت سے محروم کی گئی۔

جاہلیت (دور قبل از اسلام) کے عرب بھی اسی بنیاد پر میراث زن کے خلاف تھے اور جب تک وہ مرد کی طرح ثابت قدمی نہ دکھاتی تھی اس وقت تک ترکہ نہیں دیتے تھے۔ لہذا جب آیت ارث نازل ہوئی:

لِلْحَرَامِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ  
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ  
أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا۔ (القرآن الکریم / سورۃ النساء / ۷)

ماں باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں مردوں کا حصہ ہے، اور والدین  
و اہل قرابت کے ترکے میں عورتوں کا حصہ ہے۔ خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ،  
یہ حصہ عین شدہ ہے۔

عربوں کو بڑا تعجب ہوا۔ انھیں دنوں مشہور شاعر حسان بن ثابت کے بھائی  
کا انتقال ہو انھوں نے اپنے ہمساز گاں میں بیوی اور کئی رکیاں چھوڑیں، اس کے چچا  
زاد نے ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ بیوہ اور بچوں کو کچھ نہ دیا، بیوہ اپنی شکایت رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے کر حاضر ہوئی، آنحضرتؐ نے سب کو طلب فرمایا۔ ان  
لوگوں نے کہا کہ ہم ہیں تو شمشیر کج ہوتے اور اپنا نینران عورتوں کا دفاع کرتے ہیں۔  
دولت بھی ہمیں ملنا چاہیے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم الہی سنایا  
اور فرمان خدا نافذ کیا۔

**منہ بولا لڑکا وارث ہوتا تھا** جاہلیت میں عرب کسی کو بیٹا بنا لیتے تھے اور آخر  
میں وہی منہ بولا لڑکا مرنے والے کا حقیقی وارث

قرار پاتا تھا۔ منہ بیتی کی رسم دوسری قوموں میں بھی تھی، جیسے ایران، قدیم روم.....  
اس رسم کے مطابق منہ بیتی کو وہ امتیازات حاصل ہو جاتے تھے جو حقیقی بیٹوں کو حاصل نہ ہوتے  
تھے۔ منہ بیتی کی ایک ہیئت یہ تھی کہ وہ ترکہ حاصل کرنا تھا، یا بیٹا بنانے والا منہ بولے  
بیٹے کی بیوی سے شادی نہیں کر سکتا تھا یہ بھی ایک امتیازی بات تھی، قرآن کریم نے اسے  
بھی ختم کیا۔

**بہم پیمان کا ترکہ**  
**صنا من الجریک**  
عربوں میں یہ رسم بھی تھی کہ دو اجنبی آدمی آپس میں معاہدہ کرتے  
تھے:-

میرا خون تمہارا خون ہے۔ مجھے سے تم سے کمر ہے  
میں تمہاری وراثت لوں گا تم میرے وارث بننا۔

اس معاہدے کی رو سے یہ دونوں غیر آدمی ایک دوسرے کا دماغ کرتے، حفاظت  
جان و مال کرتے اور ان میں جو پہلے ملتا دوسرا اس کا وارث بنتا تھا۔

**بیوی، ترکہ کا حصہ بھی** کبھی کبھی عرب، مرنے والے کی بیوہ کو بھی مال و جاہ  
میں شمار کرتے اور میراث کا ایک حصہ سمجھ کر اس سے  
وہی معاملہ کرتے تھے۔ اگر مرنے والے کا دوسری بیوی سے کوئی لڑکا ہوتا تھا تو اس  
لڑکے کو حق تھا، وہ بیوہ کے منہ پر دو مال یا چارہ ڈال دیتا اور اسے اپنے قبضہ میں لے  
لیتا، یہ اسے اختیار تھا کہ اس سے شادی کر لے یا کسی دوسرے شخص سے اس کی شادی کر دے  
اور اس کا مہر خود حاصل کرے۔ یہ رسم بھی عربوں کے عداوہ دوسری قوموں میں موجود تھی،  
سلام نے اسے بھی منسوخ کیا۔

ہندوستانی، جاپانی، رومی، یونانی اور ایرانی قوموں کے قوانین میں میراث کے  
سلسلے میں جتنی بندی بہت تھی، اگر صاحبان علم کے اطلاعات ہم نقل کرنا شروع کریں تو  
کئی مقالے تیار ہو جائیں گے۔

**ساسانی عہد کے ایران**  
**میں عورت کا وارث ہونا**  
سعد نفیسی مرحوم نے "تاریخ اجتماع ایران از زمان  
ساسانیان تا انقراض امویاں" میں صفحہ ۴۲ لکھا  
ہے:-

"خاندان کی تشکیل کے سلسلے میں ایک اور دلچسپ نکتہ جو ساسانی تمدن میں دکھائی  
دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جب لڑکا بالغ و دانش مند ہوتے لگتا تو باپ اپنی متعدد بیویوں



میں سے ایک کی اس سے شادی کر دیتا تھا۔ ایک اور نکتہ۔ ساسانی تہذیب میں عورت کو قانونی حیثیت حاصل نہ تھی۔ باپ اور شوہر کے اختیارات اس کی ملکیت کے بارے میں بہت وسیع تھے۔

• بڑی پندرہ برس کی ہوتی اور جوانی آجاتی تو باپ یا خاندان کا سردار سے بیاہنے کو پابند تھا۔ لیکن بڑے کی شادی بیس سال میں ضروری سمجھتے تھے۔

• شادی میں باپ کی رضامندی شرط تھی۔

• جو بڑی بیاہ جاتی وہ باپ یا اپنے سربراہ کی وارث نہیں ہو سکتی تھی۔

• شوہر کے انتخاب میں بڑی کے کسی حق کو نہیں مانتے تھے۔

• باغ ہونے کے بعد اگر باپ شادی کرنے میں کوتاہی کرنا تو بڑی کو ناجائز شادی کا حق تھا مگر وہ باپ کی میراث سے محروم ہو جاتی تھی۔

• ایک مرد یا تعداد بیویاں بنا سکتا تھا، یونانی دستاویزات میں تو یہ بھی ملتا ہے کہ ایک ایک آدمی کی کئی کئی سو بیویاں تھیں۔

• ساسانی دور میں، زرتشتی مذہبی کتابوں کے بموجب شادی کے بڑے پیچیدہ اصول تھے، اور پانچ طرح کی شادیاں عام تھیں:

- ۱۔ جو عورت، ماں باپ کی اجازت سے شوہر کے گھر جاتی اور اس کے یہاں بچے ہوتے تھے تو وہ بچے اس دنیا اور دوسری دنیا میں اسی کی اولاد ہوتے۔ اسے "پادشاہ زن" کہتے تھے۔
- ۲۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی۔ "اوگ زن" کہلاتی یعنی، یگانہ عورت۔ اس کے یہاں جو پہلا بچہ ہوتا وہ نانا، نانی کو دے دیا جاتا تھا کہ ان کے بیٹے کی جگہ لے لے گویا وہ بچہ انہیں کے گھر سے گیا تھا اور میاں بنایا تھا۔ اس کے بعد یہ عورت بھی "پادشاہ زن" کہی جاتی تھی۔
- ۳۔ اگر آدمی باغ ہونے کے بعد بن بیاہر جاتا تو اس کا خاندان اجنبی عورت کو جہیز دیتا اور غیر آدمی کے ساتھ بیاہ دیتا۔ اس عورت کو "سز زن"۔ منہ بولی بیوی۔

تے تھے۔ اس کی اولاد آدمی اس مردہ آدمی کی قرار پاتی اور اس دنیا میں اس کی اولاد کہی جانے لگتی تھی، اور آدمی اولاد زندہ شوہر کی ہوتی۔

۴۔ یہ وہ گردوسرا شوہر کہتی تھیں تو اسے "چغرن زن" نام دیتے۔ یعنی چاکر زن، نوکر بیوی۔

۵۔ ماں باپ کی اجازت کے بغیر شوہر کے گھر جانے والی عورتیں بہت پست سمجھی جاتی تھیں اور اس قسم کی بیوی کو "خودسری زن"۔ خود سر۔ بیوی کہتے تھے۔ اسے ماں باپ کی میراث نہیں ملتی تھی اور اسے "اوگ زن" کے طور پر نکاح میں لاتے تھے۔

اسلام کی نظر میں میراث کے سلسلے میں قوانین اسلام کے اندر گزشتہ دور

عورت کا حصہ میراث میں کوئی نامواری موجود نہیں ہے۔ جو چیز قانون اسلام میں معتبر نہیں کے قابل اعتراض ہے وہ مرد کے مقابلے میں

عورت کا نصف ہیم ہے۔ یہاں مرد و زن کی مساوات کا دم بھرنے والے بولتے ہیں۔

• روکا۔ دو لڑکیوں کے برابر حصہ دار ہے۔

• بھائی۔ دو بہنوں کے برابر حصہ پائے گا۔

• شوہر۔ کا حصہ دو بیویوں کے برابر ہوگا۔

فقط ماں باپ کا حصہ الگ ہے، یعنی اگر مرنے والا والی اولاد چھوڑ کر جائے اور اس کے ماں باپ بھی زندہ ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ میت کے مال سے ملے گا اس کا سبب علت کہ اسلام نے ہم وراثت عورت کو، مرد کے ہم میراث سے آدھا رکھا۔ خاص حالات سامنے رکھنا ہوں گے۔ جیسے، عورت، مہر، نفقہ، فوجی خدمت اور قانون

نزاعیں جداگانہ قوانین رکھتی ہے۔ یعنی عورت کی میراث لینے میں خصوصی حیثیت (مطلوب) مہر و نفقہ وغیرہ کی بنیاد (علت) پر مبنی ہے۔

اسلام۔ گزشتہ مقالات میں دلائل دیے جا چکے کہ مہر و نفقہ کو رشتہ ازدواج کے

استحکام میں موثر اور کنبے کی آسائش میں ضروری عنصر اور زن دشوہ میں اتحاد کے ذرائع سمجھتا ہے۔ اسلام کی نظر میں مہر اور نفقہ علی الخصوص نفقہ کو ختم کر دینا، کنبے کی بیوی کو اپنے ورثہ کی کو فحش و منکرات کی طرف کھینچنے کا سبب ہے۔ اس طرح عورت کی زندگی کا بھٹ کم ہوتا ہے اور مرد پر ایک بوجھ آ پڑتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس بوجھ کا تدارک میراث سے کر دے۔ لہذا، شوہر کو بیوی کا دو گن حصہ دیا۔ یعنی مہر و نفقہ نے عورت کے ہم ارث کو کم کر دیا۔

**مغرب پرستوں کا اعتراض** کچھ مغرب پرست جب اس موضوع پر داد سنی دیتے ہیں اور میراث میں عورت کے حصے کو بنیاد بنا کر اسلام کے خلاف غوغا برپا کرتے ہیں۔ مہر و نفقہ کو سامنے رکھ کر فرماتے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ میراث میں عورت کا حصہ کم رکھ کر، مہر و نفقہ سے اس کا تدارک کریں؟ کیوں بیدار کام کریں۔ کیوں گردن کے پیچھے سے ہاتھ لاکر لقمہ کھائیں ہیں پہلے عورت کا حصہ میراث مرد کے برابر کرنا چاہیے تاکہ مہر و نفقہ سے اس کا تدارک نہ ڈھونڈنا پڑے۔

اول تو ان سے زیادہ محبت کرنے والی کھائوں نے عنث کو معلول سمجھ رکھا ہے۔ ان کے خیال میں مہر و نفقہ، میراث خواتین کے لیے معلول ہے، ان کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ میراث میں عورت کی حالت و خیت خاص معلول مہر و نفقہ ہے۔

دوسرے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں جو کچھ ہے وہ مالی و اقتصادی پہلو ہے اور بس ظاہر ہے کہ اگر فقط مالی اور اقتصادی پہلو ہی زیر نظر ہوتا تو کوئی دلیل نہیں تھی کہ مہر و نفقہ زیر نظر نہ آیا پر عورت کا حصہ مرد سے مختلف ہوتا۔ جیسا کہ ہم گذشتہ مقالے میں لکھ چکے ہیں۔ اسلام نے بہت سے پہلو سامنے رکھے ہیں۔ طبعی و فطری اور نفسیاتی زاویے۔ ایک طرف ضروریات اور تولید کے پہلو سے اس کی بے اندازہ مشکلات و تکالیف جبکہ مرد اس مشکل سے آزاد ہے۔ دوسری طرف، تولید اور دولت کمانے میں مرد کی نسبت عورت میں قوت کم ہے۔ تیسری طرف، وہ مرد سے زیادہ سرمایہ استعمال کرتی ہے۔

نیز نفسیاتی اور روحانی کیفیات یعنی مرد و زن کے احساسات جدا جدا ہیں مثلاً مرد شہ عورت پر روپیہ صرف کرنے کا رجحان رکھتا ہے۔ اور سب آخر میں۔ معاشرتی و نفسیاتی و تنقید معاملات جو خاندانی بندھن کو مضبوط بناتے ہیں۔ اسلام نے سب باتوں کو ملحوظ رکھ کر مہر و نفقہ کو لازم قرار دیا۔ یہ ضروری و لازمی امور مرد کے اخراجات میں خاص ذمہ داری کے وسائل اسباب ہیں۔ اس کے بعد اسلام نے حکم دیا کہ ذمہ داریوں کی تلافی کے لیے مرد کے حصے کو عورت کے حصے سے دگن رکھا جائے۔ تو فقط مالی پہلو ہی نہیں ہے کہ سوال اٹھایا جائے کہ ایک جگہ عورت کا حصہ کم کر کے دوسری جگہ اس کا مدد و اکرے کی ضرورت کیا ہے۔ ہم نے کہا ہے۔ اسلام کی نظر میں مہر و نفقہ علت و سبب اور عورت کی میراث میں صورت حال معلول (مُسَبَّب اور نتیجہ) ہے۔ یہ بات دور اول میں بھی موضوع بحث رہی ہے، کوئی نئی بحث نہیں ہے جو آج سامنے آئی ہو۔

دوسری صدی ہجری میں ایک شخص ابن ابی العوجا گذرا ہے۔ یہ نہ خدا کو مانتا تھا نہ مذہب کا معتقد، اس دور کی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ملحدانہ عقائد کا پروپیگنڈا کرتا تھا، ہر جگہ پہنچتا حتیٰ کہ مسجد الحرام اور مسجد النبیؐ میں بھی علماء سے بحث کرنے جاتا اور تومید و معاد اور دوسرے مولد اسلام پر جرح و فحش کرتا تھا۔ اس دم پر اعتراضات میں اس کا ایک اعتراض یہ تھا:

مَا بَالُ الْمَلَائِكَةِ الْمُسْكِينَةِ الضَّعِيفَةِ تَأْخُذُ سَهْمًا وَيَأْخُذُ الرَّحْمَنُ سَهْمَيْنِ۔

غریب و کمزور عورت تو ایک سہم، حصہ لیتی ہے و مرد جو اس سے زیادہ مضبوط ہے وہ دو سہم حصہ کیوں لیتا ہے؟

یہ بات اسلامی عدل کے خلاف ہے!



امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

وجہ یہ ہے کہ اسلام نے جنگجو سپاہی کی ڈیوٹی عورت اٹھالی ہے اور بعض نادانستہ جرم جن میں دیت پنا پڑتی ہے عورت کی سزا، دوسرے کی شرکت کے ساتھ معاف کر دی ہے۔ لہذا ترکہ میں عورت کا حصہ مرد سے کم رکھا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے واضح بیان کے بعد معلوم ہو گیا کہ میراث میں عورت کی خاص نوعیت معلول (نتیجہ) ہے مہر و نفقہ کا شوہر پر واجب ہونے اور فوج میں بھرتی ہونے اور دیت دینے سے معافی کا۔

اس قسم کے سوال تمام ائمہ علیہم السلام سے کئے گئے اور ان حضرات نے اسی انداز میں جواب دیے ہیں۔

## دسواں حصہ :

# طلاق

- — طلاق میں روز افزون اضافہ - بیسویں صدی کی بیماری۔
- — آج کی دنیا ایک طرف سماجی طور طلاق کے اسباب پیدا کر رہی ہے۔ دوسری طرف قانون کے زور سے اسے روکنا چاہتی ہے۔
- — طلاق کے بارے میں پابندی مفرود ہے۔
- — شادی کا تقدس کا تقاضہ کیا یہی ہے کہ طلاق کی راہ بند کر دی جائے؟
- — سماجی مشکلات فقط قانون سے حل نہیں ہو سکتے۔
- — طلاق، اسلام کی نظر میں سب سے زیادہ نفرت کی چیز ہے۔
- — کیا یہ صحیح ہے کہ امام حسن مطلق بہت دیا کرتے تھے؟
- — جہاں اساسی بنیاد جزیہ ہو وہاں قانون کا جبر کچھ نہیں کر سکتا۔
- — شوہر کی محبت کا شعلہ ٹھنڈا ہو جائے تو کنبے کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور بیوی کی محبت کا شعلہ ٹھنڈا پڑ جائے تو اسے نیم جان کر دیتا ہے۔
- — اسلام، عورت کو زبردستی مرد کے سر تھوپنے کا حامی نہیں ہے۔
- — یورپ نے فسادِ تباہی و انحراف کو بڑھاوا دینے کی خاطر میان

بیوی کو برابر کا حصہ دیا ہے۔

مرد کو ہمارے، بیوی جو ہمارے بچے پھول اور کھیاں۔

میاں بیوی میں صلح و صفائی، صلح و صلح جیسی نہیں ہو سکتی۔

سدم نے صدق کے لیے کچھ رکاوٹیں رکھی ہیں۔

قرآن کی نظر میں کتبے کی عدالت۔

جس قانون نے شادی کو باہمی رفاقت کا روپ دیا وہی طلاق کی حقیقت

سنائی، بھی بنا سکتا ہے۔

صدق کا حق درہے فسخ کا حق اور ہے۔

طلاق، قضی حق کے طور پر مرد ہی سے مخصوص ہے، لیکن معاہدے

کے طور پر عورت بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

عدالتی طلاق۔

طلاق غیر طبعی عمل تولید کی طرح آپریشن اور عمل جراحی ہے۔

اسلام کے پاس کوئی ایسا قانون نہیں جسے سرطان کہا جائے۔

حق ملکیت کی انہیں بند کرنے کے سلسلے میں اسلام کی تدبیریں اور

نوٹے

سدمی اصول، نگہداشت یا بحسن خوبی رہائی

(غلام مطالب از مؤلف رح)

## حق طلاق

(۱)

خاندانی شیرازہ بکھرنے کا خطرہ، اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کبھی اس قدر نظر انداز نہیں کیے گئے جیسے اس دور میں کیے جا رہے ہیں، اور تاریخی کے کسی عہد میں آج سے زیادہ انسان عملی طور پر اس طرح خطرے سے دوچار نہیں ہوا۔

قانون بنانے والے، قانون جاننے والے، ماہرین نفسیات، ہر ایک یہی کوشش کر رہا ہے کہ ممکن وسائل سے شادی کی بنیاد استوار و مستحکم تر بنائیں کہ رخنہ نہ پڑنے پائے لیکن بقول مولانا رومؒ:

از قضا سر کنش گین صفر افزداد

اتفاق سے سر کے نے صفر بڑھ دیا

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ طلاق میں سالانہ اضافہ ہو رہا ہے اور اکثر خاندانوں پر تباہی کے سایے منڈلا رہے ہیں۔

عام طور سے جب کوئی بیماری خصوصی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے تو ذہنی و دماغی کے ذریعے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور اس سے مرنے والوں کی تعداد کم ہونے لگتی ہے اور کبھی کبھی وہ بیماری ختم بھی ہو جاتی ہے۔ مگر صدق کی بیماری اس کے برعکس روز افزوں رہے۔

نئی زندگی اور طلاق میں اضافہ

پرانے زمانے میں، طلاق اور اس کے برے

نتائج، اسباب و علل طلاق، اور اس سے بچنے





بات ہو سکتی ہے مگر پرستے رشتوں کے بارے میں کیا وجہ بتائی جائے گی؟ امریکی قوانین نے طلاق لینے والی عورتوں کو جو رعایت دی ہے اور اس کے پیش نظر جواب یہ ہے کہ:

دس پائیس برس کی شادی کے بعد طلاق کا سبب ناجاتی یا طبیعتوں کا اختلاف نہیں بلکہ برسوں کی پریشانیوں کو برداشت نہ کرنے کا۔ جمان اور نئی لذتوں کی ہوس اور دوسری کامرائیوں کی آرزو ہے۔ مانع حمل گولیوں اور جنسی انقلاب نیز عورتوں کی بڑھتی قدر و منزلت نے خواتین میں یہ رجحان عام کر دیا ہے کہ خاندانی بندھنوں سے آزادی میں لذت اور خوشی زیادہ ایک یوی اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ زندگی ایک ساتھ گزارتی ہے بچے پیدا ہوئی خوشی غمی میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ اچانک یوی کو طلاق کی فکر پیدا ہوگئی، شوہر میں ظاہری اور اقتصادی تبدیلی بھی نہیں مگر یوی الگ ہونا چاہتی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ کل تک تھکا دینے والی زندگی برداشت کر رہی تھی مگر اب وہ ایک طرز کی زندگی نہیں چاہتی۔۔۔۔۔ آج کی امریکی عورت کل کی عورت سے زیادہ موقع پرست ہے اور اپنی دادی کے مقابلے میں برداشت نہ رکھنے والی عورت ہے۔

**ایران میں طلاق** طلاق میں فراوانی امریکہ ہی میں نہیں، یہ اس صدی کی دہے۔ جہاں بھی یورپ کے رسم و رواج عام ہوں گے وہاں طلاق کے شماریات میں اضافہ ہوگا۔ مثلاً ہم اپنے ایران ہی کو دیکھیں، شہروں میں طلاقوں کی تعداد دیہاتوں سے زیادہ ہے۔ درتہران جہاں مغرب کے آداب و انداز زیادہ اثر کر چکے ہیں، دوسرے شہروں سے آگے۔

روزنامہ اطلاعات، شمارہ ۱۱۵۱۲ میں ایران کے نکاح و طلاق کے شماریات چھپے تھے جس میں تھا:

”رجسٹرڈ طلاقوں میں جو تھے سے زیادہ حصہ صرف تہران کا ہے۔ یعنی تیس فی صد طلاق تہران میں واقع ہوئے ہیں۔ حالانکہ ملک کی آبادی کے لحاظ سے

تہران کی آبادی دس فیصد کا تناسب رکھتی ہے مجموعی طور پر تہران میں سو نکاح اور سو طلاق ہوتے ہیں۔ تہران میں شادیوں کی تعداد پورے ملک کی نسبت سے پندرہ فی صد ہے۔“

**مریکہ میں طلاق کی افترالش کی ہوا:** اچھا اسے چھوڑیے، امریکہ میں طلاق کی بات آگئی تو سیئے، نیوزویک سے نقل کیا گیا ہے کہ امریکی عورت موقع پرستی اور لذت کو کہنے کی مرکزیت و نگہداشت و استحکام پر ترجیح دیتی ہے۔ ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ امریکی عورت ایسی کیوں بن گئی؟ طے ہے کہ یہ امریکی عورت کی شرت نہیں ہے۔ اس رویے کی علت و وجہ معاشرہ ہے۔ امریکی معاشرے نے امریکی عورت کو احساس درویدہ دیا ہے۔ ہمارے مغرب پرست چاہتے ہیں کہ ایرانی خواتین کو بھی اسی راہ پر ڈال دیں جس پر امریکی عورتیں چل رہی ہیں۔ اگر ان کو گناہ کی یہ آرزو پوری ہوگئی تو مسلم ہے کہ ایرانی عورت اور خاندان کی مرکزیت کا مقدر وہی بن جائے جو امریکی عورت اور امریکی خاندان کی قسمت ہے۔

نفت روزہ ”باشاد“ شمارہ ۶ (۲۴/۵/۶۶) ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا: ”دیکھیے بات کہاں تک پہنچی، کہ فرانسیسی قوم کی اولاد بھی اٹھی کہ امریکیوں نے نئی شورش برپا کی ہے۔“ روزنامہ فرانس سوار کا مقالہ ہے کہ دوسرے زیادہ ریٹورنٹ اوکیسیرے، کالیفورنیا میں ایسے کھلے ہیں جہاں پیش خدمت لڑکیاں کھلے سینوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔

اسی مضمون میں تحریر ہے کہ ”مونو کینی“ مایوٹی جو عورتوں کے سینہ بند کھلاتے ہیں، صاحب سان فرانسسکو اور اس انجلیس میں لباس کے ماہر نے گئے ہیں۔

نیویارک میں متعدد ایسے سینماؤں کی نشان دہی کی گئی ہے جہاں کی فلمیں فقط جنسی عمل اور جنسی مسائل اور عریاں تصویریں دکھاتی ہیں۔ ان فلموں کے چند نام یہ ہیں:



”وہ تو ہر جو اپنی بیویوں کا باہمی تباہ کرتے ہیں۔“

”وہ بڑیاں جو اخلاق کے خلاف ہیں۔“

”جو کچھ نہیں پہنتیں۔“

ڈیٹرن کی - ہسٹری میں شاید کوئی ایسی کتاب ہو جس کی پشت پر برہنہ عورت کی تصویر نہ ہو، کھاسکی اور ادب عالی کے تصانیف بھی اس سے خالی نہیں۔ اس قسم کی کتابیں بکثرت موجود ہیں :

”امریکی شوبزوں کی جنسی حالت“

”مغربی مردوں کی جنسی حالت“

”بیس سال سے کم عمر جوانوں کی جنسی حالت“

”نئی طلاق کی روشنی میں نئے جنسی رویے“

فرانس سوار کا مضمون نگار تعجب دہشتانی کے عالم میں خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔

امریکہ کہاں جانا چاہتا ہے ؟

باشا دیکھتا ہے :

”ٹھیک ہے جہاں تک جانا چاہتا ہے جائے۔۔۔ ہمارا دل تو اُن مٹھی بھر

ہم وضوں کے بارے میں جلتا ہے جن کے خیال میں انھوں نے ایک مناسب

ماڈل اختیار کر لیا ہے اور اس سلسلے میں انھیں اپنے سراپا کا ہوش نہیں

رہا ہے۔“

معلوم یہ ہوا کہ اگر امریکی عورت دیوانی ہو گئی اور کام نکالنے اور ہرجائی بننے کو

ایک کی پور ہے اور وفاداری پر ترجیح دیتی ہے، تو قصور اس کا نہیں، اس کے معاشرے

نے خاندان کے مقدس مرکز پر کدال مار کر اسے نقصان پہنچایا ہے۔

تعجب تو اس مادی گتے نیشوں پر ہے، روز بروز طلاق، اور خاندانی شیرازہ شتر

رہنے کے معاشرتی ورثے میں اضافہ کر رہے ہیں، ایک دوسرے سے دوریں آگے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد غل سے کہ طلاق کی تعداد کیوں بڑھ رہی ہے؟ یہ لوگ سبب و عوامل طلاق کو روز

فزون کرتے جا رہے ہیں اور یہ شور بھی مچا رہے ہیں کہ قانون کی جڑ بند کر کے سے روکا جائے۔

ی کو کہتے ہیں ”کچ دار و مرزہ“

مفروضے :

ہم اصل مقصد پر بحث شروع کرتے ہیں۔ پہلے عقلی طور پر دیکھیں کہ طلاق اچھی چیز

ہے یا نہیں؟ کیا طلاق کی راہ مکمل طور پر کھلی رہنا چاہئے؟ کیا خاندانوں کے شیرازوں کا

لگاتار بکھرتے رہنا اچھا ہے؟ اگر طلاق اچھی چیز ہے تو پھر جو اسباب طلاق میں اضافہ کا

باعث ہیں انھیں باقی رہنا چاہئے ان میں کیا برائی ہے۔ یا، طلاق کا سلسلہ بالکل بند کرنا

چاہئے اور شادی کا رشتہ ابدی بنا دیا جائے اور جو چیز بھی اس مقدس بندھن کو ڈھیلا

کرے اسے رد کرنا ضروری ہے۔ یا پھر کوئی تیسرا حل تلاش کیا جائے۔ قانون کو کھینچا

بیوی کے لیے یہ راستہ بند نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ کبھی بھی طلاق لازم و ضروری ہو جاتی

ہے۔ مگر قانون کی رکاوٹ نہ ہونے کے باوجود معاشرہ کو ایسی تدبیریں کرنا ہوں گی جن

وجہ سے میاں بیویوں میں جدائی نہ ہوتے پائے۔ معاشرے کو ان اسباب و عمل کا سخت

مقابلہ کرنا چاہئے جن کے نتیجے میں میاں بیوی میں علیحدگی اور بچوں کی بے گھری عمل میں

ہے۔ یہ توصیف سی بات ہے کہ اگر سماج ایسے اسباب پیدا کرتا رہے جن سے صداق و جو

میں آئے تو قانون کوئی کام اور کوئی اثر نہیں کر سکتا۔

اگر یہ فیصلہ ہو جائے کہ قانون طلاق پر پابندی نہ لگائی جائے تو کیا صورت ہو کہ آزاد

برقرار رہے۔؟ یعنی کیا یہ آزادی فقط مرد کو حاصل رہے۔ یا تنہا عورت کو یا دونوں کو

حق طلاق حاصل ہو؟ پھر اگر دونوں کو حق حاصل ہو تو کیا جو تدبیر اور جو انداز طلاق

دونوں اختیار کر سکیں وہ ایک جیسا ہو؟ نکاح کے بندھن سے رہائی کا طریقہ ایک ہی قسم کا ہو؟ یا: اچھی بات تو یہ ہے کہ میاں بیوی، دونوں کی جدائی کے لیے الگ الگ دو دروازے رکھے جائیں؟

طلاق کے لیے پانچ مفروضے بنائے جاسکتے ہیں:

۱۔ طلاق معمولی چیز ہے، طلاق کی تمام قانونی اور اخلاقی رکاوٹوں کا خاتمہ کیا جائے۔

۲۔ جو لوگ کام چھوڑتے اور مزے چکھنے کے لیے شادی کے قابل ہیں، معاشرے میں کنہ کا احترام و تقدس نہیں مانتے، اس کے مقابلے میں ان کی توقع یہ رہتی ہے کہ شادی کا رشتہ جتنی جلدی ہو سکے توڑے اور پیار رشتہ جیسے۔ نئے میاں بیوی نہیں اور نئے مزے لوٹیں۔ وہ تو اسی مفروضہ کو پسند کریں گے۔ جو کہتے ہیں۔ ”دوسرا ہمیشہ زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔“ وہ اسی مفروضے کی حمایت کریں گے۔ اس مفروضے میں خاندان کی بنیادی اہمیت بھی نظر انداز کی گئی ہے اور کسی ایک رشتے کے دوام سے پیدا ہونے والی مسرت و خلوص، محبت و خوش فہمی کو بھی فراموش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مفروضہ کمزور اور جلد ختم ہو جانے والا مفروضہ ہے۔

۳۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ نکاح ایک مقدس عہد ہے۔ نکاح نامہ ہے دل و جان کی وحدت کا وہ دائمی عہد و پیمان کی حیثیت کا حامل ہے۔ اسے محفوظ و باقی رہنا چاہیے لفظ طلاق انسانی معاشرے کی کتاب لغت سے نکال دینا چاہیے۔ میاں بیوی شادی کرتے وقت سمجھ لیں اب موت کے علاوہ کوئی چیز دونوں میں جلا نہیں ڈال سکتی۔

کیجھو ایک چیز صدیقوں سے اسی کا حامی ہے اور کسی قیمت پر اس مفروضے یا عقیدے سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ اس نظریے کے پرستار پوری دنیا میں رو بہ زوال ہیں اور آج کل صرف اطالیا اور کیتھولک سپانیا میں یہ قانون نافذ ہے

۱۔ اطالیہ والے اس قانون کے خلاف آواز اٹھاتے اور تحریکیں چلاتے رہتے ہیں کہ یہ قانون ختم ہو اور طلاق کو قانونی حیثیت مل جائے۔ اب وہ اس تکلیف دہ صورت حال کو مزید بدداشت کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

تیسرے پہر کی اشاعت ڈیلی اسپرس میں ایک مضمون چھپا تھا:

”ازدواج درایتالیا یعنی بندگی زن“

یہ افارسی ترجمہ میں نے پڑھا تھا، مضمون میں درج تھا، موجودہ صورت حال میں طلاق نہ ہونے کی وجہ سے اطالیہ میں عملی طور پر بہت سے لوگ خلاف قانون جنسی عمل کرتے ہیں۔ اس مقالے کی تحریر کی بنیاد پر۔ ”موجودہ صورت یہ ہے کہ پانچ بلین اطالوی سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی سوائے گناہ اور ناجائز تعلقات کے اور کچھ نہیں۔“

اسی روزنامے (ڈیلی اسپرس) ”تیسرے پہر کے ایڈیشن“ میں، اخبار بیکار دے نقل کیا، کہ اطالیہ کے عوام میں منوعیت طلاق سے بری شکلیں پیدا ہو چکی ہیں۔ بہت لوگ تنگ آکر ڈن مجور ہو چکے ہیں آخری دنوں ملک کی خواتین سے پوچھا گیا تھا۔ ”کیا طلاق کے قانون کا اجرا خلاف اصول مذہب ہے؟ ستانوس فی مد عورتوں نے جواب نفی میں دیا تھا۔“

چرچ اپنے عقیدے پر سختی سے قائم ہے۔ اور نکاح کے تقدس اور اس کی مضبوطی پر زور دیتا اور دیلیس پیش کرتا ہے۔ شادی کا تقدس اور رشتے کا استحکام بجائے خود اچھی بات اور قابل قبول چیز ہے۔ بشرطیکہ میاں بیوی میں یہ بندھن عملی طور پر باقی رہے حقیقتاً، کچھ ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں جہاں میاں بیوی میں ہم آہنگی ممکن نہیں ہوتی اس وقت قانون کے زور سے انھیں نہیں چپکایا جاسکتا۔ اسے میاں بیوی کا رشتہ نہیں کہا جاسکتا۔ کلیسا کے نظریے کی شکست یقینی ہے یہ وہ دور نہیں کہ چرچ مجبوراً اپنے عقیدے پر نظر ثانی کرے، اس لیے میں چرچ اور اس کے موجودہ عقیدے پر اس سے زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔



۳۔ تیسرا مفروضہ ہے۔ نکاح۔ مرد کی طرف سے فسخ ہو سکتا ہے، بندھن کھل سکتا ہے۔ عورت اسے نہیں توڑ سکتی۔ پرانی دنیا میں یہی نظریہ تھا، مگر آج مجھے گمان نہیں کہ لوگ اس کی حمایت کرتے ہوں۔ میرے نزدیک اس پر زیادہ بحث و نظر کی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔ چوتھا مفروضہ یہ کہ۔ نکاح، مقدس چیز ہے، اور خاندانی مرکزیت قابل احترام ہے۔ لیکن طلاق کے دروازے شرائط اور پابندیوں کے ساتھ میاں بیوی دونوں کے لئے کھلے رہنا چاہیے اور دونوں کو اس بندگی کے دو دروازوں سے ایک ہی انداز میں نکلنے کی اجازت ہونا چاہیے۔

میاں بیوی اور عورت و مرد کے حقوق میں مشابہت کے حامی۔ جس کی تعبیر غلطی سے مساوات حقوق سے کرتے ہیں۔ اسی نقطہ نظر کے طرف دار ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک جو پابندیاں، جو شرائط عورت پر لگے ہوئے ہیں وہی مرد پر بھی عائد ہوں، اور جو تہمیدیں مردوں کے رشتے توڑنے کے کام آئے وہی ص عورتوں کے لیے کارآمد ہوں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظلم اور دھبہ بندی ہے اور ناروا ہے۔

۵۔ پانچواں مفروضہ ہے۔ شادی مقدس عمل ہے۔ خاندانی مرکزیت محترم ہے اور طلاق قابل نفرت اور ناپسندیدہ ہے (مبغوض ہے)، معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ ایسے اسباب و عمل کا قلع قمع کرے جن کی وجہ سے طلاق واقع ہوتے ہیں، قانون کو ناکام شادیوں کے لئے الجھن بننا چاہیے۔ ایسے بندھنوں سے آزادی کے لیے مرد کا راستہ بھی کھلنا چاہیے اور بیوی کے لیے بھی کوئی نیا نیا کام بندھن سے آزاد ہونے کے لیے مرد کو جو راستہ بتایا گیا ہے۔ وہ اور ہے عورت کو جو راہ دی گئی ہے وہ اس سے ہٹ کر ہے۔ اور یہ مسئلہ بھی وہ ہے جہاں زن و مرد کے حقوق تو ہیں مگر ایک جیسے نہیں ہیں۔

یہ نظریہ اسلام ہی نے ایجاد کیا ہے اور اسلامی ملکوں میں ناقص دیگر کامل طور پر رائج ہے اور اسی کی پیروی کی جاتی ہے۔

## طلاق ایک بین الاقوامی مسئلہ

(۲)

ہمارے زمانے میں طلاق ایک بین الاقوامی مسئلہ بن چکا ہے، ہر شخص فریادی ہے۔ سب کو شکایت ہے، جن لوگوں کے قانون میں طلاق بالکل ممنوع ہے، وہ پریشان ہیں کہ شادی نبھنے والی نہیں، مزاج ملتے نہیں، طلاق نہیں دے سکتے۔ جن کے یہاں قانون عکس ہے، طلاق کی راہ میاں بیوی دونوں کے لیے برابر سے شاد ہے، وہ کثرت طلاق اور خاندانوں کے درم برہم ہونے، اور ناپسندیدہ نتائج کے ہاتھوں چینج رہے ہیں جن لوگوں نے فقط مردوں کو حق طلاق دے رکھا ہے وہ دو زاویوں سے شکوہ کرتے ہیں:

۱۔ غیر شریفانہ طلاق، کچھ لوگ کئی برس کے بندھن اور چھ تعلقات کے بعد اچانک نئی دلچسپی لانے کی ہوس دل میں محسوس کرتے اور اس بیوی کو چھوڑنے پر کمر بستہ ہیں جس نے اپنی عمر، جوانی، قوت اور صحت اس کے گھر میں لٹا دی، اسے تصور بھی نہ تھا کہ اس کا نرم و گرم آشیانہ اس سے چھین لیا جائے گا، وہ ایک طلاق نامہ حاصل کرتے ہی خالی ہاتھ اپنے آشیانے سے نکال دی جاتے گی۔

۲۔ بعض شوہروں کا شریفانہ انداز سے طلاق نہ دینا اور ان عورتوں کا پیچھا نہ چھوڑنا جن سے ان کا نباہ برگز ممکن نہیں۔

اکثر ایسے اتفاقات ہوتے ہیں کہ میاں بیوی میں خاص وجوہ سے اختلافات

بڑھتے بڑھتے ناقابل اصلاح ہو جاتے ہیں۔ صلح و صفائی کی سعی بے نتیجہ ہو جاتی ہے، زن و شوہر میں نفرت کی خلیج حاصل ہو جاتی ہے۔ دونوں عملی طور پر ایک دوسرے کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ دونوں الگ الگ زندگی گزارنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہر عقل مند نزدیک اس مشکل کا حل یہ ہوتا ہے کہ رشتے کو توڑ دیا جائے اور دونوں اپنا اپنا یا شریک زندگی تلاش کریں۔ مگر بعض شوہر حریف کو سزا دینے کی خاطر ہمیشہ کے لیے ازدواجی زندگی سے محروم کر دیتے، اور طلاق نہیں دیتے، اور بد نصیب بیوی کو بے سہارا زندگی گزارنے پر مجبور کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی تعبیر ہے ”کُلْفَ لِقَہ“ معلق زندگی۔

یہ لوگ مسلمان اور اسلام کا صرف نام ہی جانتے ہیں اور اسلام ہی کا نام لے کر من مامور کرتے ہیں۔ ہذا جو حضرت اسلامی تعلیمات کی وسعتوں سے ناواقف ہیں ان کے دل کی گہرائیوں میں یہ شبہ پیٹھ گیا کہ اسلام طلاق کو اسی طریقے پر باقی رکھنا چاہتا ہے؟ یہی لوگ اعتراض آمیز لہجے میں کہتے ہیں، کیا واقعا اسلام نے مردوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ کبھی طلاق دے کر اور کبھی طلاق نہ دے کر اپنی بیویوں کو سزا دیں اور ذہنی طور پر مطمئن بھی رہیں کہ انھوں نے اپنے شرعی حق سے فائدہ اٹھایا ہے۔

لوگ کہتے ہیں: یہ ضامانہ کام نہیں ہے؟ اگر یہ بات ظلم نہیں تو پھر ظلم کسے کہتے ہیں؟ آپ تو اسلام کو تبرہ قسم کے ظلم کا سخت مخالف بتاتے ہیں، آپ کہتے ہیں اسلامی قوانین عدل و حق کی بنیاد پر قائم ہیں؟ اور اگر یہ کام ظلم ہے اور اسلامی قوانین بھی عدالت و حق کی بنیاد پر قائم ہیں تو ذرا ہمیں بھی بتائے کہ ان منظام کے لیے اسلام نے کیا انتظام کیا ہے؟

ان افعال کے ظلم ہونے میں کوئی بحث کی کوئی گنجائش نہیں، ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ اسلام نے ان مسائل کو نشہ نہیں چھوڑا ہے، اسلام نے اس بارے میں کچھ تدبیر بتائی ہیں۔ مگر ایک بات جسے بھولنا مناسب نہیں ہے وہ اس قسم کے ظلم و ستم کی راہ بند کرنے کی

بات ہے۔ کیا ظلم کی اس صورت حال کا سبب فقط قانون طلاق ہے، اور اس قانون کو بدل دینے سے یہ ظلم ختم ہو جائے گا؟ یا ظلم کی جڑیں کہیں اور ہیں ان مقامات کی جستجو کرنا ہوگی کیونکہ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں قانون کوئی اثر نہیں کر سکتا۔

معاشرتی مسائل کا حل تلاش کرنے میں اسلام اور دوسرے نظریات میں فرق ہے، بعض نظریات مشکلات کا حل قانون کو بتاتے ہیں۔ اسلام کی نظر اس نکتے پر ہے کہ قانون فقط خشک اور باہمی تعلقات میں ہمواری تک تو انسان پر اثر انداز ہو سکتا ہے، مگر جب جذبات کا مسئلہ آجائے تو پھر قانون سے کام نہیں چلتا۔ وہاں دوسرے اسباب و وسائل اور دوسرے تدبیر سے بھی فائدہ اٹھانا چاہئے۔

ہم ثابت کریں گے کہ ان مسائل میں اسلام نے قانون سے جہاں تک فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا فائدہ اٹھایا ہے اور اس بارے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

سب سے پہلے ہم آج کی اپنی پہلی شکل۔ یعنی غیر شریعہ طلاق پر گفتگو کرتے ہیں:

## غیر شریعہ طلاق

اسلام طلاق کا سخت مخالف ہے، اسلام تاحق امکان طلاق سے روکتا ہے۔ اسلام نے جدائی کی بالکل آخری تجویز طلاق قرار دی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی باقی نہ تھا۔ اسلام نے لگاتار بیویاں بنانے اور طلاق دینے والے۔ مطلق۔ کو دشمن خدا کا نام دیا ہے۔

الکافی میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک شخص کے پاس پہنچے اور اس سے دریافت کیا:

اپنی بیوی کا کیا کیا؟



ہونا : طلاق دے دی !

فرمایا : کوئی بڑا کام اس نے کیا تھا ؟

جواب : جی نہیں ، کوئی برائی تو نہیں دیکھی تھی !

قصہ ختم ہو گیا ، اس نے دوسری مرتبہ شادی کر لی ، رسول اللہ ﷺ نے دریافت

فرمایا : دوسری بیوی لے آئے ؟

اس نے کہا : جی ہاں !

کچھ دن بعد پھر ملاقات ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا :

اس نئی بیوی کے ساتھ کیا کیا ؟

اس نے جواب دیا : طلاق دے دی ۔

آنحضرت ﷺ نے پوچھا : اس نے کوئی برائی کی تھی ؟

— جی نہیں ، کوئی برائی تو نہیں دیکھی !

یہ بات بھی گئی گزری ہو گئی اور اس نے تیسری شادی کی ، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ — شادی کر لی ؟

اس نے کہا — جی ہاں ، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کچھ دنوں کے بعد

حضرت نے اسے دیکھ کر پھر وہی پوچھا :

اس بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا ؟

— اسے بھی حذق دے دی !

— کوئی برائی نظر آئی تھی ، اس میں ؟

— جی نہیں ، برائی تو کوئی نہیں تھی !

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا : اللہ ، اس مرد کو دشمن رکھتا اور اس شخص پر لعنت کرتا ہے

جس کی آرزو بیویاں بدلنا ہو اور اس عورت پر جس کا دل چاہتا ہو کہ شوہر بدلتی رہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی نے کہا ، ابو ایوب انصاریؓ اپنی بیوی ام ایوبؓ

کو طلاق دینے والے ہیں — آنحضرت ﷺ ام ایوبؓ کو جانتے تھے ، اور جانتے تھے کہ ابو ایوبؓ

کا اقدام طلاق کسی صحیح دلیل کی وجہ سے نہیں ہے ۔ لہذا فرمایا :

ان طلاق ام ایوبؓ لحوبؓ

طلاق ام ایوبؓ ، بڑا گناہ ہے ۔

• پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبریلؑ نے خواتین کے بارے میں

آنی مرتبہ تاکید کی جس سے مجھے گمماں ہوا کہ جب تک بیوی فحش کام کا ارتکاب نہ کرے

اس وقت تک طلاق مناسب نہیں ۔

• امام جعفر صادق علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے

میں فرمایا ، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے :

اللہ کے حضور اس گھر سے زیادہ کوئی محبوب گھر نہیں جہاں شادی کا رشتہ قائم

ہو ۔ اور اس گھر سے زیادہ مبغوض کوئی گھر نہیں جس میں طلاق کے ذریعے رشتہ توڑا

جائے ، امام جعفر صادقؑ نے مزید فرمایا : قرآن مجید میں طلاق کا ذکر بار بار آیا اور

طلاق کے جزیات پر قرآن نے خاص توجہ کی ہے ۔ اسی کی بنا پر اللہ ، جدائی سے

دشمنی رکھتا ہے ۔

• طبری نے مکارم الاخلاق میں ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا

ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا :

” نکاح کرو ، مگر طلاق نہ دینا ، طلاق سے عرش خدا کا نپ جاتا ہے ۔“

• امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ، حصوۃ الہی میں طلاق سے زیادہ مبغوض

وقابل نفرت کوئی چیز نہیں ہے ۔ اللہ ، زیادہ طلاق دینے والے سے دشمنی (نفرت)

کرتا ہے ۔

شیعہ روایات کی خصوصیت نہیں، حضرات اہل سنت نے بھی اس طرح کی روایتیں کیں ہیں۔ سنن ابوداؤد میں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَا حَلََّ اللَّهُ شَيْئًا بَعْضُ الْيَهُودِ مِنَ الطَّلَاقِ

اللہ نے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی جو اسے طلاق سے زیادہ ناپسند ہو۔

مولانا روم نے مشہور داستان "موسیٰ اور چرواہے" میں اسی حدیث نبوی کی طرف اشارہ کیا ہے:

تاتوانی پانہ نذر طلاق

ابض ان شیا عندی الطلاق

رہنمایان مذہب کی سیرت یہاں بھی دیکھا ہے کہ امکان بھر طلاق سے بچتے رہے ہیں۔ اور ان کے یہاں طلاق بہت گھم واقع ہوئی ہے، اور جب ایسا ہوا ہے تو کسی منطقی اور عقلی بنیاد پر ہوا ہے۔ مثلاً:

امام محمد بن قریبہ السلام نے ایک عورت سے شادی کی اور کچھ دنوں بعد طلاق دی۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا: وہ علی کی دشمن تھی، پس آتش جہنم کا ٹکڑا اپنے پہلو میں نہ رکھ سکے۔ یعنی جو عورت حضرت علی علیہ السلام کی دشمن ہو، اور امام اس سے تعلقات باقی رکھیں غیر منطقی بات ہے۔ لہذا طلاق ضروری تھی۔

۱۔ دیکھئے سنن ابی داؤد۔ تفریع ابواب الطلاق۔ حدیث ۲۱۷۷ اور حدیث ۲۱۷۸

ابض الحلال الی اللہ تعالیٰ الطلاق - ج ۲ ص ۲۵۴

امام حسن کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا  
(کردار کشی کی مہم)

اس موقع پر اس بے بنیاد پروپیگنڈا کی بات بھی ضروری ہے جسے بنی عباس کے مجرمانہ ہاتھوں نے جنم دیا

اور اسے پھیلا یا۔

عوام میں مشہور ہوا اور کتابوں میں لکھا گیا کہ فرزند بزرگوار حیدر رکن دار حضرت حسن مجتبیٰ بہت شادیاں کرتے اور بہت خلاق دیتے تھے۔ اس پروپیگنڈے کی تاریخ امام حسن علیہ السلام کے سو برس بعد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ خبر ہر جگہ پھیل گئی، جس لیے غمخواروں کے ساتھ اپنوں نے بھی بے تحقیق سنی سنائی کی تھیں وقت یہ حقیقت بھول گئے کہ طلاق ایک بغوض اور برا کام ہے، عیش پرست و غافل افراد کا عمل ہے۔ اس شخص سے یہ بعید ہے جس کے کردار و اعمال میں سے ایک عمل پیدل حج کرنا تھا جس نے بیس مرتبہ سے زیادہ اپنا مال و متاع فقرا میں تقسیم کیا، آدھا مال خود اٹھا لیا، آدھا غربا کو دیدیا۔ بھلا اس مقام بند اور اتنی عظیم امامت و اعصمت کی حامل شخصیت سے ایسی باتوں کا کیا ربط۔

سب کو معلوم ہے کہ بنی امیہ سے بنی عباس تک انتقال اقتدار کے وقت سے اولاد امام حسن بنی عباس سے ہم آہنگ تھی۔ لیکن اولاد امام حسین بنی عباس کے سردار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تھے، خاموش رہے اور انہوں نے بنی عباس کا ساتھ نہ دیا۔ بنی عباس نے سیاسی مجبوری سے شروع شروع میں تو بنی حسن سے عاجزانہ سلوک رکھا، اور انہیں اپنے سے زیادہ موزوں و بہتر ظاہر کیا، لیکن آخر میں بے وفائی دکھائی، اور بہت سے سادات حسنی و قیدی و قتل کے ذریعے سامنے بٹا دیا۔

بنی عباس نے اپنے سیاسی منصوبے کو آگے بڑھانے کی خاطر اولاد امام حسن کے خلاف پروپیگنڈا اور کردار کشی کی مہم چلائی۔ منجملہ اور باتوں کے ایک یہ کہانی گڑھی کہ بنی حسن



کے جبہ علی اور رسول اللہ کے چچا، ابوطالب مسلمان نہ تھے بلکہ کافر۔ نعوذ باللہ.....  
لیکن آنحضرتؐ کے دوست چچا اور ہمارے جد اعلیٰ عباسؓ مسلمان ہوئے اور مسلمان مرے  
ابن ہم کہ آنحضرتؐ کے مسلمان چچا کی اولاد سے ہیں۔ ان بنی حسن سے بہتر ہیں کہ ڈوگ  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے غیر مسلم.... کی اولاد سے ہیں۔ ہم خلافت کے واسطے  
زیادہ موزوں ہیں۔ بنی عباس نے اس کام کے لیے دولت استعمال کی، قصبے گڑھے  
جس کی بنیاد پر سن بھی حضرت ابن سنت ہیں کچھ لوگ کفر ابوطالب کا فتویٰ دیتے  
ہیں، اگرچہ آخری دنوں کچھ اہل سنت کے متقیین نے چھان بین کر کے تاریخ کے افق  
روشن کیے ہیں۔

حسنى خاندان کے خلاف بنی عباس نے دوسرا موضوع چھیڑا اور کہنے لگے اس خاندان  
کے جد اعلیٰ اپنے والد حضرت علیؓ کے بعد تخت و تاج کے مالک ہوئے تو اپنے شوق (معاذ اللہ)  
کی وجہ سے شادی و طلاق میں الجھ گئے اور معاویہ سے جنگ کے بجائے صلح کر لی.....  
خوشی کی بات ہے، عصر اخیر کے چند محققین نے اس مسئلے کی چھان بین کی اور دروغ  
بے فروغ کی بنیاد منہدم کر لی۔ گمان غالب یہ ہے کہ منظور دوایتی کے معین کردہ قلمی  
نے یہ افواہ اڑانے میں پہل کی۔ بقول ایک مورخ کے۔ اگر امام حسنؓ نے اتنی شادیاں  
کی تھیں تو ان کی اور دکنی تعداد اتنی کم کیوں ہے؟ امام میں کوئی کمی نہ تھی اور مانع صل  
گویوں یا، ستفاہ کا دامن بھی اس زمانے میں رنج نہ تھا جو آج کل ہے۔

مجھے اس سادہ دین، شیعہ مذہب کے راویوں پر تعجب ہے۔ یہ لوگ خود ہی روایتیں نقل  
کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار نے زیادہ طلاق دینے والے  
کو خدا کے نزدیک مبغوض یا ملعون بتایا ہے اور اہل کے بعد ہی یہ لکھ دیا کہ امام حسنؓ  
طلاق بہت دیا کرتے تھے۔

ان لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ تین ہی صورتیں ہیں، انہیں میں سے ایک صورت اختیار

رہے گی۔ یا یہ کہیں کہ طلاق میں کوئی عیب نہیں ہے اور خدا بہت طلاق دینے دے دے کو  
نہیں رکھتا۔ یا یہ مانیں کہ امام حسن علیہ السلام زیادہ طلاق نہ دیتے تھے۔ یا پھر یہ مان  
یں کہ امام حسنؓ اسلامی قوانین کے معاذ اللہ پابند نہ تھے۔ یہ حضرت ایک طرف حدیث  
مبغوضت صفاق کو صحیح و مقبر جانتے ہیں۔ دوسری طرف مقام مقدس امام حسنؓ کے سامنے  
سر جھکاتے ہیں۔ اور پھر ایک جہت میں ان کی کثرت طلاق کی بات نقل کرتے  
وراس پر نقد و نظر کیے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

کچھ تو یہاں تک پہنچے کہ بقول ان کے حضرت امیر المومنین علیؓ نے فرزند  
کے اس عمل سے ناراض تھے اور معاذ اللہ منبر پر لوگوں سے کہتے تھے کہ میرے بیٹے  
حسنؓ سے بیٹی نہ بیاہنا وہ تمہاری لڑکیوں کو طلاق دیتے ہیں، مگر لوگوں نے جواب  
دیا کہ کیا! ہاں! ہیں تو فخر ہو گا کہ ہماری بیٹیاں فرزند پیغمبرؐ کی بیویاں نہیں۔ ان کا دل  
چاہے وہ رکھیں نہ چاہیں تو طلاق دے دیں۔

ممکن ہے بعض طلاق کے ناپسندیدہ اور قابل نفرت ہونے کا مدج یہ سمجھتے ہوں  
ہے عورت اور اس کے خاندان کو طلاق پر راضی کر لیا جائے تو نفرت واپس ہو ختم ہو جائے  
نفرت طلاق اس وقت ہے جب طلاق پاتے واپس فریق راضی نہ ہو، جب عورت صدق  
میں خوشی و اعزاز محسوس کرتی ہو وہ کچھ دن کسی ایسے مرد کے ساتھ گزارنا چاہتی  
ہو جو اس کے اعزاز کا باعث ہو۔ اس صورت میں صدق میں کیا رکاوٹ رہ جاتی ہے  
یہ بات نہیں۔ لڑکیوں کے طلاق پر باپ کی رضامندیاں، یا خود بیٹوں کا اپنی  
صدق پر خوشی ہونا۔ طلاق کے مبغوض و قابل نفرت ہونے میں کمی کا باعث نہیں۔ کیونکہ  
سدام نکاح میں پابندی اور خاندان کی مرکزیت میں استواری چاہتا ہے۔ اس کی نظر میں  
میاں بیوی کا علیحدگی پر رضامند ہونا موثر نہیں ہے۔

اسلام نے طلاق کو قابل نفرت و مبغوض قرار دیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت کی خاص وری ہو اور اسے راضی کیا جائے۔ یوں عورت کی پسند اور خاندان کی آمادگی حاصل کر کے طلاق سے نفرت ختم کی جائے۔

امام حسن علیہ السلام کے بارے میں غلط پروپیگنڈے کی بات ایک تو اس بے چھٹری کہ ایک تاریخی شخصیت سے جھٹی جلدی ہو سکے ایک تاریخی بہتیاں کو رو کیا جائے دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر خدا سے غافل کچھ لوگ یہ کام شروع کر دیں اور امام حسن کے بارے میں سنی سنائی بات کو سند و دلیل بنا کر پیش نہ کر دیں۔

خلاصہ۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طلاق اور میاں بیوی میں جدائی اپنی جگہ پر اسلام کی نظر میں قابل نفرت و بغض ہے۔

**اسلام نے طلاق کو حرام کیوں نہ کیا** ایک اہم سوال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اگر طلاق اس حد تک قابل بغض و نفرت ہے

کہ طلاق دینے والے شخص کو اللہ، دوست نہیں رکھتا، نفرت کے قابل سمجھا ہے تو پھر اسلام نے طلاق کو سرے سے حرام ہی کیوں نہ کر دیا؟ طلاق کو حرام قرار دینے میں اسلام کے لئے کیا رکاوٹ تھی، خاص خاص ورمعین صورتوں میں جائز، باقی میں ناجائز کر دیتا؟ بالفاظ دیگر کیا اسلام کے سپرے یہ بہتر نہ تھا کہ اسلام، طلاق کے لیے کچھ شرطیں لگا دیتا کہ بس ان شرطوں کے بعد ہی طلاق کی اجازت ہے؟ اس کے بعد مجبوراً شوہر کو جانا پڑتا۔ جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تو عدالت کو اپنے عمل کے جواز کی دلیل بتاتا، اگر عدالت کی نظر میں دلائل کافی اور اطمینان بخش ہوتے تو طلاق کی اجازت مل جاتی ورنہ نہ ملتی۔

بنیادی طور پر جملہ یہ ہے:

”حلال چیزوں میں مبغوض ترین چیز اللہ کے حضور طلاق ہے۔“

کیا مطلب؟ اگر طلاق حلال ہے تو قابل نفرت نہیں اور اگر قابل نفرت ہے تو حلال

نہیں۔ قابل نفرت ہونے اور حلال ہونے میں کوئی جوڑ نہیں بیٹھتا۔

ان باتوں کے علاوہ۔۔۔ کیا معاشرہ۔۔۔ یعنی وہ ادارہ جسے عدالت کہتے اور معاشرے کا نمائندہ جانتے ہیں۔ حقدار ہے کہ طلاق جیسے معاملے میں جو اسلام کے نزدیک قابل نفرت ہے۔ دخل دے اور عدالت۔ معاشرہ۔ فیصلہ دے دے کہ طلاق دینے سے ہر بہتر کردہ اور معاملے کو اتنا طول دیا جائے کہ شوہر اپنے ارادے پر کچھ نہ کر سکے۔ پھر معاشرے۔۔۔ سنی درجہ اجتماع۔۔۔ پر واضح ہو جائے یہ زیر بحث رشتہ کیجائی نہیں کر سکتا اس لئے کہ وہ رشتہ ہی چاہیے۔۔۔۔۔۔



## طلاق (نظام فطرت)

(۲)

بات یہ ہو رہی تھی کہ اسلام کی نظر میں طلاق بہت زیادہ قابل نفرت و عداوت و مبغوض ہے۔ اسلام کا رجحان ہے شادی کا بندھن مضبوط و برقرار رہے۔ اس کے بعد میں نے سوال اٹھایا تھا کہ اگر طلاق اسی قدر مذموم و مبغوض ہے تو اسلام نے اسے ناجائز ہی کیوں نہ کر دیا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اسلام جس کام کو ناپسند کرتا ہے اسے شراب خواری و قمار بازی و ستم گری کی طرح حرم کر دیتا ہے؟ پھر طلاق کو بالکل ممنوع کیوں نہ قرار دیا اور اسے روکنے کے لیے قانون وضع کیوں نہ کیا؟ اصل نکتے کی بات یہ ہے کہ آخر اس کی منطق کیا ہے کہ طلاق حلال و مبغوض ہے؟ اگر حلال ہے تو اس کے مبغوض ہونے کا مطلب کیا ہے، اور اگر مبغوض ہے تو حلال کیوں؟ اسلام ایک طرف تو طلاق دینے والے مرد کو اپنی غضب آلود لنگاہوں کا نشانہ بناتا ہے، اس سے نفرت و بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف جب بھی کوئی شوہر اپنی زوجہ کو طلاق دینا چاہے تو اسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی، آخر کیوں؟

یہ سوالات سب جاہل، سب راز کی باتیں ہیں تو چھپی ہوئی ہیں اصلی راز اور مطلب کی بات یہ ہے کہ زوجیت، میاں بیوی کی زندگی فطری بندھن ہے یہ کوئی رسمی معاہدہ نہیں ہے۔ فطرت میں اس کے واسطے خاص قوانین وضع ہوئے ہیں۔ بیع، اجارہ، صلح، رہن اور وکالت جیسے معاشرتی معاہدات سے یہ رشتہ مختلف ہے ان میں صرف

معاشرتی ایک طرف قرارداد و باہمی معاملہ ہوتا ہے فطرت و خمیر کا دخل نہیں ہوتا۔ شرت و غریزہ کو سامنے رکھ کر قانون نہیں بنایا گیا ہے۔ پیمان ازدواج میں یہ بات نہیں، یہاں فریقین کی ایک فطری خواہش۔ اصطلاحی طور پر۔ ایک خاص میکانزم کے طور پر سٹ ہوتی ہے اور باہمی جوڑ بٹھائے جاتے ہیں۔

اس بنا پر اگر پیمان ازدواج کے خصوصی ضابطے ہیں اور وہ دوسرے عہد و پیمان کے ضابطوں سے جلد میں تو حیرت نہ کرنا چاہیے۔

**نکاح و طلاق میں**  
**قوانین فطرت کی نگہداشت**

شہری معاشرت کا قانون، آزادی و مساوات کا قانون ہے۔ تمام معاشرتی معاہدے دو اصولوں پر قائم ہوں گے، آزادی اور مساوات، کوئی دوسرا اصول استعمال نہیں ہو سکتا۔ البتہ پیمان ازدواج اس کے برعکس، یہاں آزادی و مساوات کے علاوہ فطرت نے کچھ اور ضابطے بھی وضع کر رکھے ہیں، اور ان قوانین و ضوابط کی پیروی و نگہداشت ضروری ہے۔ طلاق، دوسرے معاہدات سے پہلے ہی تن فطرت میں ایک قانون کی مالک ہے۔ آغاز کار۔ خواستگاری۔ درمیانی عمل۔ نکاح۔ میں ایک خاص قسم کی نگہداری فطرت ضروری ہے۔ آخر کار رد عمل۔ طلاق۔ میں بھی اس پر نظر رکھنا لازم ہے۔ (ہم سنگنی اور خواستگاری، مہر و نفقہ، اور خصوصی طور پر زن و مرد کے مابین فرق پر گزشتہ ابواب میں گفتگو کر چکے ہیں)۔ فطرت کو چھوڑنا کوئی فائدہ مند بات نہیں "الکسیس کارل" کے بقول۔ حیات و زندگی کے قوانین، ستاروں کے قانون جیسے سخت اور بے رحم ہیں، ان سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

نکاح، وحدت و اتصال ہے اور طلاق، جدائی و انفصال۔ جب فطرت نے جوڑ بننے اور زن و مرد کے بندھن کا قانون یوں وضع کیا ہے کہ شرکت زندگی کیے

ایک طرف سے اقدام ہو اور دوسری طرف دلبری و دل ربائی کے طور پر شرم کے ساتھ ایک قدم پیچھے ہٹنے کا عمل ہو، ایک سمت وہ جذبات رکھے جن سے دوسرے کو اپنی گرفت میں لینے کی فکر ہو، دوسری طرف ایسے جذبات کہ مقابل آنے والے کا دل چھین سے جب کہ نکاح کا سنگ بنیاد، محبت و اتحاد و یکدلی کو قرار دیا گیا۔ یا مئی معاہدہ و ہم کاری نہیں جب کہ گھر کی تعمیر کا نقطہ نظر یہ رکھا کہ جنس لطیف مرکز ہوا و جنس درشت اس مرکز کے گرد چکر لگائے، ہذا جدائی اور غلطی اور انتشار یا اس مرکز کا فعل بھی خاص ضابطوں سے محدود کیا گیا۔

مضمون کی پندرہویں قسط میں ایک دانشور کی بات نقل کر چکا ہوں کہ شادی کا بندھن دراصل مردوں کے لئے قبضہ کرنے کی خاطر ایک حملہ ہے اور عورتوں کے لیے دل دل فریبی و دل ربائی کی خاطر ایک پسپائی ہے۔ مرد، چونکہ فطرتاً شکاری حیوان ہے لہذا اس کا عمل حملہ اور جھپٹنا ہے۔ ایک مثبت عمل ہے۔ دراصل عورت، مرد کے لیے انعام ہے جو اسے لے چکنا چاہیے۔ شادی، ایک جنگ و پیکار ہے اور ازدواج شرکت زندگی اور اقتدار ہے۔

وہ بیان جس کی بنیاد محبت و لگاؤت ہے، تعاون و رفاقت نہیں، یہاں جبر و پابندی کا عمل نہیں ہے۔ قانون کے زور و جبر سے افراد کو انصاف کی بنیاد پر تعاون و احترام پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور یہ معاہدہ چند سال باقی بھی رکھا جاسکتا ہے۔ مگر قانون کے جبر و زور سے دو افراد کو ایک دوسری کی محبت، ایک دوسرے سے خلوص، ایک دوسرے پر جان نثاری کے لیے تیار نہیں کیا جاسکتا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ہر ایک اپنی خوش نصیبی کو دوسرے کی خوش نصیبی سمجھے۔

اس قسم کے تعلق کو برقرار رکھنے کی خواہش کے لیے قانونی جبر کے بجائے کوئی دوسری معاشرتی و عملی تدبیر اختیار کرنا ہوگی۔

ازدواج و نکاح کی فطری ٹیکنیک جس کی بنیاد پر اسلام نے اپنے قانون وضع کیے ہیں دراصل ان کی وجہ اور نتیجہ یہ ہے کہ عورت کنبہ کی جمعیت میں محبوب و محترم ہو جائے اور کسی وجہ سے وہ اپنے مرتبے سے نیچے آجائے، و مرد کی محبت کا شعاع اس کی سمت سے ٹھنڈا ہو جائے اور مرد اس سے بے رخی اختیار کرے تو گویا کنبہ کا ایک ستون گر گیا یعنی فطرت کی بنیاد پر ایک فطری معاشرہ بکھر گیا۔ اسلام نے خاص کوشش و تدابیر کے بہارے کنبہ کی زندگی کو فطری انداز میں باقی رکھنا چاہا ہے۔ یعنی عورت مقام محبوبیت و مطلوبیت میں اور مرد مقام طلب و توجہ و حاضر خدمت رہنے کی منزل میں باقی رہے۔

اسلام نے عورت کو ہدایت نامہ دیا، عورت کو چاہئے:

- ہمیشہ اپنے شوہر کے لیے آراستہ پیراستہ رہے۔
- اپنی ہنرمندی کے نئے سے نئے جلوسے شوہر کو دکھائے۔
- شوہر کے جنسی جذبات کو بڑھائے۔
- شوہر کی باتوں کا نفی میں جواب دے کر اس کے واسطے نئی گرہ اور ذہنی و نفسیاتی الجھن نہ پیدا کرے۔

ادھر مرد کے کہا:

- اپنی زوجہ سے محبت و عطف رکھے۔
- انہماک عشق و توجہ کرے۔
- اپنی محبت نہ چھپائے۔

اس قسم کی متعدد تدبیریں اسلام نے اس لیے اختیار کیں تاکہ جنسی لذت اندوزی اپنے گھریلو دائرے میں محدود رہے۔ اسلام کی ہدایت کہ میاں بیوی کے باہمی سلوک رشتہ زن و شوہر کے کینڈر سے باہر بہت پاک صاف رہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ کنبہ کا معاشرتی ڈھانچہ بکھرنے کے خطرے سے بچا رہے۔



## گھریلو زندگی میں شوہر کا فطری درجہ

اسلام کی نظر میں کسی زوجہ کی انتہائی توہین کی بات ہے کہ شوہر یہ کہہ دے "میں تم سے محبت نہیں کرتا مجھے تم سے نفرت ہے۔" اور اس کے بعد قانون زور و جبر کرے اور بیوی کو گھر میں رکھنے پر مجبور کرے۔ قانون، جبراً بیوی کو شوہر کے گھر میں رکھ سکتا ہے لیکن اسے فطری درجہ، محبوبیت و مرکزیت اور میاں بیوی کی پر محبت و الفت فضا میں باقی رکھ سکے، یہ ممکن نہیں ہے۔ قانون شوہر کو زوجہ کی نگہداشت، اس کے اخراجات زندگی کی ادائیگی کا پابند کر سکتا ہے۔ مگر اسے ایک جاں نثار اور مرکز کے گرد گھومنے والا دائرہ اور ایک نقطہ نہیں بنا سکتا۔

بنا بریں جب محبت و الفت شوہر کا شعلہ بجھ جائے تو فطری ضابطے کے مطابق شادی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے۔ اگر محبت کا شعلہ بیوی کے دل میں ٹھنڈا پڑ جائے تو کیا ہو گا؟ کیا بیوی کے رشتہ محبت توڑ لینے سے گھریلو زندگی باقی رہے گی یا ختم ہو جائے گی؟ اگر باقی رہے گی تو، میاں بیوی میں کیا فرق ہے کہ مرد کا رشتہ الفت ٹوٹنا تو گھریلو زندگی کا ختم ہونا جانے اور بیوی کے رابطہ الفت ختم ہونے سے وہ زندگی ختم نہیں ہوتی، آخر وجہ کیا ہے؟ اور اگر بیوی کے رخ موڑنے اور رشتہ الفت توڑنے سے بھی گھر کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو جس وقت زوجہ، شوہر سے رشتہ توڑے تو اسی وقت نکاح کا بندھن بھی ختم مان لیں اور بیوی کو حق طلاق دے دیں۔

جواب یہ ہے کہ "گھریلو زندگی، فریقین کی دل بستگی پر موقوف ہے ایک فرد سے نہیں اور زن و مرد کی نفسیاتی تحقیق سے دونوں کا اختلاف ہم گذشتہ مقالات میں ایک ماہر نفسیہ کے حوالے سے میاں کر چکے ہیں۔ فطرت نے میاں بیوی کا رشتہ کچھ ایسا رکھ لیا ہے کہ بیوی، شوہر کے سامنے جواہد ہے۔ بیوی کی اصلی حقیقی محبت و الفت کو شوہر کے احترام

و توجہ کے جواب میں استوار و پائدار ہونا چاہئے۔ لہذا بیوی کا مرد سے تعلق معلول (نتیجہ) ہے شوہر کی توجہ کا اور سب کچھ مرد سے وابستہ ہے، فطرت نے فریقین کی محبت کی کنجی شوہر کے ہاتھ میں رکھی ہے۔ شوہر، اگر زوجہ سے محبت کرے اور وفاداری برتے تو زوجہ بھی اسے چاہے گی اور وفاداری برتے گی۔ یقینی طور پر عورت، مرد سے زیادہ وفادار ہوتی ہے عورت کی بے وفائی مرد کی بے وفائی کا رد عمل ہے۔

فطرت نے ازدواج فسخ کرنے کی کنجی مرد کو دی ہے، یعنی مرد، اپنی بے تعلقی و بے توجہی اور بیوی سے بے وفائی کر کے، بیوی کو سرد مہر و بے تعلق بناتا ہے۔ اس کے برعکس اگر بے مہری عورت کی طرف سے ہو تو مرد کے رشتہ الفت پر اس کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ کبھی تو اس کے جذبہ الفت میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال بیوی کی بے توجہی، طرفین کی بے نہیں بنتی۔ مرد کی توجہ میں کمی اور اس کا خاتمہ مرگ ازدواج و خاتمہ زندگی خانوادگی ہے۔ مگر شوہر کے لیے بیوی کے جذبہ التفات کی کمی گھریلو زندگی کو مریض نیم جان بنا تی ہے، لیکن بہتری اور ندرستی کی امید باقی رہتی ہے۔ جس وقت بے توجہی عورت کی طرف سے ہو تو مرد کی عقلمندی و وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی سے محبت و الفت و نرمی کا مظاہرہ کرے اور اسے عشق و الفت کی طرف واپس لائے۔ مرد کے لیے اپنے روتھے محبوب کو منانے میں کوئی سبکی نہیں، وہ قانون کے زور سے اس کی نگہداشت کر کے آہستہ آہستہ رام کر سکتا ہے۔ لیکن عورت کی توہین ہے، اس کے واسطے ناقابل برداشت ہے کہ وہ اپنے حامی اور عاشق کی حفاظت میں قانون کے زور و جبر کو سہارا بنائے۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے جب عورت (بیوی) کی لا تعلقی کی علت شوہر کی بدخلاقی و ظلم ہو، اگر مرد ظلم شروع کر دے اور بیوی ظلم و نقصان رسانی سے تنگ آکر دامن چھڑانا چاہتی ہو تو بات کچھ اور ہے۔ ہم اس بارے میں "سلسلہ دوم" کے عنوان سے گفتگو کریں گے۔ یعنی غیر شرعیانہ طور پر طلاق سے پہلو تہی۔ وہاں ہم بتائیں گے کہ مرد کو اجازت

نہیں دی جائے گی کہ وہ غلط فائدہ اٹھائے اور عورت کو نقصان رسانی و ستم گر کی پے روکے رکھے۔

خدمہ یہ ہے۔ میاں بیوی، زن و مرد میں فرق یہ ہے کہ مرد، عورت ذات کا نیاز مند ہے اور عورت مرد کا دل چاہتی ہے، بیوی کے لیے شوہر کی حمایت اور دلی توجہ اتنی قیمتی ہے کہ اس کے بغیر شادی کا عمل عورت کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

**ماہر نفسیات فرانسیسی خاتون کا نظریہ** | زن روز، شمارہ ۱۱۳ میں "ماں کے نفسیات" کے عنوان سے ایک فرانسیسی خاتون

BEATRICE MABEAU (بیٹریس ماربیو) کے مضمون کا ترجمہ چھپتا تھا۔ اس مقالے کے مندرجہ سے، اس خاتون کا نفسیات میں ڈاکٹر ہونے کے علاوہ پیرس کے ایک اسپتال میں نفسیات شناس معالج ہونے کے ساتھ ساتھ تین بچوں کی ماں ہونے کا علم بھی ہوا۔

مقالے کے بعض حصوں سے حاملہ یا بچے والی عورت کی شوہر سے محبت و مہربانی کی توقع پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے، وہ لکھتی ہیں:

"جب عورت محسوس کرتی ہے کہ وہ بہت جلد ماں بنے اور اولاد والی ہونے کو ہے، اسی وقت سے وہ سوتل میں پڑ جاتی ہے وہ اپنے بدن کو ٹٹولنے اور سونگھنے لگتی ہے۔ خصوصاً اگر پہلا بچہ ہو تو کریدنے کی حس بہت شدید ہوتی ہے۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات سے بیگانہ ہو گئی۔ وہ اپنے وجود کا انکشاف چاہتی ہے۔ جیسے ہی وہ پیٹ میں ننھی جان کی چھین محسوس کرتی ہے۔ اسی وقت وہ کان لگاتی ہے کہ اپنے جسم میں نئے آنے والے کی ہر آواز کو سنے، نیا وجود اسے خوش قسمتی اور مسرت بخشتا ہے وہ آہستہ آہستہ گوشے میں رہنے اور تنہائی میں بیٹھنے کی آرزو مند ہو جاتی ہے۔ وہ بیرونی دنیا سے قطع تعلق کر لیتی ہے وہ اس ننھی جان سے خلوت میں دل بہلانا چاہتی ہے جو ابھی دنیا میں نہیں آئی۔"

حمل کے زمانے میں شوہروں پر ان کی بیویوں کی بڑی ذمہ داریاں آپڑتی ہیں مگر ان کو ہے کہ مردان ذمہ داریوں سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوتے۔ ہونے والی ماقحلتی ہے، شوہر سے ٹٹولے اور سمجھے اس سے محبت کرے، اس کا خیال رکھے، اس کی حمایت و مدد کرے، جب وہ اپنا پیٹ ابھرتے دیکھتی ہے، اس کے حسن کو نقصان پہنچتا ہے، استفراغ آتے ہیں، تسلی ہوتی ہے، بچہ جنمے کا خوف طاری ہوتا ہے تو اپنے شوہر کو سب باتوں کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ اسی نے حاملہ کیا.....

شوہر کو ان دنوں بیوی سے زیادہ نزدیک رہنا چاہیے اور کنبہ کو بھی ایک غمخوار و ہمدرد باپ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بیوی بچوں سے مشکلات شادی و غم میں بات کرے، ان کی پریشان کن باتوں کو برداشت کرے۔ حاملہ عورت کی بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اس کے بچے کے بارے میں اس سے کوئی بات کرے، عورت کی سب سے بڑی عزت و فخر کی بات ہے اس کا صاحب اولاد ہونا۔ اس وقت اگر وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس کا شوہر، اس کے بہت جلد دنیا میں آنے والے بچے سے دل چسپی نہیں رکھتا۔ تو اس کا غرور و افتخار پاش پاش ہو جاتا ہے۔ وہ حقارت اور چھوٹاپن محسوس کرنے لگتی ہے۔ وہ ماں ہونے سے بینرا اور بچہ جنمے کو "احضار" و جان کنی خیال کرنے لگتی ہے۔

ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی زچائیں، درد زہ زیادہ محسوس کرتی ہیں..... ماں اور اولاد کا رشتہ فقط دو افراد کا رشتہ نہیں بلکہ تین افراد کا درمیانی تعلق ہے، ماں، بچہ اور باپ۔ باپ غائب ہو (بیوی کو طلاق دے چکا ہو) جب بھی ماں کی اندرونی زندگی اسی کے خیالات و تصورات سے بسر نہ رہتی ہے۔ شوہر کی "مادری" جذبات میں بھی بڑا موثر کردار ادا کرتی ہے.....

یہ تحفے خیالات اس دانشمند خاتون کے جو ماہر نفسیات ہونے کے ساتھ ساتھ ماں بھی تھی۔



**وہ عمارت جس کی بنیاد جذبات پر ہے** اس اچھی طرح سوچیے۔ جو مخلوق اس حد تک دوسرے مخلوق کی نیاز مند توجہ، قلبی تعلق، حمایت اور ہمدردی کی تلاشی ہے۔ جو ہر شکل صرف اس کی مہربانی و توجہ کے سہارے جھیل سکتی ہے۔

اور اس کی محبت کے بغیر وہ اپنی اولاد کا صحیح مطلب بھی نہیں سمجھتی۔ وہ مخلوق جو دوسرے کے مفاد وجود سے ہی نہیں بلکہ اس کے دل، دل کے جذبات کی طلب گار ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ اسے قانون کے زور سے ایسی مخلوق سے چپکا دیا جائے جس کا نام مرد ہے؟ سخت اور اکھڑ۔

کیا یہ دھوکا نہ ہو گا کہ ہم ایک طرف بوالہوسی اور بیویوں سے لاتعلقی کے اسباب فراہم کریں اور دوسری طرف راستے نکالیں۔ پھر قانون کے زور سے بیویوں کو شوہروں سے جسپاں رکھنا چاہیں؟ اسلام نے یہ کام کیا کہ شوہر عملی طور پر بیوی کو چاہے اور اس سے محبت کرے، اسلام، بیوی کو شوہر کے سر تھوپنے کا اہتمام نہیں کرتا۔

مختصر یہ ہے کہ جہاں ارادت و خلوص کا قدم درمیان ہوا اور جذبات پر تمام معاملات کی بنیاد ہو وہاں قانون کا جبر کیا کر سکتا ہے۔ ممکن ہے مقام افسوس ہو مگر مقام جبر و پابندی بہر حال نہیں ہے۔

ایک مثال ہے۔ ہمیں علم ہے کہ نماز جماعت میں امام کی عدالت شرط ہے اور یہ بھی شرط ہے کہ ماموین امام کی عدالت کا یقین رکھتے ہوں۔ یعنی امام و ماموین کا ربط و اجتماع، عدالت امام اور ارادت و خلوص ماموین پر قائم ہے۔ اسی وجہ سے یہ اجتماع و تعلق جبر و پابندی قبول نہیں کر سکتا۔ تنہا قانون اسے دوام و استحکام نہیں دے سکتا۔ اگر ماموم اپنے امام جماعت سے رابطہ توڑ لیں اور خلوص و ارادت ختم ہو جائے تو ربط و اجتماع درہم برہم ہو جائے گا۔ اس ارادت کا خاتمہ چلے درست ہو یا غلط۔ فرض کر لیجئے کہ امام جماعت واقعا عدالت تقویٰ اور صلاحیت کے اعلیٰ درجے پر بھی فائز ہو۔ جب بھی ماموین کو اپنی اقتدار پر مجبور نہیں کر سکتا قابل مضحکہ ہو گا کہ یہ امام جماعت کچھری میں ماموین کے خلاف درخواست دائر کرے کہ لوگ

میرے ارادت کیوں نہیں رکھتے؟ لوگ میرے معتقد کیوں نہیں؟ اور آخری بات یہ ہے کہ لوگ میرے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ دراصل ایک امام جماعت کے مرتبے کی توہین ہے نہ عوام کو قوت و جبر سے اپنی اقتدار پر مجبور کرے۔

نمائندہ اسمبلی اور عوام کا رابطہ بھی، اسی قدر کا رابطہ ہے۔ یعنی انتخاب کرنے والے اور منتخب ہونے والے کا رابطہ، تعلق و عقیدہ و یقین پر استوار ہوتا ہے۔ اسی رابطہ کا دار مدار، جذبات اور دل اور معاشرے پر موقوف ہے۔ اگر عوام کسی شخص کو ووٹ نہ دیں۔ تو ان سے جبراً ووٹ لیے نہیں جاسکتے۔ خواہ عوام کو دھوکا ہی کیوں نہ ہو اور امیدوار اپنی جگہ واقعا اہل اور اعلیٰ درجے کی قابلیت رکھتا ہو بشرط انتخاب بھی پورے موجود ہوں، کیونکہ ایکشن کی فطرت اور ووٹ دینے کا مراتب جبر کے خلاف ہے۔ یہ شخص کچھری میں اپنی صلاحیت و قابلیت کی بنیاد پر فریاد نہیں کر سکتا کہ جناب میں انا فاضل ہوں لیکن علم مجھے ووٹ نہیں دیتے۔

ایسے مراحل میں کرنے کا کام ہے، عوام کی فکری سطح ہموار و بلند کرنا اور ان کی صحیح تربیت ہے جس کے بعد لوگ اپنی دینی ذمہ داری ادا کرتے وقت (نماز ادا کرنے کے لیے) واقعی عادل افراد پیدا کریں، ان سے ارادت رکھیں۔ یا خلوص اور صحیح جذبے سے امیدوار کو ووٹ دیں۔ اس کے بعد بھی اگر رائے بدل دیں، ارادت چھوڑ دیں اور بلاوجہ کسی دوسرے کے پیچھے چل کھڑے ہوں تو افسوس کی جگہ ہے۔ جبر و زور کا دھن بیکار ہے۔

کنسہ کا فرض بھی بالکل مذہبی فریضے اور معاشرتی ذمہ داری جیسا ہے۔ لہذا اچھی بات یہی ہے کہ ہم مان لیں کہ اسلام، گھریلو زندگی کو ایک فطری معاشرہ مانتا ہے، اور اس فطری اجتماع کو خاص تکنیکی عمل سمجھتا ہے۔ اس تکنیک کی نگہداشت ضروری اور اس سے انحراف کو غلط قرار دیتا ہے۔

اسلام کا بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس نے اس تکنیک کی نشان دہی کی جب کہ غرب آج تک

گھر یو مشکلات پر قابو نہ پاسکا بلکہ آئے دن مشکلات میں اضافہ کر رہا ہے جس کا سبب فطری تکنیک سے غفلت ہے۔ البتہ خوش قسمتی کی بات ہے اعلیٰ تحقیقات آہستہ آہستہ یہ راستہ روشن کر رہے ہیں۔ میں جتنے سونے کی طرح دیکھ رہا ہوں، مغربی دنیا علم کی روشنی میں، اسلام کے اصولوں پر پتے گھر یو نظام میں قبول کریں گے۔ میں اسلام کے نورانی تعلیمات اور مستحکم اصول کو عوام کے ان رویوں سے ہم آہنگ نہیں مانتا جنہیں وہ اسلام کے نام سے اپاتے ہیں۔

گھر یو زندگی کو استوار کرنے والی چیز مساوات سے بھی اہم ہے۔

اسلام نے مساوات کے اس مسئلے کو جس طرح حل کیا ہے یہ لوگ اس سے غافل ہیں، فطر نے فقط شہری معاشرے میں مساوات کا قانون وضع کیا ہے۔ لیکن گھر یو معاشرے میں مساوات کے علاوہ بھی قانون وضع کیے ہیں۔ اکیلی "مساوات" گھر یو تعلقات منظم کرنے کے لیے کافی نہیں، اخلاقی معاشرے میں فطرت کے دو سے قوانین کو بھی معلوم کرنا چاہیے۔

فساد میں مساوات

انوس، کہ مساوات برابری کی تکرار اور اس کی تعلیم نے اپنی اصل خوبی و خصوصیت ہاتھ دھو لیا بہت کم سوچا جاتا ہے کہ برابری سے مراد حقوق برابری ہے۔ عام خیال کے مطابق بس یہ کافی ہے کہ "مساوات" کا مفہوم جہاں بھی صادق آگیا، بات پوری ہوگئی۔ ان بے خبر لوگوں کے خیال میں، ماضی میں مرد، عورت جھوٹ بولتے تھے۔ آج کل عورتیں مردوں سے جھوٹ بولتی ہیں، لہذا سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ کیونکہ جھوٹ بولنے میں مساوات قائم ہوگئی۔ ماضی میں دس فیصد شادی مردوں کے ہاتھوں طلاق ٹاٹ پہنچتی تھیں۔ اب دنیا کے بعض حصوں میں چالیس فیصد طلاق دی جا رہی ہے، ان میں بیس فیصد عورتوں کی طرف سے ہیں لہذا جشن منایا جائے کہ مکمل مساوات قائم ہوگئی۔ گزشتہ زمانے میں مرد پاکستان پر سیزگار نہیں تھے۔ آج۔ عورتیں بھی خیانت کا رہو گئیں وہ بھی پاک دامن و پرہیزگاری

چھوڑ بیٹھیں، اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟۔ مساوات زندہ باد۔ فرق مدارج مردہ باد۔ پہلے زمانے میں مرد بے رحمی و سختی کا مظاہرہ کرتے تھے، مرد، دل نواز بچوں کا باپ ہوتے ہوئے بیوی بچوں کو چھوڑ کر نئی نئی معشوقہ تلاش کرتے پھرتے تھے، آج دیرینہ پیوند بیویاں برسوں کی گھر یو زندگی اور کئی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ چھا رہی ہیں، مجلسِ قص میں ایک مرد کی آشتی کر کے انتہائی قساوت و بے رحمی سے گھر اور اشیائے گھر کو چھوڑ کر، ہوس رانی کے پیچھے روانہ ہو جاتی ہیں۔ واہ، واہ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے، میاں بیوی ایک نرا ذوق میں آگے بڑھ رہی قائم ہوگئی۔

یہ ہے۔ دوا کے بجائے معاشرے کے بے شمار دردوں میں اضافے۔ میاں بیوی کے تقاضوں کی اصلاح اور کنبہ کی مرکزیت کو استوار کرنے کے بجائے آگے دن اسے کمزور اور متزلزل کرنے کی فکر میں قص اور نفاق کہ شکر ہے۔ کچھ تو۔ مساوات کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بلکہ آہستہ آہستہ بیویاں، فساد و انحراف و بے رحمی میں مردوں سے آگے جا رہی ہیں۔

اب واضح ہو گیا کہ اسلام نے طلاق کو مبغوض اور قابل نفرت قرار دینے کے باوجود اس سامنے قانونی رکاوٹ کیوں نہ کھڑی کی۔ یہ معلوم ہو گیا کہ "حلال مبغوض" کے کہتے ہیں، اور ایک چیز حلال ہونے کے باوجود بے حد قابل نفرت و دشمنی کیسے ہو سکتی ہے۔



عقد از دواج

شہید مہتری، فقیہ و فلسفی ہیں، ان کی بحث، قانون مملکت اور قانون اسلام دونوں سے مربوط ہے اس لیے عام قاری کو پہلی نظر میں مطلب تک پہنچنے میں بہت سوچنا پڑے گا۔ مثلاً: عقد زوج عقود لازم میں ہے۔ ”عقد زوج بطریقاً لازم ہے“ اس بات کو سمجھنے کے لیے عقد کے اصطلاحی معنی اور منطقی یا فلسفۂ قانون اسلام میں ”لازم و لزوم“ کے معنی سمجھنا ہوں گے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

عقد۔ بندھن، گرہ۔ (ذمت کی اصطلاح میں) اطراف جسم کا جمع ہونا۔ اصطلاح فقہ میں یہ اصطلاح۔ باب معاملات و نکاح میں استعمال ہوتی ہے، جس کے مطلب میں: ایجاب و قبول یا شرعی طور پر مقبر خاص رابطہ۔ بیع، ہبہ، وقف، نکاح جیسے امور میں ایک شخص معین یا لونی کلمہ یا کلمہ ادا کرتا ہے دوسرا شخص اسے قبول کا اظہار کرنے والے کلمات زبان سے کہتا ہے، اس کے بعد عقد قائم ہو جاتا ہے مثلاً عقیدہ زوجہ و نکاح میں عورت یا اس کا وکیل کہے "زوجیت...." مرد یا اس کا وکیل کہے "قبِلْتُ...." وغیرہ یہ عقد صحیح و شرعی ہے۔ اس کے بعد کچھ حقوق و فرائض، کچھ آزادیاں کچھ پابندیاں ان دونوں عقد کرنے والوں پر عائد ہو جاتی ہیں۔ ایجاب و قبول کرنے والے "متعاقدين" کہے جاتے ہیں۔

عقد کے بعد منطقی لحاظ سے متعاقدین کے درمیان عقد "التزام" کی صورت رکھتا ہے ؟  
اس میں بحث ہے ۔ کچھ لوگ ۔ ایک چیز کے متعلق میں متعاقدین کے عقد کو التزام مانتے ہیں بعض  
لزوم و التزام نہیں مانتے ۔ بحث کی بنیاد یہ ہے کہ عقد مقولہ فعل ہے اور ۔ التزام مقولہ  
اضافہ ۔ جو حضرات ان میں التزام مانتے ہیں وہ عقد کرنے والے دونوں افراد کے درمیان عقد  
معادے کے مقولات کی بحث سے الگ کرتے اور "لزوم" پر اصرار کرتے ہیں ۔ اور جو حضرات لزوم  
کا انکار کرتے ہیں وہ ایجاب و قبول کی تکنیک اور اس سے دو مفہوم حقیقی و منطقی کا اثبات  
کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ لفظ کے تین مدلول (معنی یا مفہوم) ہوتے ہیں ۔ مطابق ، تفسیہ اور التزامی  
عقد سے مراد ہے وہ ایجاب جو قبول سے مربوط ہے ۔ اور جہاں ایجاب قبول سے مربوط ہو ، وہاں

بلکہ مراد ہے یا مبادلہ۔ لہذا تعہد (نگہداشت و پابندی) اور التزام کا ربط نہیں رہتا۔ اس  
 التزام عقد کے حکام میں ہو سکتا ہے۔ عوارض میں ہو سکتا ہے مگر لزوم نہیں ہو سکتا یعنی متعاقب  
 عقد سے نہ اس کا تعلق جزو حیثانہ اس کی جدائی محال ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے کتب استدلالی  
 نمبر ۱۔ ڈاکٹر سید عقیل مجاہدی کی کتاب "فرنگ معارف اسلامی" جلد سوم حرف ع قد۔  
 جمع تہران۔ ایران۔

۲۴ دیکھیے، حضرت مرزح اعظم، آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی مدظلہ العالی "تحریر الوسیلہ" خبر  
ثانی، ص ۲۹۴ کتاب الطلاق، القول فی الصیغۃ۔

## طلاق

(کوششِ صلح کے پس منظر میں)

(۴۱)

رقہ بحث سے معلوم ہو چکا کہ اسلام طلاق اور کسبہ کے شیرازہ بکھرنے کا مخالف اور دشمن ہے۔ اسلام نے شیرازہ خاندان کی حفاظت کے بارے میں اخلاقی و معاشرتی پیش نبیا کی ہیں اس نے طلاق کو وقوع پذیر ہونے سے روکنے کی خاطر متعدد وسائل سے کام لیا ہے صرف جبر اور قانون کا تھیا۔ استعمال نہیں کیا۔

قوت اور قانون کے اسلحہ کے زور سے شوہر کو طلاق سے روکا اور بیوی کو قانون کے جبر سے شوہر کے گھر میں رکھا جائے۔ اسلام اس کا مخالف ہے۔ اس کے نزدیک گھریلو ماحول میں یہ اقدام عورت کے درجے کے نمایان نشان نہیں ہے، وہ گھریلو زندگی کی بنیادی رکن اور جذبات و احساسات کا سرچشمہ ہے۔ جس شخصیت کو رشتہ ازدواج کے نرم و حسین جذبات جذب کر کے، مہر و محبت کے بادل اولاد پر برسانا ہیں وہ عورت ہے۔ شوہر کی سر و مہری، اس کے شعلہ محبت کا بجھا، اس کے زوجہ سے متعلق جذبات کا خاتمہ گھریلو فضا سے گرمی اور روشنی کو ختم کر دیتا ہے۔ بات یہاں تک ہے کہ ماں کے مادرانہ احساسات اولاد کے بارے میں اس سے زیادہ ہوتے ہیں جتنے جذبات شوہر کے اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ "میٹرس ماربو" کی رائے ہم گزشتہ مضمون میں لکھ چکے ہیں، ان کے بقول مادرانہ جذبات غریزہ و فطرت نہیں ہیں۔ یعنی، ماں بہر حال غیر زوال پذیر جذبات محبت یا حکم

نہ ہونے والی ماما اپنے بچوں کو دیتی رہے۔ بلکہ اس کے مادرانہ جذبات بڑی حد تک شوہر کی توجہ سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ بیوی کا وجود شوہر کی ذات سے جذبات و احساسات کا ناثر لیتا، اور اس کے نتائج اپنے سرچشمہ فیتن سے اولاد کے حواس کرتا ہے۔

مرد کو ہمارا اور عورت جو ہمارا اور اولاد سبترہ و گل جیسے ہیں۔ چشمہ و جو ہار ہمارا پر بارش ہوتی ہے وہ بارش کا پانی جذب کر کے، صاف و شفاف کر کے چشموں اور جوہاروں کے حوالے کرتے ہیں یہ چشمے سبزہ زاروں کو شادابی بخشتے ہیں، بارش نہ ہو، یا پہاڑ پانی بند کرنے اور مصفا کر کے چشموں تک پہنچانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو چشمہ خشک اور گل جیسے مرجھا جائیں گے۔

جیسے بارش خصوصاً پہاڑوں کی بارش دشت و صحرائے زندگی کی جان ہے، گھریلو زندگی کی جان بھی شوہر کے محبتانہ جذبات اور بیوی کے ساتھ پیار کی رفتار ہے۔ اس سے بیوی بچوں کی زندگی میں چمک دمک شفافیت اور خوشیوں کی لہر دوڑتی ہے۔

جب شوہر کے اپنی زوجہ سے جذبات الفت و محبت کی منزل و مایہ میری ہے اور کنبہ کی زندگی بلکہ روح پر اثر اتنا ہے تو پھر قانون کے اسلحہ اور ضابطے کے تازیانے سے مرد کو قبل استفادہ کیسے بنایا جاسکتا ہے۔

اسلام، غیر شرعیانہ طلاق کا سخت منی لف ہے۔ یعنی ایک مرد و پیمانہ رشتہ ازدواج پر دستخط کرنے کے بعد، کبھی تو کچھ مدت تک رفیق حیات رہنے کے بعد، ایک نوہیبت و دلہن کے شوق میں پرانی بیوی کو چھوڑنے کا عمل ناپسند کرتا ہے۔ لیکن اسلام کی رائے بھی نہیں ہے کہ اس ناجوان مرد کو پہلی بیوی کے گھر میں رکھنے پر مجبور کیا جائے کیونکہ یہ نگہداشت عائلی زندگی فطر کا قانون سے مختلف شے ہے۔

اگر زوجہ قانون کے زور اور پولیس کی مدد سے شوہر کے گھر میں واپس آجائے تو کنبہ



رہش یا تو نافذ کر سکتی ہے، اس گھر کی ملکہ نہیں رہ سکتی، وہ شوہر سے جذبات لے کر جذب کرنے اور اولاد تک پہنچانے کا وسیلہ نہیں بن سکتی وہ اپنے وجدان کی اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی جو محبت و توجہ شوہر سے عبارت ہے پھر وہ اپنے وجدان کو سیراب و مطمئن کیونکر رکھے گی۔

اسلام نے کوششیں کی ہیں کہ ناجوانمردی اور غیر شریفانہ طلاقوں کا خاتمہ ہو جائے اور "مرد" شریفانہ انداز میں اپنی بیویوں سے سلوک رکھیں اور ان کو برداشت کریں لیکن اسلام یہ نہیں چاہتا کہ قانون سائنہ کی جنیت سے بیوی پر جبر و دھرم کرنا شیرازہ بندی خاندان، اور وسیلہ حصول تقسیم جذبات جانتا ہے زور و جبر کے ذریعے غیر شریف شوہر کے ساتھ رہنا رکھتے۔

اسلام نے جو کچھ کیا ہے وہ مغرب اور مغرب پرستوں کے خلاف کیا ہے، مقابل کا نقطہ اسلام نے غیر شریفانہ رویے کے سبب بابت وفائی اور ہوس رانی سے جنگ کی اور اس پر تیار نہ ہوا کہ بیوی کو غیر شریفانہ مزاج اور بے وفا شوہر کے سر منڈھ دے جبکہ مغرب اور مغرب پرست ایک طرف غیر شریفانہ عوامل کو ہر لمحہ فروغ دے رہے ہیں بے وفائی و ہوس رانی مرد کو بڑھا رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ چاہتے ہیں کہ جبر کے ذریعے ہوس راں دے بے وفا و غیر شریف شوہر سے بیوی کو اکٹائے رکھیں.....

آپ صدیق کریں گے کہ اسلام نے غیر شریف شوہر کو بیوی کی نگہداشت اور اپنے گھر میں رکھنے پر مجبور نہیں کیا، اس نے دونوں کو آزادی دی اور اپنی تمام کوششیں، روح انسانیت اور شرافت کی بقا پر صرف کی ہیں۔ عملی طور پر اسلام اتنا تو بہر حال کر سکا کہ بہت زیادہ قابل توجہ حد تک طلاقوں میں کمی کر سکے۔ دریاں ملے کہ دوسروں نے ان مسائل پر کوئی توجہ نہیں دی اور ہر قسم کی خوش نصیبی و شاد کامی زور اور نینرے کی لو طلب کی ہیں۔ پھر بھی کامیابیاں بہت کم نصیب ہوئیں۔ ان طلاقوں سے قطع نظر جو باہمی اتفاق

کی خرابی یا رد بقول رسالہ نیوز ویک، غورتوں کی لذت اندوزی کی بنا پر واقع ہوتی ہیں۔ فقط مردوں کی ہوس رانی کی بنا پر ہمارے یہاں دی جانے والی طلاقوں سے مغرب میں مردوں کی طرف سے دی جانے والی طلاقوں کی تعداد کم نہیں زیادہ ہے۔

یقیناً، میاں بیوی میں، صلح، صفائی برقرار رہنا چاہیے مگر ایسی صلح و صفائی جو ان کے باہمی رشتے پر حکمراں ہو۔ یہ صلح و صفائی اس صلح و ہم آہنگی سے مختلف ہے جو دو شریک کار، دو ہم سایے، دو پڑوسی حکومتیں، دو دو ہم سرحد سلطنتوں میں کار فرما ہوتی ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔

### گھریلو صلح کا مزاج ہر قسم کی صلح سے جدا

میاں بیوی کی زندگی میں صلح و صفائی کا مقابلہ کرنا ہوتا تو اس ہم آہنگی و مصافحت سے کریں جو ماں باپ اور اولاد میں ہوتی ہے، جس جان شاری و درگزر کے ہم پلہ کہا جاتا ہے وہ ربط جو ایک دوسرے کے مقدر سے ہو، جو دوئی کی دیوار گرا دے۔ ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی بن جائے اور ایک کی شادی دوسرے کی پریشانی ہو۔ برصفا اس اتفاق و دوستی کے دو ہم کار، دو شریک یا دو ہم سایوں یا دو پڑوسی ملکوں میں ہوتی ہے۔

اس قسم کی صلح کا مطلب ہوتا ہے ایک دوسرے کے حقوق میں عدم مداخلت ہندو متی رب حکومتوں میں "صلح صلح" بھی ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ تیسری قوت مداخلت کرے اور دونوں کی سرحدی نائن پر قبضہ کر لے، اور دونوں حکومتوں کو جنگ روکنے کا حکم دے نتیجے میں دونوں میں صلح ہو جاتی، کیونکہ یہی صلح کے معنی صرف عدم تصادم کے ہیں۔ گھر کی صلح، یہی صلح سے مختلف ہے۔ گھریلو صلح میں فقہ ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی سے باز رہنا کافی نہیں ہے۔ گھریلو صلح میں "صلح صلح" سے کام نہیں لیتا یہاں اس سے بڑھ کر اور کسی اہم ترین اساسی بات کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی، اتحاد

یگانگت۔ دل و جان کا گھل مل جانا جیسے باپ اور اولاد کی صلح و صفائی میں ہوتا ہے۔  
 سرور سے پہننے کے بعد وہ کوئی بڑا مرحلہ۔ افسوس ہے کہ مغرب، تاریخی سبب، ممکن ہے  
 جغرافیائی عوامل کی بنا پر گھریلو جذبات سے بے بہرہ ہے حتیٰ کہ گھریلو فضا کے اندر بھی،  
 وہاں گھریلو صلح، سہمی یا معاشرتی صلح سے جدا نہیں سمجھی جاتی، یورپ کے عوام جس طرح  
 دو ملکوں کی سرحدوں پر صلح برقرار رکھتے ہیں اسی انداز سے عدالتی قوت کے ذریعے  
 میاں بیوی کی سرحدات زندگی میں صلح قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ زن و  
 شوہر کی سرحدات زندگی فی ہیں "سرحد" کا خاتمہ ہی بنیاد حیات ہے۔ وعدت اور میری  
 قوت کو میگا نہ سمجھنے کا احساس۔

مغرب پرست، اہل یورپ کو ان کی غلط فہمیاں تباہ نے۔ ان کو گھریلو مسائل اپنے فخر کی  
 باتیں سمجھانے کے بجائے، خود ان کے رنگ میں رنگنے کا وہ جنوں مول لے چکے ہیں کہ سر اور  
 پیر کا فرق یاد نہ رہا۔ لیکن یہ خود فراموشی دیر تک رہنے والی نہیں ہے، جس دن بھی  
 مشرق نے اپنی شخصیت دریافت کر لی جس دن بھی مغرب کا جوتا تار پھینکا جس دن بھی  
 آزدی کی فکر اور آزاد فلسفہ زندگی پر بھروسہ کر لیا اسی دن یہ عیب دور ہو جائیگا  
 اور وہ دن قریب ہیں۔

یہاں دو باتوں کا تذکرہ ضروری ہے:

اسلام، طلاق سے باز رکھنے والی (۱) ممکن ہے، کچھ حضرات ہماری گذشتہ  
 برتوجوہر کا خیر مقدم کرتا ہے۔

وخواہشمند نہیں ہیں۔ مرد جب طلاق دینا چاہے ہر راستہ اس کے واسطے کھلا ہو۔  
 نہیں۔ یہ اس کوئی خیال نہیں، ہم نے اسلام کے نقطہ نظر کی توضیح میں صرف یہ بتایا ہے کہ  
 شوہر کے سامنے قانون کا جبر رکاوٹ بنا کر فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اسلام، شوہر کو طلاق

سے باز رکھنے کے لیے جو بات بھی کی جائے اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اسلام نے سوچ سمجھ کر  
 صدق کے لیے ایسے شرائط اور ضابطے وضع کیے ہیں جو طبعی طور سے طلاق کو التوا میں ڈال کر  
 شوہر کو اس سے موڑ دینے والے ہیں۔

اسلام نے ایک طرف صیغہ طلاق و گواہ کی شرط رکھی، اور نیت کی سہ کے صدق  
 دینے والے کو طلاق سے باز رکھیں۔ دوسری طرف دو عادل گواہوں کے بغیر طلاق کو باطل  
 قرار دیا، یعنی ان دو آدمیوں کو جن کے سامنے طلاق دے گا انھیں عدالت و تقویٰ کے ساتھ  
 پوری سعی و کوشش کرنا ہے کہ میاں بیوی میں صلح و صفائی کرادیں۔

آج کل، طلاق دینے والا ایسے دو عادل گواہوں کے سامنے طلاق جاری کرتا ہے جنہو  
 نے میاں بیوی کو نہ دیکھا بھالانا جانا پہچانا، ان کے سامنے تو فقط دونوں کے نام یہ گئے  
 ہیں۔ یہ بات ایسی ہے جو بجائے خود کچھ بھی ہو اسلام کے نظریے اور مقصد سے الگ ہے۔  
 ہمارے یہاں رسم ہے، طلاق دینے والے دو عادل ڈھونڈ لیتے ہیں اور ان کو بٹھا کر  
 میاں بیوی کا نام لے کر صیغہ طلاق جاری کر دیتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:

شوہر احمد اور بیوی، فاطمہ، میں نے شوہر کی وکالت میں ان کی بیوی کو طلاق دی۔  
 احمد کون صاحب ہیں اور فاطمہ نامی خاتون کی تعریف کیا ہے؟ کیا دونوں عادل حضرت  
 جو بطور گواہ موجود، اور صیغہ طلاق سن رہے ہیں، ان دونوں کو دیکھ چکے ہیں؟ اگر کسی  
 دن، شہادت طلب کرنے کا موقع آجائے اور ان سے کوئی کی تفصیل مانگی جائے تو کیا وہ  
 بتا سکیں گے کہ، ہاں، ہمارے سامنے انھیں دو افراد کے درمیان صدق واقع ہوئی ہے؟  
 یقیناً، وہ یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ اب یہ گواہی کس قسم کی گواہی ہے، مجھے نہیں معلوم۔

بہر حال شوہروں کو دو عادل گواہوں کی فراہمی طلاق سے باز رکھنے کا ایک سبب ہے۔  
 بشرطیکہ یہ عمل صحیح طور پر انجام دیا جائے۔ اسلام نے ازدواج یعنی میان کے آغاز میں دو عادل  
 کی حاضری کی شرط نہیں رکھی۔ وہ کار خیر میں تاخیر نہیں چاہتا۔ مگر صدق، جو آخری عمل



ہے دو عادیوں کی حاضری پر موقوف کرتا اور شرط قرار دیتا ہے۔

سلام نکاح کے وقت ماہواری آنے کو عقد میں رکاوٹ نہیں قرار دیتا، باوجودیکہ یہ معلوم ہے کہ ماہواری کے زمانے میں میاں بیوی جنسی عمل نہیں کر سکتے اور اس بات کا تعلق شادی سے ہے طلاق سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں توجہ دہنی کا مرحلہ ہے اس کے بعد دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ رہے گا۔ قاعدے کے مطابق صیغہ نکاح ماہواری کے زمانے میں جاری ہونے بلکہ جائز نہ ہونے کی ضرورت تھی کیونکہ دونوں کا پہلی مرتبہ بچا ہونے کا مرحلہ ہوتا ہے اور ممکن ہوتا ہے کہ وقت عادت کا خیال نہ کریں۔ بخلاف ضیق کے جو عیسیٰ کی کا وقت ہے اس میں ماہواری کی عادت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اسلام چونکہ "وصل" کا حامی اور "فصل" و فراق کا مخالف ہے اس لیے زمانہ عادت کو مانع صحت طلاق قرار دیتا ہے اور مانع صحت عقد نہیں مانتا۔ بلکہ بعض مقامات پر تو تین مہینے تک "ترقیق" کو واجب قرار دیتا ہے اس کے بعد صیغہ طلاق جاری کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

صاف سی بات ہے ان سب رکاوٹوں کے پیدا کرنے کا مقصد یہی ہے اتنی مدت میں ان اذیتوں، اور غیظ و غضب کا زور ٹوٹ جائے جن کی وجہ سے طلاق پر آمادگی تھی، اور دونوں میاں بیوی مفاہمت پر تیار ہوں اور پہلی جیسی زندگی گزارنے لگیں۔

مزید برآں مرد کی ناپسندیدگی کی بنا پر طلاق واقع بھی ہو جائے جب بھی "عدے" کے نام سے دوبارہ مہلت دی گئی ہے کہ وہ فیصلہ واپس لے اور بیوی کو دوبارہ آباد کرے۔ شادی اور عدہ، نیز اولاد کی نگہداشت کی صورت میں اخراجات شوہر کو ادا کرنے کا ضابطہ بجائے خود شوہر کے لیے عملی رکاوٹ ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص طلاق اور نئی شادی کی ٹھوکیں ہے تو اسے پہلے تو زوجہ اولیٰ کے عدے کا نفقہ دینا ہوگا پھر بچے اس کے پاس رکھنا ہوں تو بچوں کے اخراجات ادا کرنا پڑیں گے۔ اس کے بعد ہی بیوی کا مہر اور اس کی زندگی کے اخراجات، اس کے یہاں ہونے والے بچے اور ان کے

اخراجات کے لیے تیاری کرنا ہوگی۔

ان سب باتوں کے علاوہ یہ ماں کے بچوں کی ذمہ داری، ایسا بچا ایک مستقبل سامنے راتی ہے کہ آدمی خود بخود اپنے ارادہ طلاق کے سامنے ایک دیوار دیکھتا ہے۔

ان باتوں سے بڑھ کر چونکہ اسلام سمجھتا تھا کہ خاندان کا رشتہ اب بھی درہم برہم ہو سکتا ہے لہذا ایک گھریلو پچھری اور فیصلہ کن حاکم کا ضابطہ بنایا یعنی ایک بیوی کا نمائندہ ایک شوہر کا نمائندہ اپنے اپنے موکلوں سے حق فیصلہ لے کر ایک جگہ بیٹھیں اور ان کے جھگڑے کا فیصلہ کر کے دونوں میں صلح صفائی کر لیں۔

دونوں منصب انتہائی کوشش کریں گے اور دونوں کے گلے ٹکڑے ختم کریں گے۔ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اگر صلح صفائی نہ ہو سکے اور مذاق ہی بہترین نہ نکلتے تو بہرحال دونوں کو الگ کر دیں۔ یہاں بھی ان آدمیوں کا ہونا بہتر ہے جن کا تعلق دونوں کے گھروں سے ہو، سورہ النساء کی آیت نمبر ۲۵ کے الفاظ یہ ہیں:

وَانْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَاْبْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اٰھِلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اٰھِلِھَا۔ اِنْ یَّرِیْدَا اَصْلَاحًا یُّوفِّقِ اللّٰھُ بَیْنَهُمَا اِنَّ اللّٰھَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا۔

اور اگر تم کو دونوں میں جدائی کا ڈر ہو تو ایک منصف شوہر کے خاندان اور ایک منصف زوجہ کے خاندان کی طرف سے مقرر کرو۔ اگر دونوں منصف اصلاح احوال چاہیں۔ اللہ ان دونوں میں موافقت و اتحاد پیدا کرے گا۔ بے شک اللہ علیم وخبیر ہے۔

صاحب تفسیر کشاف نے "حکم" کی تفسیر میں لکھا ہے:

ای مرجلا متفعلا ضیا یصلح لحکومتہ العدل والاصلاح

بینہما۔

یعنی جو شخص ثنات و منصف منتخب کیا جائے وہ معتد ہو اس کی بات قابل قبول اور گفتگو مضبوط و بادل لیل ہو اصلاح احوال اور عادلانہ فیصلے لائق اور پسندیدہ آدمی ہو۔

اس کے بعد لکھا ہے۔ پہلے مرحلے میں دونوں منصفوں کو میاں بیوی کے خاندان سے ہونے کی وجہ سے کہ ایسے افراد چونکہ دونوں کے نزدیک اور باہمی قبیضوں سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں اور رشتے داری کی وجہ سے اجنبی کے مقابلے میں زیادہ اصلاح کرنے کے امکانات رکھتے ہیں، نیز میاں بیوی اپنے دل کی بات غیروں کے بجائے اپنوں سے زیادہ کہہ سکتے ہیں، وہ اپنے راز اور خانگی معاملات غیروں سے یوں نہیں کہہ سکتے۔

پہلے کہ ثناتی کا تقرر واجب یا مستحب؟ علماء میں اختلاف ہے۔ معقین کے نزدیک یہ حکومت کی ذمہ داری ہے اور واجب ہے۔ شہید ثانی نے "مسالك" میں صاف صاف فتویٰ دیا ہے کہ ثناتی کا مسئلہ جس ترتیب سے بیان کیا گیا۔ واجب ضروری ہے اور حکام فریضہ ہے کہ وہ ہمیشہ یہ ذمہ داری پوری کرتے رہیں۔

سید محمد رشید رضا، موافق تفسیر "المنار" ثناتی کو بھی بنانا واجب ہے کہہ کر علماء اسلام کے فتوؤں میں اختلاف پر روشنی ڈالتے اور بتاتے ہیں کہ ثناتی واجب یا مستحب ہونے کی بحث عجیب ہے۔

علمائے اسلام سے مسنون، اس کے بے انتہا خصوصیات سے فائدہ ہی نہیں اٹھاتے، طلاق کا سہ بدستور ہے، اتفاق و اختلاف گھروں میں رہتا ہے، نفس قرآن ثناتی کے بارے میں ہوتے ہوئے ذرہ بھر اس کی طرف توجہ

۱۔ تفسیرنا۔ ج ۵ ص ۷۹، ضمن آیت مذکور۔

اور اس سے فائدہ اندوزی نہیں کی جاتی، ہاں علماء اسلام اس کے وجوب و استحباب کے ارد گرد بحث میں سرگرم ضرور رہتے ہیں۔ کوئی یہ کہتے والے نہیں جو ان سے کہے کہ واجب و مستحب کی، اس حکم کو نافذ کرنے کے سلسلے میں عملی اقدام کیوں نہیں کرتے؟ بحث مباحثہ ہی پر پورا زور کیوں لگ رہا ہے؟ اگر طے کر لیا ہے کہ اس حکم پر عمل نہ کیا جائے اور لوگ اس کے خصوصیات سے فائدہ نہ اٹھائیں تو واجب یا مستحب ہونے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟ شہید ثانی نے ان شرائط کے بارے میں لکھا ہے جو مستغنی، میاں بیوی کی مصالحت کے ذیل میں طے کریں:

مثلاً: منصف حضرات شوہر کو پانڈ کریں کہ وہ اپنی بیوی کو ملاں تہر یا فلاں گھر میں رہنے کی جگہ دے، یا یہ کہ مثلاً۔ اپنی ماں یا دوسری بیوی کو اس گھر میں رہنے کی جگہ دے، یا یہ کہ مثلاً۔ اپنی ماں یا دوسری بیوی کو اس گھر یا اس کے کمرے میں رکھے یا مثلاً، بیوی کا مہر جو واجب الادا ہے اسے ادا کرے۔ یا بیوی سے یہ ہونے والے قرضے کو فوراً واپس کرے۔

غرض کہ جو اقدام بھی شوہر کو طلاق سے باز رکھنے پر کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کی نظر میں صحیح اور مطلوب ہے۔

بایسویں مقالے میں سوال تھا۔ کیا معاشرہ یعنی وہ کمیٹی جو عدالت کے نام سے معاشرے کی نمائندہ ہوتی ہے، اس کا حق رکھتی ہے کہ طلاق کے معاملے میں مداخلت کر سکتی ہے؟ اس طلاق کے معاملے میں جو اسلام کی نظر میں قابل نفرت و بغض ہے، ایسا اقدام جو شوہر کو طلاق دینے کے آخری اقدام سے روک دے۔

جواب۔ یقیناً وہ ایسا اقدام کر سکتی ہے۔ کیونکہ طلاق کے لیے ہر قسم کے حتمی فیصلے حتمی موت از دواج کی علامت نہیں ہوا کرتے۔ دوسری لفظوں میں طلاق کے



بڑے تمام فیصلے ایسے نہیں ہوتے جو شوہر کے شعلہ محبت کی فسر و گی کی دلیاں کا مل ہوں اور یہ ثابت کر دیں کہ بیوی اپنے تمام و درجے سے گر گئی اور وہ فطری درجہ کھو بیٹی جس کی وجہ سے وہ شوہر کے لیے بحیثیت بیوی کے قابل نگہداشت نہ رہی۔ بہت سے فیصلے غصے، غفلت، غلط فہمی پر مبنی ہوتے ہیں، لہذا معاشرہ جس انداز اور جس ذریعے کو عملی اقدام کے لیے پسند کرے، اسلام نے خوش آمدید کہتا ہے۔

نامی دارہ، معاشرے کی نمائندگی کرتے ہوئے، طلاق کی سند یا رجسٹریشن کرنے والے اداروں کو اس وقت تک قانونی توثیق سے روک سکتا ہے۔ جب تک ادارہ صلح کی تدبیروں کو میں میں نہ ہو۔ جب ادارہ یہ کہہ دے کہ ہمیں صلح نہ ہونے کا یقین ہو گیا ہے اور میان بیوی و دونوں میں مفاہمت ممکن نہیں ہے، اس کے بعد دفتر اور متعلقہ محکمے اپنی کارروائی شروع کر سکتے ہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ غیر شریفانہ طلاق، گھر کی مقدس مرکزیت کو نقصان پہنچانے کے علاوہ خود عورت کے لیے بہت سے مشکلات پیدا کرتی ہے۔

ہے جنہیں نظر نہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایک خاتون جو کوئی برس تک خلوص و محبت کے ساتھ ایک مرد کے ساتھ رہے، گھر میں اپنے اور اس کے درمیان دوئی چھوڑ کر رہتی اور اس گھر کو آتش و زلزلہ سمجھتی ہے۔ اس گھر کو آباد و شاد رکھنے کے لیے اپنی پوری قوت و محنت صرف کرتی ہے۔ اصطلاح جدید کی بنا پر شہر کی ترقی پسند خواتین کے علاوہ عام طور پر خواتین گھر کے کام کاج کرتی اور کھانے پینے، گھر کا خرچ چلانے میں دکھ ٹھائی اور کفایت شعاری سے کام لیتی ہیں، فقط بچت کی خاطر شوہروں کو خادم و کرکھے سے ناراض کر دیتی ہیں۔ اپنی محبت و سلامتی، جوانی اور طاقت گھر، آشیانے اور بچوں پر سے، بلکہ اپنے شوہر پر نشان کر دیتی ہیں۔ فرض کریں، ایسی بیوی کو برسوں ایک

زندگی بسر کرنے کے بعد، نئی دواجن کے شوق میں کوئی شوہر طلاق دے مارے، اور اسی گھر میں جسے خوش و خرم رکھنے کی خاطر اس نے اپنی عمر و جوانی و سلامتی و متاع کی دنیا لٹائی تھی اب دوسری بیوی لانا چاہے اور اس سے عیش پرستی و ہوس رانی دکھائے تو بلیے ایسے عمل کی ذمہ داری کیا اور کس پر ہے؟

یہاں اس پر بحث نہیں ہے کہ گھر کی زندگی کی مرکزیت درہم برہم ہو رہی ہے، شادی کا رشتہ ٹوٹ رہا ہے۔ جو آپ جواب دیدیں کہ شوہر کی غیر شریفانہ روش شادی کی موت ہے اور غیر شریف آدمی کے سر کی عورت کا تھو پاجانا، عورت کی فطری منزلت و مقام کے شایان شان نہیں۔

یہاں زیر نظر بات ہے، ادارہ و بے آشیانہ ہونے کی، اپنا سجا سجا یا بسیر ارقیب کے حوالے کرنے کی، دکھ درد، زحمت و خدمت ضائع ہونے کی بات پر گھٹگو ہے۔

شوہر، گھر کی مرکزیت، شعلہ حیات خاندان کا بجھنا، جہنم میں جائے۔ آخر، ہر انسان آشیانے اور دین سے کام لیتا ہے، پھر وہ بیچارے اپنے ہاتھوں بنایا اور بس اس نفس خاطر تو جوت ہے۔ اگر کوئی پرندہ اپنے بنائے ہوئے جوتھ سے نکال دیا جائے تو کچھ نہ کچھ مزاحمت تو کرتا ہے۔ کیا عورت کو آتش بھی تھی حاصل نہیں کہ وہ اپنے گھر پر آشیانے کے لیے مزاحمت کرے؟ کیا یہ عمل مرد کی صرف کھلی ستم گری نہیں ہے؟ اسلام نے اس وقت کے لیے کیا حل بخویر کیا ہے؟

ہمارے عقیدے میں تو اس مشکل کی طرف پوری طرح دھیماں دینا چاہیے۔ اکثر غیر شریفانہ طلاق سے جو پریشاںیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا زاویہ یہی ہے۔ ان مقامات پر طلاق، خاتمہ نکاح نہیں، عورت کی ٹوٹ پھوٹ اور نابودی ہے۔

گذشتہ سوال کے ضمن میں اشارہ ہو چکا ہے کہ گھر یا آشیانے کا مسئلہ طلاق سے جدا ہے یہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔ ان دونوں کو الگ الگ ہی رکھنا ہوگا۔ اسلام

کے نقطہ نظر اور اسلامی ضابطوں کے لحاظ سے مسئلہ حل شدہ ہے۔ اس کے باوجود جو مسکوت میں وہ اسلامی ضابطوں سے ناواقفیت اور شوہروں کے غلط طریقے سے فائدہ اٹھانے، بیویوں کی خوش نشینی و وفاداری کے رد عمل سے پیدا ہوئے ہیں۔

یہ مصیبت اس وقت شروع ہوئی جب اکثر مایاں بیوی یہ سمجھ بیٹھے کہ بیوی اپنے شوہر کے گھر میں جو کام کر رہی ہے اور اس کے جو فوائد ہوتے ہیں وہ شوہر سے متعلق ہیں۔ بلکہ گمان یہ کیا جاتا ہے کہ شوہر کا حق ہے کہ بیوی کو لونڈی یا مزدور سمجھ کر حکم دیا کرے اور بیوی پر واجب ہے کہ نہ معذرت میں شوہر کی اطاعت کرے۔ دراصل عائینہ کی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ بیوی کو کم کاج میں پوری طرح آزاد ہے۔ اور جو کچھ وہ کرے گی وہ خود اپنی ذات کے لیے ہوگا، مرد کو ایک مالک کی طرح بیوی کے سامنے آنے کا حق نہیں ہے۔ اسلام نے عورت کو اقتصادی آزادی کے عدوہ اس کے اور اولاد کے اخراجات شوہر کے ذمہ واجب کیے ہیں۔ بیوی کو چھٹی خاصی بہت دی ہے کہ وہ آبرو مند زندگی کے لیے روپیہ پیسہ اور امکانات حاصل کرے کہ اگر طلاق و جدائی کا وقت آ پڑے تو شوہر سے بے نیاز اور پریشانی سے آزاد ہو۔ عورت اپنے رہن سیر کو رونق دینے کے لیے جو کچھ جمع کرے وہ اپنی سمجھ، مرد کو بے چینی کا حق نہیں ہے۔ مذکورہ پریشانیاں اس سماج میں ہوتی ہیں جہاں بیوی کو میاں کے گھر میں بہر حال کام کاج کرنے کا پابند سمجھا جاتا ہے۔ پھر اس کی محنت کے نتائج شوہر کی ملکیت ہیں۔ بیوی کا اس سے کیا واسطہ۔ فکر مندی عوام کا تعلق ان کی دائمی اور قانون اسلام سے بے خبری سے ہے اور کچھ نہیں۔

دوسری وجہ شوہر کا اپنی بیوی اور اس کی وفاداری سے غلط فائدے اٹھانے سے کچھ خواتین اپنے شوہروں کے یہاں قانون اسلام سے بے خبری کی بنا پر نہیں، صرف شوہروں پر بھروسہ رکھنے کی وجہ سے جاں نثاری کرتی ہیں۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ دونوں میں من و تو، اپنا پر لیا نہ رہے۔ یہ پیسہ ہمارا، یہ ان کا ہے، اچھا خیال نہیں

سمجھتیں۔ لہذا، اسلام کے دیے ہوئے حقوق سے فائدہ اٹھانے کی طرف دھیان نہیں دیتیں۔ اچانک جو آنکھیں کھلتی ہیں تو محسوس کرتی ہیں کہ ایک بے وفائے محبت کر کے اور جاں فدا کر کے ان مہلتوں سے فائدہ اٹھانے کا وقت ہاتھ سے کھو دیا۔

اس قسم کی خواتین کو شروع سے دھیان دینا چاہیے کہ محبت کا موقع وہ ہے جہاں "دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی" اگر بیوی مانع کرنے، دولت اٹھا کر سٹے، آشیانہ بناتے، بیسرا سجاتے ہیں اپنا نام نظر انداز کرتی اور اپنا حق شرعی مرد کے لیے چھوڑتی، اپنی قوت مرد کو ہدیہ دیتی ہے تو شوہر کو بھی اسی انداز سے رد عمل دکھانا چاہیے:

"وَإِذَا حِثِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَجَسَّوْا بِأَحْسَنِ مِنْهَا أَوْ رَدُّوْهَا"

اور جب تم مجھیں ہدیہ دیا جائے تو تم بھی اس سے اچھا ہدیہ دو یا اسی کو واپس کر دو۔

یعنی اگر بیوی کوئی ہدیہ پیش کرتی ہے تو اسے اسی معیار ہی کا سہی کوئی ہدیہ، بیوی کو بھی نذر کرنا چاہیے۔ وفادار شوہروں کا ہمیشہ یہ دستور رہا اور آج بھی ہے کہ بیوی کی مخلصانہ فداکاری کے جواب میں قیمتی ہدیے، مکان یا اثاثہ اپنی بیوی کو نذر کیا کرتے ہیں۔

بہر حال شیانہ اجرٹنے اور بے گھر ہونے کا، قانون صفاق سے کوئی تعلق نہیں، قانون طلاق کی تبدیلی اس کی اصلاح نہیں کر سکتی، اس مسئلہ کا تعلق عورت کی اقتصادی آزادی و بے آزادی سے ہے اور اسلام نے اسے حل کر دیا ہے۔ ہمارے سماج میں یہ مشکل کچھ عورتوں کی اسلامی تعلیمات سے بے خبری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے یا پھر دوسرے گروہ کی غفلت و سادہ لوحی کا نتیجہ ہے۔ خواتین کو اگر معصوم ہو کر مرد نے ان کے لیے کیا مواقع انھیں دیے ہیں۔ اور شوہر پر جان نثاری میں سادہ لوحی کا مظاہرہ نہ کریں تو مشکل خود بخود حل ہو جائے۔



## طلاق (آزادی۔ اور حق)

۵۱

معاہدہ کرتے والے کو یاد ہوگا، ہم نے بائیسویں فصل میں طلاق سے پیدا ہونے والے سماجی شکست دو پہلوؤں سے بیان کیے ہیں۔ ایک غیر شریفانہ طلاق کا رخ تو شوہر کی غیر شرافت مندی و غیر انسانی رویہ جو طلاق دلوںات ہے۔ دوسرے، کچھ شوہر کا یہ رویہ کہ بیوی کو سزا دی جائے وہ غیر شریفانہ طور پر طلاق نہیں دیتے، ان کا مقصد اس زوجہ کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے زندگی بسر کرنے کا ہوتا ہی نہیں۔

دو فصل پہلے حصہ اول پر بحث ہو چکی، وہاں کہا ہے کہ اسلام ہر قسم کی غیر شریفانہ طلاق کو روکنے والے انتظامات کی حمایت کرتا ہے۔ ایسے طلاق کے لیے خود اسلم نے بھی رکاوٹوں کی تدبیریں کی ہیں۔ اسلام خاندانی تعلقات میں قوت استعمال کرنے اور زور آوری کے ذریعے فائدہ اٹھانے کے خلاف ہے۔

ان معروضات سے واضح ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں اسلام ایک ”زندہ ادارہ“ ہے۔ اسلام کو شش کرتا ہے کہ یہ زندہ موجود اپنی زندگی باقی رکھے، مگر جب زندہ موجود، مرجائے تو اسے افسوس کی نظر سے دیکھتا اور دفن کی اجازت جاری کرتا ہے وہ اس مردے پر قانون کی مومیائی نہیں چڑھانا چاہتا تاکہ وہ حوط شدہ لاش کو متحرک اور اٹھائے پھرا جائے۔

شوہر کو حق طلاق دینے کی علت و وجہ معلوم ہو گئی۔ یعنی میاں بیوی کا رشتہ

ایک فطری علاقہ مندی ہے۔ اس کی خاص تکنیک ہے۔ اس میں بیوی کو مضبوط بنانے اور سے بیکار کرنے کی دونوں گنجائشیں تخلیق نے مرد کو عطا کی ہیں۔ میاں بیوی دونوں بچائے خود تخلیق کی بنیاد پر خاص پوزیشن کی مالک ہیں جن کا بدلنا یا بالکل ایک جیب ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ یہ خاص وضع اور پوزیشن اپنی اپنی باری پر متعدد امور کی علت و سبب بنتی ہیں۔ جیسے حق طلاق۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس معاملے کی علت و خاص وجہ، میاں بیوی کا خاص کردار ہے۔ محبت و عشق و رشتہ زن و شوہر ہی ہیں۔

حق طلاق۔ مرد کے خاص کردار کا نتیجہ ہے، اس کا تعلق عشق سے ہے، مالکیت سے نہیں۔ اس موقع پر آپ مغایین اسلام کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

یہ گروہ کہتا ہے کہ اسلام نے مرد کو حق طلاق اس وجہ سے دیا ہے کہ وہ عورت کو زندہ و خواہش و آرزو کا مالک نہیں جانتا، اسلام عورت کو ”چیز“ سمجھتا ہے ”شخص“ نہیں مانتا۔ اسلام شوہر کو بیوی کا مالک جانتا ہے، اسے حق دیتا ہے، جب چاہے اپنے موک کو آزاد کر دے۔ کیونکہ،

الناس مسلطون علیٰ اموالہم  
لوگ اپنے مال کے مالک و مختار ہوتے ہیں۔

ہماری گفتگو سے معلوم ہو گیا کہ منطق اسلام شوہر کی مالکیت اور بیوی کی ملکیت پر مبنی نہیں ہے۔ اسلام کی منطق و اسلام کا فلسفہ ان کھٹے والوں کی فہم سے زیادہ عمیق اور ان کی ذہنی سطح سے زیادہ بلند ہے۔ اسلام نے گھر کی تعمیری بنیاد اور اس ادارے کی اساس، اس کے نکات اور رموز کی اشاروں سے معلوم کیے اور ان کا سرخ لگایا ہے۔ اب چودہ سو برس بعد علم ان کی گہرائیوں کے قریب پہنچ رہا ہے۔

طلاق، اس لیے آزادی ہے کہ شادی کی فطری حقیقت "رفاقت" ہے۔  
 کبھی کبھی یہ کہتے ہیں :-  
 (طلاق میں آزادی دھوڑنے کا انداز کیوں ہے؟ اسے یقیناً

فیصلے کا رنگ ملنا چاہیے !  
 ان سے کہا جائے :

طلاق آزادی دہانی اس لیے ہے کہ ازدواج و شادی رفاقت ہے۔ اگر آپ تمام اجناسِ مرد و مادہ سے "جوڑے" کے اس قانونِ فطرت کو بدل سکیں اور ازدواج (جوڑے پن) کی فطری ساخت کو رفاقت کے قالب سے نکال لیں، اگر آپ یہ سوچیں کہ جنسِ مرد جنسِ مادہ کو۔ انسان ہو یا حیوان۔ ایک کو دوسرے جیسے اثرات دے دیں اور قانونِ فطرت بدل ڈالیں، تو پھر طلاق کو بھی "رہائی" کے قالب سے نکال دیجیے۔

ان غاصریں سے ایک نئے لکھا:

عقد ازدواج کو شیعوہ فقہاء عموماً "عقد لازم" شمار کرتے ہیں، بظاہر ایرانی قانون لا۔ قانون مدنی۔ بھی "عقد لازم" ہی جانتا ہے۔ لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ فقہ اسلامی اور قانون مدنی ایران کے مطابق عقد نکاح فقط عورت کی جہت سے لازم ہے، مرد کی نسبت سے "جائزہ عقد" ہے کیونکہ مرد جب چاہے مذکورہ عقد کو ختم کر دے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں :

"عقد ازدواج مرد کی نسبت سے جائز اور عورت کی نسبت سے لازم ہے ایک لاقانونیت کی بات ہے۔ یوں عورت کو مرد کا اسیر و قیدی بنا دیا گیا ہے۔ میں دفعہ ۱۱۳۳، (قانون مدنی کشور شہنشاہی ایران) کے "قانون حق مرد و بطلان"

کا مطالعہ کرتے وقت، ان ایرانی قوانین سے شرمندگی محسوس کرتا ہوں، جو اس ایٹم کی مدد میں ہیں، چاند اور ڈیپاکرہیسی کے دور میں، کاجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہی (دو اس قانون کے بارے میں کیا کہیں گی)۔

پہلے تو یہ حضرات ایک واضح بات نہیں سمجھ سکے۔ طلاق، فسخ نکاح سے مختلف چیز ہے یہ کہنا کہ عقد ازدواج "فطرتاً لازم (بندھن) ہے" یعنی میاں بیوی میں سے کسی کو حقیقی فسخ نہیں۔ چند مقامات مستثنیٰ ہیں۔ اگر عقد نکاح فسخ ہو جائے تو اس کے تمام اثرات بھی ختم ہو جائیں گے۔ مثلاً۔ مہر ختم ہو جائے گا، بیوی کو مہر طلب کرنے کا حق نہ رہے گا یا پھر عدت کے دنوں کا نفقہ نہیں ہوگا۔ طلاق کی صورت اس سے مختلف ہے۔ یہاں زوجیت کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد بھی عقد کے اثرات مکمل طور پر ختم نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شخص کسی قانون سے شادی کرے اور فرض کیجئے پانچ سو ہزار روپے مہر ملے کرے، ایک دن میاں بیوی کی طرح رہ کر طلاق دے دے۔ اسے پورا مہر دینا ہوگا اور عدت کے دنوں کا نفقہ بھی ادا کرنا پڑے گا۔ دوسری صورت یہ دیکھیے کہ مرد عقد کرتا اور میاں بیوی کے عمل سے پہلے بیوی کو طلاق دیتا ہے، یہاں آدھا مہر ادا کرنا ہوگا، اور چونکہ اس عورت پر عدت واجب نہیں لہذا نفقہ طبعی طور پر واجب نہ ہوگا۔ تو یہ معلوم ہو گیا کہ طلاق سے نکاح کے تمام اثرات ختم نہیں ہوتے، درآئیں لیکہ اگر مذکورہ نکاح فسخ ہو جائے تو بیوی کا حق مہر باقی نہیں رہتا۔ لہذا طلاق اور فسخ اور ہے۔ حق طلاق اور عقد ازدواج کے لازمی ہوتے ہیں کوئی منافات و فرق نہیں ہے۔ اس دم کے پاس دو مدین ہیں۔ ایک فسخ اور دوسری مد طلاق ہے۔ فسخ کا حق وہاں دیا ہے، جہاں کچھ عیب میاں بیوی میں ہوں۔ حق فسخ شوہر کو بھی حاصل ہے، بیوی کو بھی ہے۔ بخلاف حق طلاق کے۔ جب گھریلو زندگی مردہ و بے جاں ہو جائے تو صرف مرد کو حق ہے وہ طلاق دے کر اس صورتِ حال کو ختم کر دے۔



سہم نے طلاق کی مدفع سے الگ رکھی ہے اور طلاق کیلئے الگ ضابطہ وضع کیے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فلسفہ اسلام میں مرد کو طلاق کا اختیار اس کے لیے کوئی خصوصیت اعزاز نہیں ہے۔

ان حضرات سے کہنا چاہیے۔ کابھوں اور یونیورسٹیوں۔ اور مصنوعی چاند کے دور سے شرمندہ نہ ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ ذرا سبق لیں۔ نسخ و طلاق کا فرق سمجھ لیں۔ اسلام کے معاشرتی فلسفہ کا ورک حاصل کریں یہ فلسفہ گہرا بھی ہے اور گھبرائیو معاشرے کے واسطے مفید بھی ہے اس کی واقفیت سے آپ شرمندگی کے بجائے گردن اٹھا کر ان کے سامنے سے گزر سکیں گے۔ افسوس۔ جہالت، دروہ لا دوا ہے۔

**طلاق کا جرمانہ** | دنیا کے کچھ قوانین میں طلاق کو روکنے کی خاطر جرمانہ بھی رکھا گیا ہے۔ آج کی دنیا میں تو ایسے قانون کا مجھے تو علم نہیں مگر روم کی مسیحی شہنشاہی میں، بغیر کسی موقوف وجہ کے بیوی کو طلاق دینے کی سزا موجود تھی۔

روشن حقیقت یہی ہے کہ جرمانہ "گھبرائیو زندگی" کی ہلتی نیو کو مضبوط کرنے میں قانون کے زور سے بھی فائدہ رساں نہیں۔ ہاں، ایک قسم کا فائدہ اندوزی مفروضی اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ **اگر حق طلاق بیوی کو تفویض ہو؟** کہ یہاں تک ہماری گفتگو یہی رہی کہ

"فطری حق کے طور پر" طلاق کا تعلق شوہر ہی سے ہے۔ یہی بات کہ آیا شوہر مطلقاً ہمیشہ اور ہر جگہ۔ یا خاص صورت میں اپنی طرف سے بیوی کو وکیل بنا کر حق طلاق دے سکتا ہے؟ یہ بات فقہ اسلام بھی منظور کرتی ہے اور قانون مدنی ایران میں بھی صاف صاف درج ہے۔ ضمناً شوہر کو اپنی وکالت بیوی کو دینے کے بعد اسے واپس لینے سے روکنے کی خاطر وکالت بلا عزل کا ضابطہ بھی رکھا ہے۔ عقد لازم میں یہ

وکالت ضمنی شرط کے طور پر دی جاتی ہے۔ اس شرط کے بعد بیوی مطلقاً، یعنی وقت اور ہر جگہ یا صرف پہلے سے معین شدہ اور طے کردہ صورتوں میں اپنے آپ سے مطلقہ بنا سکتی ہے۔

مدتوں سے یہ قاعدہ چلا آ رہا ہے کہ جو بیویاں پتے شوہروں سے شروع ہی سے متردد ہوتی ہیں وہ "شرط ضمنی عقد" کے طور پر حق عقد محفوظ کر سکتی ہیں اور جو وقت ضرورت اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

فقہ اسلام کی رو سے، فطری طور پر حق طلاق تو نہیں رکھتی لیکن معاہدے کے طور پر یعنی شرط ضمنی عقد کی صورت میں یہ حق حاصل کرنا ممکن ہے۔ قانون مدنی، دفعہ ۱۱۱۹ ہے :

"عقد ازدواج کے دنوں فریق، ہر وہ شرط طے کر سکتے ہیں جو عقد مذکور کے تقاضوں کے خلاف نہ ہو۔ ایسی شرط عقد ازدواج یا عقد لازم میں رکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً یہ شرط کر لی جائے کہ شوہر جب بھی دوسری شادی کرنا چاہے گا، یا اس مدت کے درمیان غائب ہو جائے گا، یا ترک نان و نفقہ کرے گا، یا بیوی کے قتل کی تدبیر کرے گا، یا ایسی بدسلوکی سے پیش آئے گا جس سے دونوں کی زندگی ناقابل برداشت ہو جائے تو بیوی وکیل در وکیل ہے کہ شرط پوری ہوتے ہی محکمے میں دعویٰ ثابت کرنے کے بعد اپنے آپ سے مطلقہ بنالے"

آپ نے ملاحظہ فرمایا، جو لوگ کہتے ہیں کہ فقہ اسلام اور قانون مدنی ایران میں طلاق کو ایک طرف حق قرار دیا گیا ہے۔ یہ حق صرف مرد کو حاصل ہے اور بیوی سے بالکل چھین لیا گیا ہے صحیح بات نہیں ہے۔

فقہ اسلامی کے نقطہ نظر اور قانون مدنی ایران کے زاویے سے حق طلاق فطری طور پر نہیں مانا گیا ہے، البتہ ایک معاہداتی اور تفویض شدہ حق موجود ہے۔

اب وہ منزل آگئی ہے کہ ہم بحث کے دو سرے پر گفتگو شروع کریں یعنی بعض مردوں کا غیر شرفیہ و خالمانہ انداز سے صدق نہ دینے کا موضوع۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے اس مشکل کا حل نکالا ہے؟ ورنہ کیا بات بہت پریشانی کی ہے۔ اس مدعا پر گفتگو کا عنوان "عدالتی صدق" جسے ہم شروع کرنے سے پہلے ناظرین سے معذرت خواہ ہیں کہ پہلے مسئلہ پر بات درالبی ہوگئی۔

## عدالتی طلاق

عدالتی طلاق یعنی شوہر کے ذریعے کے بغیر قاضی یا جج کے ذریعے جاری ہونے والی طلاق۔

دنیا کے اکثر قوانین میں طلاق کا اختیار قاضی کو حاصل ہے۔ عدالت ہی طلاق دے سکتی ہے وہی زوجیت کی گردہ کھٹنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس رائے کے بموجب تمام صدق عدالتی ہیں۔ ہم گزشتہ مقالات میں روح ازدواج اور خاندانی مرکزیت کا مقصد اور گھر لوہا حوں میں بیوی کا درجہ بیان کرتے ہوئے مذکورہ بالا رائے کی تردید کر چکے ہیں۔ ہم نے ثابت کیا ہے کہ جو طلاق اپنی فطری راہ سے منزل تک آتے ہیں وہ قاضی سے وابستہ نہیں کیے جاسکتے۔

سردست ہماری بحث یہ ہے کہ کیا اسلام کی نظیر میں قاضی سخت و سنگین شرائط قضا و قاضی کے باوجود کسی صورت حال میں طلاق جاری کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ یا ایسے خصوصی حالات ہیں جہاں قاضی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے؟ اگرچہ وہ حالات استثنائی اور بہت ہی کم کیوں نہ ہوں۔

طلاق، مرد کا طبعی حق ہے بشرطیکہ بیوی سے تعلقات کی رفتار فطرت کے مطابق رہے ہوں میاں بیوی کی فطری روابط کی رفتار کا تقاضہ اگر ہم زندگی گزارنا ہے تو اس کی بخوبی نگہداشت کیے اور اچھی طرح خیال رکھے۔ حقوق ادا کرے حسن معاشرت و حسن سلوک پیش آئے۔ اور گریجوی کی رفاقت کا خیال نہیں تو حسن خوبی سے طلاق دیدے، یعنی بے طلاق اسے نہ چھوڑے۔ اور اس وقت بھی حقوق



واجب کے علاوہ ایک انسانی رقم بطور سکر یہ اسے پیش کرے۔  
قرآن مجید کا حکم بھی ہے:

وَمَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسَعِ قَدْرَهُ وَعَلَى الْمَقْتَدِرِ قَدْرَهُ

ترجمہ: ۳۴۲/۱

ان کو مال و متاع دو خوش حال شوہر اپنی حیثیت اور نگہداشت اپنی حیثیت کے مطابق۔

اس کے ساتھ ہی اس رشتے کے خاتمہ کا اعلان کر دے۔

ہاں، اگر طبعی رفتار طے نہ ہو، پھر کیا ہوگا؟ یعنی، ایک ایسا شوہر پیدا ہو جائے جو زندگی بھی ایک ساتھ نہ گزارے، حسن سلوک بھی نہ رکھے۔ اسلام کی پسندیدہ خوش نصیب گھرانے کی مرکزیت بھی نہ چاہے اور بیوی کا رشتہ بھی نہ توڑے تاکہ وہ اپنی راہ لے۔ یوں کہہ لیجئے کہ نہ تو فرائض شوہری پورے کرے اور بیوی کو راضی رکھنے کی کوشش کرے نہ طلاق دینے پر راضی ہو۔ یہاں کیا کرنا چاہیے؟

طلاق، فطری انداز سے ولادت کا عمل ہے، جو اپنی طبعی رفتار سے چلتا ہے لیکن شوہر کی طرف سے وہ طلاق جس میں نہ تو شوہر اپنی ذمہ داریاں نبھائے، نہ طلاق پر تیار ہو۔ ایسا عمل ہے جیسے غیر طبعی طور پر بچہ ہونے کا عمل جس میں، سرجن بچے کو شکم سے باہر دے۔

کیا بعض شادیاں سرطان ہیں،  
بیوی جلتی رہے اور نباہتی جائے؟

باد جو دیہی حکم دیتا ہے کہ طلاق کا عمل سو فی صد، شوہر کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب ایسا شوہر طلاق پر راضی نہ ہو، بیوی جلتی اور نباہتی رہے۔ اسلام ایک ہاتھ دوسرے

کے ہاتھ میں دیے و دے اس نظام نہ رویے کو دیکھتا رہے؟  
بہت سے حضرات کا خیال یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اسلام کی نظریوں اس مرض کی کوئی دوا نہیں، یہ ایک قسم کا سرطان ہے  
کبھی کبھی آدمی اس کا مریض ہو جاتا ہے اس کا علاج ہی نہیں ہے۔

بیوی دیکھ جھیلے اور ساتھ دے، آخر جیتے جتے ٹھنڈی ہو جائے۔  
میرے نزدیک یہ طرز فکر اصول اسلام سے قطعی طور پر متضاد ہے۔ جو دین عدل کا دم بھرتا، "قیام بقسط" یعنی انصاف کا قیام اپنا نصب العین اور تمام پیغمبروں کا اساسی دستور بتاتا ہو۔

"لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ

وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ...." (قرآن کریم، سورۃ الحجہ ۵)  
ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تاکہ وہ لوگوں میں انصاف قائم کریں۔

اس کے بعد کیسے ممکن ہے کہ وہی دین کھلم کھلا ظلم کا علاج نہ کرے، کیا ممکن ہے کہ اسلام اپنے قوانین اس انداز سے وضع کرے جس کا نتیجہ یہ نکلے کہ ایک بے چارہ سرطان کا دیکھ جھیلے اور مر جائے؟

افسوس کی بات ہے، کچھ حضرات اقرار کرتے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام دین عدل ہے، اپنے میں، عدلیہ فرستے میں شمار کرتے ہیں وہ اس طرح کا نظریہ رکھیں اگر یہ طے کر لیا جائے کہ ظالمانہ قانون کو سرطان کا نام دے اسلام کے سر تھوپ دیں تو پھر کیا سرج ہے ایک اور ستم گرانہ قانون کو "سینس" اور تیسرے کو "سلسل" پھر نوٹھے قانون کو "اعصابی فالج" جیسے نام دے کر معاف بھی کر دیں اور قبول بھی کر لیں۔

اگر یہی بات ہے تو اصل عدل جو اسلامی قانون سازی کا بنیادی ستون

ہے وہ کہاں برقرار رہے گا۔

کہتے ہیں۔ سرطان۔ میں عرض کرتا ہوں، بہت اچھا، سرطان بھی، تو اگر کوئی بیمار سرطان میں مبتلا ہو جائے کیا اسے اہمیت نہ دی جائے۔ اس کا علاج نہ کیا جائے، فوری اقدامات کے ذریعے بیمار کی جان نہ بچائی جائے۔

ایک خاتون، زندگی بھر کے لیے کسی مرد کے ساتھ رہنے پر تیار ہوتی ہے، اس کے بعد حالات پٹا کھاتے ہیں، اور معاملہ یہ آ پڑتا ہے کہ شوہر اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، اور ازدواجی زندگی کا خاطر نہیں، بلکہ اسے دوسری شادی، اور دوسری فتنی حیات سے محروم رکھنے کی نیت سے بغیر قرآن مجید معلقہ کی طرح چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ہوا میں لٹکی رہی۔ واقعاً ایسی خاتون سرطان کی بیمار ہے مگر یہ سرطان و سرطان ہے جس کا بہ آسانی علاج ہو سکتا ہے۔ اور بیمار ایک معمولی سے آپریشن کے بعد قطعی طور پر مکمل شفا حاصل کر سکتا ہے۔ یہ آپریشن اور عمل جراحی حاکمان و قاضیان سر کر سکتے ہیں، جو خاص شرائط اور کوالیفیکیشن کے مالک ہوں۔

ہم گزشتہ مقالات میں اشارے کر چکے ہیں کہ دو مشکلوں میں سے ایک مشکل و مہیت جس سے ہمارا معاشرہ دوچار ہے، وہ یہی ہے چند ظالم شوہر، طلاق سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ اور اس عمل بد کے لیے دین کا نام لیتے اور ظلم ڈھالتے ہیں، پھر ان ستم ظریفوں پر اضافہ ان کا انداز فکر ہے وہ بھی دین و اسلام کے نام سے کہتے ہیں؛

عورت کو ظلم، لا علاج سرطان سمجھ کر برداشت کرنا چاہیے۔ اس سوچ نے ہر اسلام دشمن پروپیگنڈے سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

باوجودیکہ یہ بحث فنی و فقہی، اور ماہرانہ پہلو رکھتی ہے، پھر ان مقالات کے دائرے سے باہر بھی ہے۔ مگر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں تھوڑی سی گفتگو کرتا چلوں تاکہ بدین افراد پر یہ روشن ہو جائے کہ اسلام ان باتوں کے علاوہ کچھ اور

کہتا ہے۔

**بند راستے:** مسائل ازدواج و طلاق کے بند راستوں کی طرح کچھ اور مقامات بھی ہیں جہاں راہیں بند معلوم ہوتی ہیں مثلاً مالی مسائل ہیں۔ تو آئیے دیکھیں "ازدواج و طلاق" کے علاوہ، اور بھی جہاں راستے بند ہیں ویاں اسلام نے کیا کہا ہے؟ کیا اس راستے کو بند ہی رہنے دیا ہے۔ یا اسے راستے کی رو نہیں بننے دیا بلکہ کوئی حل نکالا ہے۔

فرض کریں، دو شخص ترکے یا اور طرح سے ایک ناقابل تقسیم چیز کے مالک ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک موتی یا ایک انگوٹھی یا موٹر یا پینٹنگ۔ دونوں مل کر اس سے فائدہ اٹھا پر تیار نہیں کہ ایک مرتبہ ایک لے جائے۔ دوسری مرتبہ دوسرا استعمال کرے۔ اس پر بھی تیار نہیں کہ ایک آدمی اپنا حصہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے، اس کے علاوہ بھی کوئی مفاہمت نہیں ہوتی۔ ہمیں معلوم ہے اس چیز سے فائدہ اسی وقت اٹھایا جاتا ہے جب دوسری رضا حاصل ہو۔ ایسی جگہ کیا کریں؟ اس مال کو پورا بننے دیں کوئی فائدہ نہ اٹھائیں اور موضوع ناقابل حل یا ناقابل علاج حادثہ سمجھ کر سے چھوڑ دیں یا اسلام نے کوئی حل نکالا ہے؟

درحقیقت فقہ اسلامی نے ان مسائل کو ناقابل حل مشکل کے طور پر کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ حتیٰ مالکیت اور مال پر ایسا قبضہ جو مال کو بے استفادہ بنا دے۔ اسلام، ایسے شخص کا احترام نہیں کرتا، اور ایسے تمام مقامات میں جہاں مال کو بے فائدہ بنا دیا جائے فوراً اسلامی عدالت سے مداخلت کی درخواست دی جائے، حاکم شرع سے رجوع کے وقت لے معاشرتی مسئلہ سمجھا جائے یا ایک اختلافی مسئلہ سمجھ کر قاضی اجازت دے دے کہ صاحبان حقوق کی باہمی چٹپٹاش کے خداف فیصد یہ ہے اور صحیح حل یوں ہوگا۔ مثلاً، زیر بحث مال دونوں مالکوں سے لے کر کر لے



پردے دیا جائے اور کرپے سے حاصل شدہ رقم ان میں تقسیم کر دی جائے۔ یا وہ مال بیچ کر قیمت، مالکوں میں بانٹ دی جائے۔ بہر حال حاکم یا قاضی شرع کا یہ اختیار "ولیّ متنع" کام بھی ہے کہ وہ اس قصے کی صحیح حلیٰ تدبیر کرے۔ حاکم شرع کو اصل مالکان کی رضائے لینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

یہ مفہومات پر قانونی مالکیت کی پرواہ کیوں نہیں کی جاتی؟ اس لئے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے کہ یہاں ایک دوسری "اصل" (قانون کلیہ) سے کام لیتے ہیں۔ یعنی اصل یہ ہے کہ مال ضائع ہونے اور قابل استغاثہ نہ ہونے سے بچایا جائے۔ مالکیت، اور مالکان، مال کے قبضے کی ایک حد تک رعایت کی جائے گی وہ حد یہ ہے کہ مال و دولت منجمد اور بے فائدہ نہ ہونے پائے۔

فرض کریں، وہ مال جس پر اختلاف ہو گیا ہو۔ موتی یا تلوار جیسی چیز، کوئی اس پر تیار نہ ہو کہ اپنا حصہ دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ دونوں اس پر تیار ہوں کہ اس چیز کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں اور ہر حصہ وار ایک حصہ اٹھالے، جھگڑا یہاں تک پہنچ جائے کہ ان کی قیمت و اہمیت ہی ختم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ موتی یا تلوار یا موٹر گاڑ دی جائے تو بیکار ہو جائے گی۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے؟ نہیں کیوں؟ اس واسطے کہ مال کا ضیاع ہے۔

فقہاء، سد میں درجہ اول کے فقہاء، علامہ حلی کہتے ہیں کہ اگر مالک ایسا اقدام کرنا چاہیں تو حاکم اسلام انہیں روکے۔ اگر باب دولت و مال کی باہمی موافقت اور ایسے کام پر ان کا سمجھوتہ تسلیم نہیں ہوگا اور انہیں اس کی اجازت نہیں دی جائیگی۔

### طلاق کا بند راستہ

بہنیں مسئلہ طلاق میں کیا کیا جائے۔ ایک شخص تباہی خاندان کا سر میں سودا لیے ہو۔ اسلام کے عام کردہ حقوق و فرائض ادا نہ کرنے پر تلا ہو۔ مالی ذمہ داریوں میں نفقہ، اخلاقی

فرائض میں حسن سلوک جنسی فرائض میں ساتھ رہیں سہن اور ہم خوابی سے عہدہ برا نہیں ہوتا۔ ایک بھی حق ادا نہ کرے یا کچھ ادا کرے کچھ نہ کرے۔ بہر حال بیوی کو طلاق نہیں دینا چاہتا۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ اس دم کی نظر میں مورد کی اہمیت کے لحاظ سے کوئی صل نافذ ہے جس کی بدولت حاکم یا قاضی شرع مداخلت کا حق رکھتا ہے جیسے مال کے معاملے میں اسے اجازت حاصل تھی۔ یا کوئی ایسی اصل موجود نہیں؟

**آیت اللہ علی کا خیال:** میں اس موقع پر سلسلہ گفتگو آیت اللہ علی مقیم نجف کے حوالے کرتا ہوں، موصوف ہمارے عہد کے علماء صف اول میں ہیں۔ انہوں نے "حقوق زوجہ" نامی رسالے میں انہماں نظر کیا ہے۔ حقوق زوجہ اور مرد کی رکاوٹ پر ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے:

"ازدواج ایک مقدس پیمان ہے۔ عین اسی وقت دونوں میں شرکت اور دو فریقوں میں معاہدہ و مفاہمت ہے اور دونوں فریقوں کی خوش نصیبی و خوش حالی کی ضمانت بھی ان مفاہمتوں کی پابندی میں ہے پھر ان کی خوش حالی سے معاشرے کی خوش حالی بھی وابستہ ہے۔"

"زوجہ کے اہم حقوق ہیں نان و نفقہ و لباس، ہم خوابی و حسن معاشرت و حسن خلاق۔"

اگر زوجہ کے حقوق کی ادائیگی میں شوہر غفلت کرے اور طلاق بھی نہ دے تو بیوی کا حق کیا ہے؟ وہ شوہر سے کیونکر مقابلہ کرے؟

یہاں دو راہیں ہیں۔ ایک تو حاکم شرع کا حق مداخلت ہے۔ وہ طلاق جاری کر کے قصہ تمام کرے دوسری بات یہ ہے کہ بیوی اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کرے اور شوہر سے کیے ہوئے معاہدات کی پابندی چھوڑ دے۔

**آیات و احادیث** پہلا نکتہ یعنی حاکم شرع کی مداخلت دیکھنا ہوگا کہ اسے مواقع پر کون سی "اصل" اور اس اقدام کو جائز قرار دینے والی وجہ جواز حاکم شرع کے واسطے کیا ہے؟

قرآن، سورہ بقرہ میں ہے:

الطَّلَاقِ مَرَّتَانِ، فَمَا سَاءَ بِمَعْرُوفٍ أَدْتَشْرِبُحُ

باحسان - (القرآن - البقرہ/۲۲۹)

حق طلاق (دو - جو) دومرتبہ سے زیادہ نہیں اس کے بعد مناسبت انداز میں گھر آباد رکھا جائے یا نیکی کے ساتھ رہائی دی جائے۔

اسی سورہ بقرہ میں ہے:

وَإِذَا طَلَقْتِ الْمَرْأَةَ فَبَلِّغِيهَا مَالَكُمْ بِمَعْرُوفٍ أَدْتَسَرَّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تَمْسُكُوْهُنَّ ضُرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ - (القرآن الکیم، البقرہ/۲۳۱)

اور جب بیویوں کو طلاق دو اور ان کا عتدہ تمام ہو جائے تو یا انھیں اچھی طرح آباد رکھو یا اچھے انداز میں ان کا راستہ چھوڑ دو۔ اور انھیں ایذا رسانی کے لیے پابند نہ کرو کہ ستم ڈھاؤ اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خود اپنے اوپر ستم کرتا ہے۔

نایات سے ایک اصل کلی "کا استفادہ ہوا۔ یعنی ہر شوہر گھر چلو زندگی میں روپے سے ایک روپیہ پسند کر لے۔

الف - تمام حقوق و فرائض بحسن و خوبی انجام دے۔ امساک بمعروف اچھے انداز میں نگہداشت۔

ب - زوجیت کا رشتہ توڑ دے، بیوی کو آزادی دے۔ تشریح بانسٹا

نیکی کے ساتھ رہنا کرنا۔

رہا تیسرا رویہ کہ بیوی کو طلاق نہ دینا، پھر اسے آباد نہ رکھنا ربط و ضبط توڑنا یہ نقطہ نظر اسلام میں وجود نہیں رکھتا۔ نہ کہ تلمسکوھن ضراراً لیتعندوا (ان کو ضرر دینے کے لیے نہ روکو کہ ان پر ظلم کر سکو) اسی رویے کی نفی کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملہ کا مفہوم زیادہ عام ہو۔ یعنی ان رویوں کی بھی ممانعت ہے جہاں شوہر عداوت کو تباہیاں کرتا ہے کہ بیوی کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ اور ان رویوں کو بھی برا کہا گیا ہے جہاں اگر شوہر جان بوجھ کر تو نقصان و ضرر نہ پہنچائے لیکن بیوی کا گھر میں رہنا اور ساتھ رکھنا بیوی کے لیے سرسبزیاں ہو۔

یہ آیات، نازل تو ہوئی ہیں عتدہ و رجوع و عدم رجوع شوہر کے بارے میں یعنی مرد کی ذمہ داری و اصرار کی جارہی ہے کہ طلاق کے بعد بیوی سے رجوع کسی مقول بنیاد پر ہونا چاہیے، رجوع اس لیے ہو کہ اب بیوی کو اچھی طرح رکھے گا۔ رجوع کا مقصد بیوی کی اذیت رسانی نہ ہو مگر مطلب سی میں منحصر نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیات "اصل و کلیہ" بتاتی ہیں۔ اس سے ہر وقت اور ہر حال میں حق زوجہ واضح ہوتا ہے۔ یعنی شوہر مکمل طور پر زندگی میں دو رویوں میں سے ایک کو پسند کرے۔ کوئی تیسرا طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔

بعض فقہاء اسی مقام پر بغزش سے دوچار ہوئے ہیں وہ سمجھ بیٹھے کہ ان آیتوں کا تعلق مردوں سے ہے کہ وہ طلاق رجعی میں رجوع کریں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ آیتیں تمام شوہروں کو بیویوں کے متعلق فرائض کی نشاندہی کرتی ہیں اس بات پر ہماری دلیل سیاق و سباق آیات کے علاوہ یہ ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے موضوع طلاق کے علاوہ بھی ان آیتوں کو استدلال میں پیش کیا ہے۔ مثلاً:



امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا :  
ایدا کرے والا۔ جو شوہر اپنی بیوی سے نزدیک نہ کرنے کی قسم کھائے۔ چار ماہ بعد  
جبراً قسم توڑے اور کفارہ دے یا بیوی کو طلاق دے۔ کیونکہ اللہ عز و جل اس سے فرمایا  
”امساك بمعروف او تسريح باحسان“

امام جعفر صادق علیہ السلام کے حضور میں مسئلہ عرض کیا گیا کہ فلاں آدمی نے  
ایک شخص کو اپنا وکیل بنا کر ایک عورت سے مہر طے کر کے نکاح پڑھنے کو کہا اس  
شخص نے یہ خدمت انجام دی لیکن مؤکل نے اپنی وکالت سے انکار کر دیا۔ امام نے  
فرمایا : ٹھیک ہے اس خاتون پر کوئی پابندی نہیں ہے وہ اپنے لیے دوسرا شوہر  
اختیار کرے۔ لیکن اگر اس شخص نے واقعاً وکیل بنایا تھا اور جو عقد ہو وہ وکالت  
کی بنیاد پر ہوا، تو اس شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے اور خدا کے درمیان معاملہ صاف  
کرے اور اس عورت کو طلاق دیدے۔ کیونکہ قرآن میں ہے : فامساك بمعرف  
او تسريح باحسان“ ان روایات سے معلوم ہوا کہ ائمہ طاہرین آیت مذکورہ  
کو ”اصل کلی“ سمجھتے تھے اور خاص مورد میں منحصر نہیں جاتے تھے۔

جب شوہر نہ فرائض ادا کرتے نہ طلاق دے تو حاکم شرع اسے طلب کرے اور  
پہلے تو اسے طلاق کا حکم دے اگر وہ طلاق جاری نہ کرے تو خود حاکم شرع طلاق جاری  
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بروایت ابوبصیر مروی ہے کہ امام نے  
فرمایا : جو شخص اپنی بیوی کو لباس و نفقہ نہ دے مسلمان کے امام پر واجب ہے  
کہ ان دونوں کو (طلاق کے ذریعے) الگ کر دے۔“

درجہ اول کے ایک ہم عصر فقیہ کے فرمودات کا یہ خلاصہ آپ نے ملاحظہ فرمایا  
مزید تفصیلات کے لیے موصوف کے درس کی تقریروں کا مجموعہ ”حقوق الزوجیہ“  
ملاحظہ کریں۔

آپ نے غور کیا۔ ”امساك بمعرف او تسريح باحسان“ ایک اصل اور قائمہ کوئی  
ہے جسے قرآن مجید نے ”حقوق زوجیت“ دائرہ مقرر کرنے کے لیے وضع کیا ہے۔ لہذا  
مذکورہ اصل نیز ”ولا تمسکوا عن ضرارائے عقدا“ کے اضافے سے کوئی حق باقی نہیں  
رہتا کہ خوف خدا نہ رکھنے والا شوہر اپنے عقد فائدہ اٹھائے۔ یعنی کسی خاتون کو صرف  
سمانے اور دوسری شادی سے روکنے کی خاطر طلاق دے بغیر معلق رکھے اور  
خود بھی اس سے رشتہ نہ رکھے۔

دوسرے دلائل و ثبوتات

رسالہ ”حقوق الزوجیہ“ میں بیان شدہ دلائل  
کے علاوہ اور بھی ثبوتات و دلائل سے تائید  
ہوتی ہے کہ :

امساك بمعرف او تسريح باحسان  
اسلام کے نزدیک ایک اصل کلی ہے، اسی کے دائرے میں حقوق زوجیت  
کی نگہداشت ہونا چاہیے۔ اس مفہوم آیت پر جس قدر غور کیا جائے اسی قدر  
مطلب روشن سے روشن تر اور دین مبین اسلام کے ضابطے مستحکم ہوتے نظر  
آئیں گے۔

الکافی، جلد ۵، صفحہ ۵۰۲ پر امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت ہے حضرت  
نے فرمایا :

اذا اراد الرجل ان تزوج المرأة فليقل :  
اقررت بالميثاق الذي اخذ الله : امساك

بمعرف او تسريح باحسان

جب کوئی آدمی شادی کرنا چاہے تو کہے : اللہ نے جو مجھ سے پیمانہ  
لیا ہے میں اس کی تجدید کرتا ہوں اور وہ ہے کہ بیوی مناسب طریقے

سے رکھوں گا یا نیکی کے ساتھ طلاق دیدوں گا۔

آیت ۲۱، سورۃ النساء میں ہے :

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُم إِلَىٰ بَعْضٍ وَ  
أَخَذْتُمْ مِمَّا فَرَغَ

اور تم بیویوں کو دیے ہوئے مہر (زور اور سختی کر کے) واپس کیوں  
لیتے ہو، حالانکہ ایک سے دوسرے کے پاس جا چکا اور دونوں ایک  
دوسرے سے کام بھی لے چکے، اور بیویوں نے تم سے تو سخت قول  
و قرار لے لیے ہیں۔

شیعہ اور سنی مفسرین کہتے ہیں ”پیمان استوار“ و قول و قرار سے مراد اس کا  
معمروف اور تسریح باحسان ہے یہی خدا کا پیمان ہے جو مردوں سے لیا گیا ہے۔  
یعنی وہ عہد جس کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے تاکید فرمائی کہ شادی  
کے وقت مرد کو اعتراف و اقرار کرنا چاہیے کہ بیوی کی مہذب انداز سے نگہداشت  
رکھے گا یا حسن و خوبی کے ساتھ چھوڑ دے گا۔

حج و داع کے موقع پر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ مشہور  
جملہ فرمایا جو شیعہ سنی دونوں نقل کرتے چلے آئے ہیں :

اتَّقُوا اللَّهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِمَا مَنَعَهُ اللَّهُ وَاسْتَحْلَلْتُمْ  
فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَاتِهِ اللَّهُ.....

عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کیونکہ تم نے ان کو بطور امانت  
الہی حاصل کیا ان کی عصمت کلمۃ اللہ کے ذریعے حلال کی....

ابن تیمیہ نے کتاب النہایہ میں لکھا ہے : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے  
فرمان کلمۃ اللہ جس سے عصمتِ خواتین، مردوں پر حلال قرار پاتی ہے، اسے مراد

وہ جملہ ہے جو قرآن مجید میں باین الفاظ موجود ہے ”امساك بمعروفٍ وتسريح بن  
ان خواتین کو دستور کے مطابق اچھی طرح رکھو یا بھلائی کر کے چھوڑ دو۔

شیخ الطائفہ کا نظریہ

۸۵ اپر لکھا ہے۔ جب ثابت ہو جائے کہ مرد،  
”غنین“ ہے تو بیوی کو فسخ کا اختیار ہے۔ فرماتے ہیں :

اس بات پر فقہاء کا اجماع ہے .... نیز اس آیت سے استدلال بھی

”امساك بمعروفٍ وتسريح باحسان“ غنین چونکہ بیوی کو  
اچھی طرح نہیں رکھ سکتا، لہذا اسے چھوڑ دینا چاہیے۔

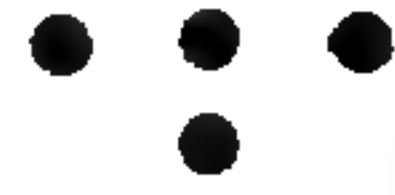
ان توضیحات سے بخوبی وقطعی واضح ہو گیا کہ اسلام ہرگز مرد کو زور و آوری کی  
اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے حق طلاق سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور بیوی کو قیدی  
بنا کر رکھے۔

جو کچھ کہا ہے اس سے یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو شخص اپنا نام قاضی رکھ لے  
اسے ان جیسے مسائل میں دخل دینے کا حق مل جائے گا۔ اسلام کے نزدیک قاضی  
کے شرائط بہت سخت اور وزنی ہیں جن پر گفتگو کی یہ جگہ نہیں ہے۔

ایک اور بات جس پر توجہ رکھنا ہوگی وہ ”عدالتی طلاق“ گھر کی مرکزیت پر  
اسلام کی خصوصی توجہ اور نگہداشت کے باوجود بڑی مستثنیٰ اور نادر و کمیاب بات  
ایسے آئیں گے جہاں قاضی طلاق دے۔ اسلام اس طلاق کا قائل نہیں جو امر کیہ اور  
یورپ میں ہوتی ہے اور وہ اس قسم کی طلاق جائز نہیں جانتا جس کی راستیاں  
ہم روزانہ اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ مثلاً ایک عورت نے اپنے شوہر کے بارے  
میں شکایت کردی اور طلاق مانگ لی۔ صرف اس لیے کہ جس فلم کو میں پسند کرتی  
ہوں شوہر پسند نہیں کرتا۔ یا ”فی فی“ صاحب میرے پیارے کتے کو چومتا نہیں



سی قسم کے مضحکہ انگیز قصے جو ان نیت کے زوال کا نمونہ ہیں۔



ماضیٰ محترم، گزشتہ چند مقالات میں جو کچھ عرض کیا ہے، اور اکیسویں مضمون میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ طلاق کے سلسلے میں پانچ نظریے ہیں:

① طلاق معمولی چیز ہے اس پر سے ہر قسم کی پابندیاں اٹھالی جائیں خواہ معاشرتی بندشیں ہوں یا اخلاقی۔

② ازدواج ایک بدی بندھن ہے اور طلاق بالکل ناممکن ہے۔ (کیتھولک چرچ کی رائے)

③ ازدواج مرد کی طرف سے قابلِ جدائی ہے عورت اس بندھن کو نہیں کھول سکتی۔

④ ازدواج شوہر کی طرف سے خاتمہ پاتا ہے اور خاص شرائط کے ساتھ بیوی بھی یہ بندھن کھول سکتی ہے۔ یہ راستہ میاں بیوی دونوں کے لیے ہے۔ دونوں اس معاملے میں یکساں و برابر ہیں۔ (دعوے داران مساوات حقوق کا نظریہ)

⑤ صدقہ راستہ جس مرد شوہر کے لئے کھد ہے بیوی کے لیے بھی بند نہیں ہے۔ لیکن میاں بیوی کیسے نکلتے دروازے لگتے ہیں

میں نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ اسلام پانچویں نظریے کا حامی ہے، پھر شرط ضمن عقد اور عدالتی طلاق کے ذیل میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اسلام کا نقطہ نظر بتا دیا کہ طلاق فطری حق کے طور پر بیوی کو حاصل نہیں ہے۔ اس باوجود اس کے لیے راستہ مکمل طور پر بند بھی نہیں ہے۔ خواتین کے لیے خصوصی دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

عدالتی طلاق کے بارے میں اس سے زیادہ بحث کی گنجائش ہے، خصوصاً

اسلامی فقہوں کے علما و فقہاء کے خیالات اور تمام اسلامی ملکوں میں عام مسائل کا رویہ سامنے رکھ کر بات ہو سکتی ہے۔ مگر ہم ان مقالات میں اسی قدر کافی سمجھتے ہیں۔

## گیارہواں حصہ :

### تعددِ ازواج

- — تاریخِ زندگی بشر میں بیویوں کی قسمیں -
- — اسلام نے جاہلیت کی تین چار قسم کی بیویاں ممنوع کر دیں۔
- — جنسی کیونٹرم، ایک بیوی کئی شوہر۔
- — چند شوہری نظام کیوں ناکام ہوا، اور چند ازواجی نظام رواجِ پاکِ پیا؟
- — عورت کے لیے مرد کے برخلاف خانگی زندگی، مادی پہلو سے زیادہ روحی و نفسیاتی پہلو رکھتی ہے۔
- — تعددِ ازواج، عورت کا حق ہے، مرد کے حقوق میں نہیں ہے۔
- — تعددِ ازواج کے تاریخی اسباب۔
- — کیا تعددِ ازواج مشرقی آب و ہوا کی پیداوار ہے؟
- — چند ازواجی ڈھانچہ مغرب میں اور چند ازواجی ڈھانچہ مشرق میں۔
- — مغرب میں عیاشی کی فراوانی نے تعددِ ازواج کو روکا، اس میں یس مسیحی کے ضوابط کا دخل نہیں ہے۔
- — تعددِ ازواج کے معاملے میں، مرد کبھی زور آوری دکھاتا ہے، کبھی قانونی جواز سے فائدہ اٹھاتا ہے، کبھی بیوی کا حق ادا کرتا ہے۔



- — چند ازواجی صورت حال میں بیوی کا حق۔
- — شماریات بولتے ہیں۔
- — ہمیشہ شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد، شادی کے قابل لڑکوں کی تعداد سے زیادہ رہتی ہے، کیوں؟
- — منشور حقوق انسانی نے انسان کے ایک بہت بڑے حق کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے۔
- — بہ قول "ہل مل و عقد انگلستان اگر "ہودی زن" ڈارمی مونچ ولا ہو تو کئی بیویاں رکھنے کی ممانعت نہیں ہے۔
- — کیا مرد کی فطرت کا تقاضہ تعداد ازواج ہے؟
- — کہتے ہیں۔ مرد، قانوناً ایک بیوی کا پابند ہے مگر عملی طور پر چند بیویاں رکھتا ہے۔
- — خراب معاشرے نے مرد کی خیانت کے اسباب پیدا کیے ہیں، اس کی فطرت نے نہیں۔
- — بیسویں صدی کے مرد، عورت کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں کم کرنے اور اپنی مقصد برآری میں کامیاب ہو گئے۔
- — بے شوہر خواتین جو بحران پیدا کرتی ہیں وہ ہر بحران سے زیادہ خطرناک ہے۔
- — "چند ازواجی" پر اعتراضات اور خرابیاں۔
- — اکثر مردوں کا عقیدہ: خدا ایک، بیوی ایک۔
- — عشق اور جذبات قابل تقسیم و درجہ بندی نہیں ہیں۔
- — کئی بیویاں، گھریلو زندگی کو مہر و محبت کے مرکز سے میدان جنگ

- — میں مستقل کر دیتی ہیں۔
- — مرد، اپنی عائلی زندگی کو ایک مرتبہ سچنے کے بعد دوبارہ کیسے فروخت کرتا ہے؟
- — کئی بیویوں کے مسئلے میں اسلام کا کردار۔
- — اسلام نے چند ازواجی کو محدود بھی کیا اور مشروط بھی کیا ہے۔
- — تعدد ازواج میں دولت اور صحت کی شرط۔
- — تعدد ازواج سے آج کے مرد کی نفرت کے اسباب۔
- — تعدد ازواج کی جگہ اس صدی میں "گناہ" نے پر کی ہے "وفا" نے نہیں۔

۱۔ خدمت معصوب :

## تعدد ازواج

گھریلو زندگی کی فطری شکل "ایک بیوی" سے بنتی ہے۔ ایک بیوی کے گھر میں اپنائیت کی روح، یعنی خصوصی و انفرادی مالکیت کا رواج ہوتا ہے۔ جو دولت کی خاص مالکیت سے جدا ہے۔ ایک بیوی کے گھر میں میاں، بیوی دونوں۔ جذبات و نفیات، توجہ اور جنسی قائلے "اپنے" اور اپنی ذات سے مخصوص سمجھے ہیں۔ ایک بیوی والے گھر کے مقابلے میں۔ چند ازواج۔ یا اشتراکی زوجیت کا نظام ہے۔ چند ازواجی یا اشتراکی زوجیت چند صورتوں میں فرض کی جاسکتی ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ فریقین میں کسی فریق کا دوسرے فریق سے خصوصی تعلق نہ ہو۔ نہ مرد، کسی خاص عورت وابستہ ہو، نہ عورت کسی معین مرد کی پابند ہو۔ یہی مفروضہ وہ ہے جسے "جنسی کیونزیم" کہا جاتا ہے۔ جنسی کیونزیم، گھریلو زندگی کی نفی کے مساوی ہے۔ تاریخ، بلکہ قبل از تاریخ کے تاریخی مفروضے بھی کسی ایسے دوسرے نشان دہی نہیں کرتے جس میں انسان یکسر خاندانی زندگی سے خالی رہے ہو۔ اور جنسی کیونزیم کا رواج ہو۔ جس مدت کو اس نام سے یاد کرتے اور دعویدار بنتے ہیں کہ کچھ وحشی مردوں میں یہ نظام تھا۔ ایک وسطی دور ممکن ہے۔ نہ ہو کہ جسے خاص گھریلو زندگی اور جنسی کیونزیم کی کڑی سمجھا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بعض قبائل میں، چند بھائی چند بہنوں سے مشترک طور پر شادی کر لیتے تھے، یا مردوں کا ایک گروہ، عورتوں کے ایک گروپ سے شرکت کے طور پر شادی رچاتے تھے۔

ویل ڈیورنٹ نے تاریخ تمدن کی پہلی جلد میں (صفحہ ۲۰ پر) لکھا ہے :

بعض علاقوں میں، گروپ کی صورت میں شادی ہوتی تھی۔ یعنی ایک قبیلے کے مردوں کا ایک گروہ، دوسرے خاندان کی لڑکیوں کے ایک گروہ سے شادی کر لیتے تھے۔ مثلاً تبت میں رسم تھی، چند بھائی، اپنی تعداد کے مطابق چند بہنوں سے رشتہ کر لیتے تھے اور کسی کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ کس لڑکی کو کس کی بیوی بننا ہے۔ رشتہ زن و شوہر کا یہ انداز ایک طرح کا جنسی کیونزیم ہے۔ اس مرحلے کو مرد جس عورت سے چاہتا ہم بستر ہو جاتا تھا۔ "سینر" نے اس سے ملتی جلتی رسم کا انگلستان میں تذکرہ کیا ہے۔ ان حادثات کے بچے کچھ نشانات میں ایک رسم بھی ہے کہ بھائی کے مرنے کے بعد بھاء و ج زندہ بھائی کی بیوی شمار ہونے لگتی تھی۔ یہود اور ان جیسی قدیم قوموں میں اس کا رواج زیادہ تھا۔

افلاطون کی کتاب "جمہوریت" سے مطلب نکلتا  
اور مورخ اس کی تائید کرتے ہیں۔ وہ اس

کا نظریہ خاص ہے۔ "فلسفی حاکم اور حاکم فلسفی" اس نے ایک طبقے کے لیے گھریلو اشتراکیت کی تجویز رکھی ہے۔ انیسویں صدی کے چند کیونسٹ رہنماؤں نے بھی یہی کہہ دیا۔ فرائڈ اور محرموں سے حرمت ازدواج "کے مصنف کے بقول ۱۹۳۸ء میں بے شمار تلخ تجربوں کے بعد کچھ طاقتور کیونسٹ ملکوں نے "ایک بیوی" کے نظام کو قانونی صورت دے دی۔

چند شوہری نظام :  
ازدواجی زندگی کے ضمن میں ایک مفروضہ چند شوہری ہے۔ یعنی ایک عورت ایک وقت میں ایک سے زیادہ شوہر رکھے۔ ویل ڈیورنٹ کے بقول "یہ رسم تھوڑا جیسے تبتی قبائل میں مشاہدے کے قابل ہے۔"

صحیح بخاری میں، حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ جاہلی عرب میں چار طرح کی



شد ویاں رنج تھیں۔

ایک قسم تو وہی ہے جو اب تک رائج ہے کہ مرد، لڑکی کے باپ سے خواستگاری کرتا ہے اور مہر کے بعد شادی ہو جاتی ہے۔ جو لڑکا پیدا ہوتا ہے وہ باپ کے معین ہونے کی وجہ سے روشن مستقبل رکھتا ہے۔

دوسری صورت یہ بھی کہ شوہر، زمانہ ازدواج کے اندر اپنی بیوی کے لیے کسی دوسرے مرد کو جوڑ کر لیتا تھا کہ وہ دونوں محدود عرصے تک ساتھ رہیں۔ اس سے وہ ایک اچھی نسل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یعنی وہ خود کچھ عرصے کے لیے بیوی سے الگ ہو جاتا اور بیوی کو سمجھا دیتا تھا کہ تم فلاں شخص کے ساتھ رہو، جب تک وہ عورت حاملہ نہ ہوتی اس وقت تک وہ شوہر الگ رہتا، جیسے ہی بیوی کا حاملہ ہونا معلوم ہوتا فوراً اس سے ربط پیدا کر لیتا تھا۔ یہ عمل اس شخص کے لیے ہوتا جسے شوہر تولید فرزند کے لیے اپنے سے بہتر سمجھتا تھا۔ دراصل یہ کام نسل کی بہبود اور خاندان کی اصلاح کے لیے انجام دیتا تھا۔ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے دوسرے شوہر کے ساتھ میاں بیوی جیسے روابط کا نام نہ نکاح استبضاع نہ تھا۔

تیسری صورت یہ بھی کہ دس آدمیوں سے کم ایک ٹولہ، ایک عورت سے ربط پیدا کرتے، جب اس کے یہاں بچہ ہوتا تو وہ اس ٹولہ کو بلاتی۔ اس عہد کے دستور کی بنا پر وہ مرد اسے انکار نہیں کر سکتے تھے، سب حاضر ہو جاتے۔ وہ عورت ان میں سے جس کو چاہتی نو موود اس کے نام کر دیتی اور وہی اس کا قانونی باپ قرار پاتا، پھر اس مرد کو ان کا رکن نہ رہتا تھا۔

چوتھی قسم۔ ایک عورت "طوائف" تسلیم کر لی جاتی تھی، بلا استثناء ہر مرد اس سے رابطہ پیدا کر سکتا تھا، ان عورتوں کے مکان پر ایک جھنڈی لگی ہوتی تھی یہی ان کی پہچان تھی۔ ایسی عورتوں کے یہاں جب بچہ پیدا ہوتا اس کے بعد وہ

اپنے یہاں آنے جانے والے مردوں کو جمع کرتیں، کاہن اور قیافہ شناس بتاتیں، وہ قیافہ اور علامات دیکھ کر اپنی رائے بتاتے تھے کہ اس بچے کو فلاں کی اولاد ہونا چاہیے۔ وہ مجبور ہو کر قیافہ شناس کا فیصلہ مانتا اور وہ اولاد قانونی و رسمی طور پر اس شخص کی اولاد قرار پاتی تھی۔

یہ جاہلیت کے ازدواجی اقام اس وقت تک رہے جب تک سول، اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث نہ ہوئے تھے، آنحضرتؐ نے چند اقوام کے سوا سب کو ختم کر دیا۔ معلوم ہوا کہ "چند شوہری" کی رسم جاہلیت عرب میں جاری تھی، "ان" کو "روح قوانین میں لکھتا ہے"۔

"ابو ظہیر حسن ایک عرب سیاح، نویں صدی عیسوی میں ہندوستان و چین گیا تو اس نے "چند شوہری" کی رسم دیکھی اور اسے عیاشی کا ثبوت قرار دیا۔ اسی نے لکھا ہے۔ "مالا بار کے ساحلوں پر "نائیر" نامی قبیلہ رہتا ہے۔ اس قبیلے میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں، حالانکہ عورتیں کئی شوہر رکھ سکتی ہیں۔ میرے نزدیک اس قانون بنانے کی وجہ یہ ہوگی کہ نائیر قبیلے کے مرد بڑے جنگجو ہوں گے، اور اپنی اصالت کی بنا پر جنگ ان کا پیشہ ہوگی، اور جیسے ہم یورپ میں فوجیوں کو شادی سے روکتے ہیں تاکہ تاحلی زندگی ان کی پیشہ ورانہ جنگی مصروفیت کو نہ روکے، مالا بار کے قبیلہ نائیر کو بھی گھریلو رشتوں سے آزاد رکھا گیا ہوگا، وہاں کی آب و ہوا میں گرمی ایسی تھی کہ انھیں شادی سے بالکل روکنا ممکن نہ تھا، لہذا یہ طے کیا گیا ہوگا کہ چند آدمی مل کر ایک عورت رکھ لیا کریں۔ اس طرح گھریلو رشتہ کمزور رہے گا اور پیشہ ورانہ کام میں رکاوٹ پیدا نہ ہوگی۔"

چند شوہری نظام کے مشکلات | چند شوہری نظام میں بنیادی جڑی مشکل یہ پیدا ہوگئی کہ نسب کا تعین ختم ہو گیا

یہی سب اس رسم کے بروئے کار آنے میں رکاوٹ بنا، شاید اس دستور کی ناکامی اسی بنا پر عمل میں آئی۔ اس قسم کی ناقصی زندگی میں باپ کا بیٹے سے رشتہ عملی طور پر معین نہ ہو سکتا تھا۔ جیسے جنسی کیونز میں باپ بیٹے کا رشتہ عملاً غیر معین ہے۔ اور جس طرح جنسی کیونز میں اپنا رشتہ نہ کھول سکا، یونہی چند شوہری رسم بھی حقیقی معاشرے میں قابل قبول نہ بن سکی۔ ہم نے گزشتہ سلسلہ مقالات میں لکھا ہے کہ آنے والی نسل کے لیے گھر کی زندگی اور آشیانے کی تعمیر ضروری ہے اس سے گزشتہ اور آئندہ نسل میں رشتہ استوار ہونا فطرت بشری کا ایک تہی تقاضہ ہے۔ یہ جو کبھی کبھی یا کہیں کہیں، کچھ انسانی گروہوں یا قبیلوں میں چند شوہری رسم ملتی ہے، وہ مرد کے جذبہ تشکیل خاندان کی خاصیت کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اسے فطرت مرد کا فطری تقاضہ مان لینا صحیح نہیں ہے۔ جیسے کچھ مردوں یا چند عورتوں کا، شادی سے پرہیز اور عائلی زندگی سے علیحدگی، فطرت سے انحراف تو ہے مگر اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اسے، انسان کی فطری خانگی خواہش زندگی کے خلاف دلیل بنا لیا جائے۔ چند شوہری رسم، مرد کی خواہش انفرادیت و انحصار طلبی و اولاد دوستی ہی کے خلاف نہیں، خود عورت کی فطرت سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ نفسیاتی مطالعات و تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت مرد سے زیادہ ایک رفیق حیات چاہتی ہے۔

**تعدد ازواج** | چند رفقاء زندگی کی ایک شکل "چند زنی" یا "تعدد ازواج" ہے۔ چند بیویوں یا تعدد ازواج کی رسم نے جنسی کیونز اور چند شوہری نظام سے زیادہ رواج حاصل کیا۔ یہ دستور فقط وحشی قبیلوں میں ہی نہ تھا، اسے تو تمدن قوموں نے بھی اپنایا، عرب جاہلیت، یہود، اور سامانی عہد میں ایرانی قوم بلکہ دوسری قوموں میں بھی یہ رسم و قانون موجود تھا۔ مان ٹسکو نے لکھا ہے۔ مالدیو قوم میں تین بیویاں رکھنے کی اجازت تھی۔ اسی مصنف کے

بقول۔ والنتینین (VALENTINIAN) شہنشاہ روم نے خاص حالات میں مردوں کو کئی بیویاں رکھنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن یورپ کی جغرافیائی آب و ہوا کی نامناسبیت تمام رومی بادشاہوں کو اس قانون پر آمادہ نہ کر سکی، اور تھیودوس۔ اریکڈیس۔ اور ہونوریس نے اس قانون کو ختم کر دیا۔

**اسلام اور تعدد ازواج** | اسلام نے چند شوہری کے برخلاف، چند زنی یعنی چند ازواجی نظام کو مکمل طور پر منسوخ و معطل نہیں کیا، البتہ اس میں حد بندی اور پابندی لگا دی، یعنی ایک سمت نامحدودیت کو ختم کیا دوسری طرف زیادہ سے زیادہ کی چار مقرر کر دی۔ پھر ضابطے اور شرطیں بڑھائیں نیز ہر شخص کو اجازت نہیں دی کہ متعدد بیویاں کرتا پھرے۔ آئندہ ہم گفتگو کریں گے کہ اسلام نے کیا شرائط و ضوابط بنائے اور کیوں تعدد ازواج کو ختم نہ کیا۔

حیرت ہے کہ گزشتہ صدیوں اسلام کے خلاف پروپیگنڈا ہم ملتی رہی کہ پیغمبر اسلام نے تعدد ازواج کی رسم ایجاد کی ہے۔ وہ لوگ دعوے کرتے پھرتے تھے۔ اسلام کی بنیاد تعدد ازواج ہے۔ اسلام دنیا کی مختلف قوموں میں اتنی جلدی پذیرائی کی وجہ کئی بیویاں رکھنے کی اجازت تھی۔ یہ بھی دعوے کرتے تھے کہ مشرق کے زوال کا باعث بھی تعدد ازواج ہے۔

تاریخ تمدن، جلد ۱، صفحہ ۶۱ پر ویل ڈیورانت نے لکھا ہے: "وسطی صدیوں میں مذہبی عالم یہ تصور کیے ہوئے تھے کہ تعدد ازواج پیغمبر اسلام کی ایجاد ہے۔ درآن حالیکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ ابتدائی معاشروں میں ہم اس رفیق زندگی کے بارے ہی رویہ موجود تھا۔ ایسے اسباب و عمل بہت ہیں کہ اس دور میں بیویوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ جیسے مرد جنگ و شکار میں مصروف



رہتے تھے لہذا ان کی زندگی خطرے میں ہوتی اور مردوں کی موت عورتوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ نتیجہ میں عورتوں کی تعداد میں اضافے کا عمل ایک تو تعداد ازدواج تھا یا پھر بہت سی عورتوں کو بے شوہر و وارث رہنے دیا جائے۔ لیکن جن قوموں میں موت کی فراوانی ہو وہاں کوئی مناسب بات نہ تھی کہ عورتوں کی ایک نمایاں تعداد بلا شوہر رہے اور توبہ بدل کا عمل نہ ہو۔ . . . . بلاشبہ ابتدائی دور میں تعداد ازدواج ایک مناسب دستور تھا، کیونکہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی، پھر نسل کی بہبود کے لیے بھی نظام تعداد ازدواج آج کے نظام یک زن سے زیادہ مفید تھی۔ سب جانتے ہیں کہ مضبوط و توانا طاقت ور اور محتاط مرد آج کی دنیا میں مدت بعد تک کرتے ہیں، اس کے برخلاف گذشتہ زمانے میں طاقت ور افراد بظاہر اچھی عورتیں آسانی سے حاصل کر لیتے اور زیادہ بچے پیدا کرتے تھے۔ اسی بنا پر شروع میں متعدد قبائل بلکہ متمدن قومیں تعداد ازدواج کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ اور ابھی کچھ دنوں سے ہمارے زمانے میں یہ رسم ہمارے مشرق سے کم ہوتی چلی گئی ہے۔ دراصل اس کے زوال میں متعدد عوامل کارفرما ہیں:

کاشتکاری کی فراوانی، اس نظام نے مردوں کی بھاری اور خطرناک زندگی کو نسبتاً پرسکون و پراندار بنا دیا ہے۔ عورتوں کی تعداد بھی کم و بیش مردوں کے برابر آگئی ہے۔ ان حالات میں "چند زنی" کی بات یا تو ابتدائی معاشرے کی بات قرار پاگئی ہے یا پھر مٹھی بھر دولت مند افراد کے خصوصیات میں شمار ہونے لگی ہے۔ اور "زنا" کا مشغلہ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ہے۔ تاریخ تمدن، صفحہ ۵۰۷ پر گوستاو لوین نے لکھا ہے:

"یورپ میں مشرقی رسم و رواج میں تعداد ازدواج سے زیادہ برے پیرائے میں اور کسی چیز کا تعارف نہیں کرایا گیا ہے۔ اہل مغرب کا نقطہ نظر کسی رسم کے بارے

میں اس قدر غلط نہیں جتنا اس مسئلے میں غلط ہے، یورپی مصنف تعداد ازدواج کو اسلام کی بنیاد جانتے اور اسلام کی تردید، نیز مشرقی اقوام کے زوال و انحطاط کا اہم ترین سبب مانتے رہے ہیں۔ اعتراضات کی بوچھاڑ کے ساتھ، یہاں کی خواتین سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا۔ بد نصیب عورتیں سخت اور اکٹھے خواہم سراؤں کے ہاتھ گھروں کی چار دیواریوں میں ایس رہتی ہیں، اگر کوئی بات گھر کے ان رکھوالوں کی مرضی کے خلاف ہو جاتی ہے تو جوں کے توڑے پڑ جاتے، اور ممکن ہوتا ہے کہ بڑی بے رحمی سے قتل کر دی جائیں۔ مگر یہ ایسے تصور ہیں جن کا کوئی ثبوت یا بنیاد نہیں۔ ہماری کتاب کے مغربی قاری اگر تھوڑی دیر کے لیے تعصب کو دور کر سکیں تو انھیں شاید کرنا پڑے گی اور مشرقی تمدن کی خوبی تسلیم کریں گے کہ اس میں کئی بیویاں رکھنے کی اجازت ہے، جن گھرانوں میں یہ رسم موجود ہے ان میں اخلاقی روح ترقی پذیر ہے۔ اور عائلی رشتے مستحکم ہیں، اسی رسم کے نتیجے میں عورت کا اعزاز و اکرام مغرب سے زیادہ ہے، ہم اس دعویٰ پر دلیل لکھنے سے پہلے یہ بتادیں کہ تعداد ازدواج کا تعلق ہرگز اسلام ہی سے نہیں، اسلام سے پہلے بھی یہ رسم مشرقی اقوام میں پائی جاتی تھی۔ یہود، ایرانی، عرب وغیرہ جو قومیں اسلام لائیں انھوں نے اس بارے میں کوئی نیا فائدہ نہیں اٹھایا، آج تک دنیا میں کوئی مذہب ایسا با اقتدار و جو پذیر نہیں ہوا جو تعداد ازدواج جیسے رسوم کو ایجاد یا منسوخ کر سکے۔ مذکورہ رسم مشرقی آب و ہوا کا نتیجہ ہے، اس کی وجہ سے کچھ نسلی خصوصیات نیز دوسرے اسباب و عمل جنم لیتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا تعلق مشرق کی زندگی اور اس کے رویوں سے ہے، نہ یہ کہ مذہب یہ رسم لایا۔ ادھر یورپ کی آب و ہوا اس رسم کے لیے سازگار نہیں اور وہاں اس کے تقاضے موجود نہیں ہیں اس کے باوجود ایک بیوی و ہاں کی رسم سے قانونی کتابوں میں تو پڑھتے ہیں ورنہ مجھے تو ہوا ورنہ نہیں کہ ہمارے معاشرے میں کوئی یہ کہہ سکے کہ "یک بیوی" کا کوئی اثر ہو۔

صحیح مجھے حیرت ہے مجھے نہیں معلوم کہ مشرق کی متعدد جائز بیویوں کے مقابلے میں یورپ کی مکار نہ بہت سی بیویوں میں کیا کمی ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ پہلا نظام دوسرے نظام سے بدرجہ بہتر و شائستہ ہے۔ ان مشرق جب بڑے شہروں کی سیاحت کو آتے ہیں اور ہمارے اعتراضات یا حملوں سے دوچار ہوتے ہیں تو انہیں حیرت ہوتی اور غصہ آتا ہے۔۔۔۔۔

ہاں، اسلام نے تعدد ازواج کا نظام ایجاد نہیں کیا، مگر اسے ایک سمت سے محدود کر کے اکثریت کی تعداد ضرور مقرر کی۔ دوسری سمت، بھاری شرطیں لگا دیں۔ جو قومیں مسلمان ہوئیں، ان کے یہاں عموماً یہ رسم تھیں، اسلام کے ذریعے وہ حدود و قیود کا گردن بند پہننے پر ضرور مجبور ہوئی ہیں۔

ایران میں تعدد ازواج | کریستن سن کے "ایران ساسانیوں کے عہد میں" صفحہ ۳۴۶ پر لکھا ہے۔

"ساسانیوں کے زمانے میں ایران کے اندر متعدد بیویوں ہی سے خاندانہ یا پاتا تھا، مرد کی استطاعت کے لحاظ سے عورتوں کو رکھنے کا حق تھا۔ بظاہر غریب لوگ ایک ہی بیوی کرتے تھے۔ خاندان کا سربراہ، کنے کی سربراہی سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ بیوی میں محترم و محبوب خاتون تمام حقوق کی مالک ہوتی اور اس کو "زن پادشاہیہا" (بادشاہ زن) یا "زن ممتاز" کہتے تھے۔ اس کے کم درجہ عورت، خدمت گار "زن چکارچھا" کہلاتی، ان دونوں درجے کی بیویوں کے حقوق جدا جدا تھے۔ بظاہر زرخیز اور قیدی عورتیں نوکر بیویاں سمجھی جاتی تھیں۔ ممتاز بیویوں کے بارے میں یہ نہیں معلوم کہ ایک مرد کے یہاں محدود تھیں یا نہیں؟ لیکن متعدد قانونی حوالوں میں ایک شوہر کی دو ممتاز بیویوں کا اشارہ تو ملتا ہے۔ اس درجے کی بیویاں خانہ دار معلوم ہوتی ہیں، گویا ان کے الگ الگ گھروں

تھے۔ شوہر زندگی بھر زن ممتاز کو آذوقہ دینے کا پابند تھا۔ اور اس کی دیکھ بھال کرتا، لڑکا، بالغ ہونے اور لڑکی شادی ہونے تک یہی حق رکھتی تھی۔ چاکر زن قسم کی بیویوں کی ولادہ ذکور باپ کے خاندان میں قبول کی جاتی تھی۔

"تاریخ تمدن ایران از انقراض ساسانیان تا انقراض امویاں" میں سعید نفیسی نے لکھا ہے:

"مرد لا محدود بیویاں رکھ سکتا تھا، بعض یونانی دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے گھر میں سو بیویاں بھی ہوتی تھیں۔"

مان ٹسکونے "روح القوائین" میں "اکوٹیس" رومی مورخ سے نقل کیا ہے جسٹین، کچھ رومی فلسفی، مسیحوں کے ہاتھوں اذیت و تکالیف کا نشانہ بنے، یہ لوگ عیسائی مذہب قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ آخر ان لوگوں نے روم کو چھوڑ دیا اور خسرو پرویز بادشاہ کے دربار میں پناہ گیر ہوئے۔ یہاں پہنچ کر جس بات نے انہیں حیرت سے دوچار کیا، وہ یہی نہیں کہ تعدد ازواج کی رسم پائی جاتی تھی۔ انھوں نے دوسروں کی بیویوں سے اختلاط بھی دیکھا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ رومی فلاسفہ نو شیرون بادشاہ ایران کے دربار میں حاضر ہوئے تھے، خسرو پرویز کے یہاں نہیں، مان ٹسکو کے یہاں خسرو پرویز کا نام غلط فہمی پر مبنی ہے۔

عربوں میں بیویوں کی تعداد کا حساب و شمار ہی نہ تھا، اسلام کا اس پر بند باندھنا اور زیادہ سے زیادہ کی تعداد معین کرنا، ان عربوں کے لیے مشکل بن گئی جن کی بیویاں چار سے زیادہ تھیں، کچھ ایسے وگ بھی تھے جن کی دس بیویاں تھیں وہ چھ بیویوں کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

معلوم ہوا کہ اسلام نے تعدد ازواج کی رسم ایجاد نہیں کی، اس کے برعکس رسم



پر مرد و بندش عائد کی، اور یکسر ختم بھی نہیں کیا۔ آئندہ گفتگو میں ہم دیکھیں گے کہ تعدد ازواج کی وجہ افراد کی وجہ افراد بشر میں کیا ہے؟ کیا اس کی علت وجہ، مرد کی زور آوری اور عورت پر حکومت کرنے کا جذبہ سے، یا خاص ضرورتیں تھیں جن کی وجہ سے یہ عمل ضروری ہوا؟ وہ ضرورتیں کیا تھیں؟ کیا ان کا تعلق جغرافیائی حالات سے ہے یا انسانی اور صرح کے تقاضے تھے؟ اسلام نے اس رسم کو بالکل ختم کیوں نہ کیا؟ اسلام نے تعدد ازواج پر کیا بندشیں لگائی ہیں؟ آخر، آج مرد و زن دونوں تعدد ازواج کے خلاف کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں؟ اس کے پس منظر میں انسانی و اخلاقی بنیاد ہے یا دوسرے اسباب و علل کا رفرما ہیں؟ یہ مطالب ہیں جن پر ہم گفتگو کریں گے۔

## تعدد ازواج کے تاریخی اسباب

①

تعدد ازواج کے تاریخی اور سماجی علل و اسباب کیا ہیں؟ اس رسم کو بہت سی قوموں نے قبول کیا خصوصاً مشرقی اقوام و مسل نے اور کچھ قوموں نے اسے قبول نہیں کیا خصوصاً مغربی اقوام و مل نے اس کی وجہ کیا ہے؟ تین قسم کے جنسی روابط ہیں۔ چند ازواجی صورت نے کیوں رواج و قبولیت حاصل کی، اور چند شوہری اور جنسی اشتراکیت کے نف م یا تو نافذ و رائج ہی نہ ہو سکے یا اکادہ وقوع پذیر ہوئے ایسا کیوں ہے؟

جب تک ان اسباب و علل کی چھان بین نہ ہو، ہم اسلام کے نظریہ تعدد ازواج پر بحث نہیں کر سکتے اور آج کے انسان کی ضرورت کے بارے میں گفتگو ممکن ہے۔ اگر ہم ان لاتعداد مطالعات کو نظر انداز کر دیں، جو نفسیاتی اور معاشرتی سے میں کیے گئے ہیں اور بہت سے مضیفین کی طرح سطحی طور پر سوچنا کافی سمجھیں تو سماجی اور تاریخی عوامل و اسباب تعدد ازواج پر وہی مشہور "ترتیب بند" دھڑکنا ہوگا جو اس قسم کے مسائل میں ہمیشہ دھرایا جاتا ہے۔ کہ

تعدد ازواج کی علت بہت واضح و روشن ہے۔ اس کی علت وجہ مرد کی زور آوری اور تسلط طلبی اور عورت کی کمزوری اس کا سبب ہے۔ اس رسم کی علت پیدائشی ہے چونکہ مرد، عورت پر بالادستی اور حکمرانی رکھتا ہے اس لئے اپنے فائدے کے

بہم ورنہ ڈھنسا اور بنا مارتا ہے۔ "چند زنی" کی رسم بھی اس نے نفع اور عورت کے نقصان کے لیے صدیوں سے بنا رکھی ہے۔ عورت چونکہ مرد کی حکومتی لہذا وہ "چند شوہری" کی رسم اپنے نفع کی خاطر جاری نہ کر سکی۔ اب مرد کی طاقت آزمانی کا دور ختم ہو گیا ہے لہذا "چند زنی" کا صرف امتیاز عین لیا جائے گا اور اس غلط امتیازی رویے کی جگہ زن و مرد کو برابر کے حقوق دیے جائیں گے۔

اگر ہم یوں سوچیں کہیں تو بڑی سطحی اور گھٹیا بات ہوگی۔ "چند زنی" رسم کے رولنچ پانے کا سبب نہ تو مرد کی زور آوری ہے نہ "چند شوہری" نظام کی ناکامی کی وجہ عورت کی محکومیت و کمزوری۔ نہ حقیقت ہے کہ آجکل مرد کی زور آوری کا دور ختم ہو گیا ہے لہذا "تعدد ازواج" کا دستور منسوخ ہو رہا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ "ترک تعدد ازواج" سے مرد نے واقعا اپنا امتیاز ضائع کر دیا ہے۔ بلکہ واقعا مرد نے عورت کے خلاف آج ایک امتیاز مزید حاصل کر لیا ہے۔

میں زور و قدرت "کوٹا" سے بڑھنے والے عامل تسلیم نہیں کرتا۔ میں اس نظریہ کا منکر بھی نہیں کہ مرد نے اپنی قوت کے سہارے عورت سے غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر میرا یہ عقیدہ ضرور ہے کہ طاقت و اقتدار کو ایک عامل سمجھنا، خصوصاً گھریلو زندگی اور میاں بیوی کے رشتوں اور رویوں میں کوتاہ نظری ہے۔

اگر مذکورہ بالا نظریہ صحیح ہے تو لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ جب اور جہاں "چند شوہری" کی رسم عملی تھی۔ جیسے جاہلی عرب اور بقول مان لکھو، ملائیکہ ساحلوں میں نائیر قبیلہ۔ وہاں ایک دور ایسا تھا، جب عورت کو موقع ملا، اور اس نے مرد کے خلاف اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے "چند شوہری" نظام مردوں پر مسلط کر دیا، وہ دور خواتین کا "مطلانی دور" ہے۔ حالانکہ جاہلیت عرب

دور سب کے نزدیک عورت کی زندگی کا تاریک ترین عہد تھا۔ ہم نے گزشتہ صفحے میں مان لکھو کا مطالعہ نقل کیا، جس میں اس کے بقول "چند شوہری" کی رسم نائیر قبیلے میں رائج ہونے کا سبب عورت کی عزت و قوت نہیں بتائی گئی بلکہ اس رسم کے رائج کرنے کی علت یہ بھی لکھی ہے کہ وہاں کے لوگ غریبوں کو گھریلو زندگی کے بند سے آزاد رکھ کر ان کے فوجی جذبہ و کردار کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر تعدد ازواج کی وجہ "پدر شاہی" اور "پدر سالاری" ہے تو اس کا رواج مغربی اقوام میں کیوں نہ ہوا؟ کیا "پدر شاہی" نظام سرزمین مشرقی سے مخصوص تھا، مغربی باشندے اس وقت بھی "عیسی مزاج" و "مریم سرشت" تھے۔ وہ لوگ شروع ہی سے عورت کے لیے مرد کے مقابل اور مساوی حقوق جلتے مانتے تھے؟ کیا فقط سرزمین مشرقی ہی میں مرد کی قوت کا سبب مرد کے نفع کا نظام کرتا رہا؟ اور مغرب میں اس عامل و سبب کا رویہ عداوت و منفقانہ رہا ہے؟

مغربی عورت نصف صدی پہلے تک بد نصیب ترین خواتین عالم تھی۔ وہ اپنی ذاتی املاک و دولت میں بھی مرد کی سربراہی (قیومیت) کی محنت اٹھتی۔ خود اہل مغرب کے بقول قرون سنی میں مشرقی عورت کی حالت غریبی عورت سے بہت اچھی تھی۔ گوستاو لونگ نے لکھا ہے: اسلامی تمدن کے دور میں خواتین کو جینے و بی درجہ و مقام حاصل تھا جو مدت مدید کے بعد یورپی خواتین کو حاصل ہوا یعنی عربوں کے اس دلیرانہ کردار کے بعد جس نے یورپ میں ان کے خلاف پروپیگنڈے کی بنیاد رکھی..... بہادرانہ اخلاق جس کا ایک جزیرہ خواتین سے حسن سلوک ہے۔ اہل یورپ میں مسلمانوں کے ذریعہ پہنچے۔ مغربی باشندوں نے مسلمانوں کی تقلید کی۔ جو مذہب، عورت کو پست درجے اور



مقامِ مذمت سے اوج، عزت و سر بلندی تک لاسکتا وہ اسذم ہے، عیبِ نیت نہیں ہے۔ جیسے عام لوگ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ، قرونِ وسطیٰ میں ہمارے لیڈر اور بڑے رہنما عیسائی تھے اس کے باوجود احترامِ خواتین کا خیال نہ رکھتے تھے۔ قدیم تاریخ کی چھائی بی بی سے اس بارے میں شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ ہمارے بزرگوں کو مسلمانوں کی تعلیم احترامِ خواتین سے پہلے ہمارے مراد سردار عورت سے انتہائی وحشیانہ سلوک کرتے تھے۔ دوسرے سفینے تھے بھی کہ ہمیشہ اس دور کے مغربی حالات کی ایسی ہی تشریح کی ہے۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے جب قرونِ وسطیٰ میں پیدائشی "وقوت و زبردستی حکومت کا عروج تھا، تعددِ زوج کی رسم پھر رائج کیوں نہ ہوئی؟

حقیقت یہ ہے کہ جہاں چند شوہری نظام موجود تھا، وہاں عورت کو مہلتِ اقتدار، اور جہاں نظامِ چند شوہری نہیں سکوا وہاں سب اسی خواتین کی کمزوری نہیں تھا۔ مشرق میں تعددِ ازاواج، مرد کی بالادستی و حکومت یا مغرب میں تعددِ ازاواج کا نہ پایا جانا، مرد و زن کی مساوات نتیجہ نہیں ہے۔

**چند شوہری نظام کی ناکامی کی ذمہ داری** چند شوہری رسم کی شکست کا سبب یہ ہے کہ یہ رسم دستورِ مرد کی فطرت کے مطابق ہے نہ عورت کی طبیعت سے ہم آہنگ۔ پہلی بات کہ فطرتِ مرد کے خلاف ہے، مطلب یہ ہے کہ مرد انحصارِ طلب اور بیوی کو فقہ اپنا دیکھنا چاہتا ہے، چند شوہری اس تقاضے سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسمِ چند شوہری اطمینانِ پدیری پرستہ فرزند کی بنیاد کے خلاف ہے۔ انسان کا طبعی و فطری تعلق اولاد سے بہت گہرا ہے۔ انسان فطرتاً تو والد و نسل چاہتا ہے۔ اس کی خواہش یہ ہے کہ نسل آئندہ اور نسل گزشتہ سے یک سلسلہ معین و اطمینان بخش ہو۔

وہ جاننا چاہتا ہے کہ کس بیٹے کا باپ اور کس باپ کا فرزند ہے۔ چند شوہری عورت آدمی کے اس فطری مطالبہ سے جوڑ نہیں کھاتی تھی۔ بخلاف "چند زنی" نظام کے، اس رسم میں مرد کو چوٹ لگتی تھی نہ عورت ....

کہتے ہیں، تقریباً چالیس خواتین کا وفد حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، اور پوچھنے لگا کہ اسلام نے مردوں کو کئی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت کیوں دی، اور خواتین کو چند شوہر کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی؟ کیا یہ درجہ بندی کی بات نہیں ہے؟ حضرت علی علیہ السلام نے کچھ چھوٹے پانی بھرے برتن طلب کئے اور وہ برتن ان خواتین کو دئے۔ پھر حکم دیا کہ ہر ایک اپنے ہاتھ کے برتن کا پانی سامنے رکھے ہوئے بڑے برتن میں اندیل دے، اسے تعمیل حکم کی، اس کے بعد فرمایا کہ اب ہر ایک اپنے ہاتھ کے اندیلے ہوئے اصل پانی کو دوسرے برتن میں لکاو۔ سب نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پانی ایک دوسرے میں مل چکا اے شخص و معین کرنا ناممکن ہے۔ حضرت نے فرمایا: اگر ایک عورت کئی شوہر کرے تو ہر ایک سے ہم بستری ہوگی جب محل ہوگا تو وہ کیسے شخص و معین کرے گی کہ کچھ کس شوہر کی نسل سے ہے۔ یہ بات ہوئی مرد کے زاویے سے۔

عورت کے زاویے سے دیکھیے۔ چند شوہری رسم، فطرتِ زن اور اس کے منافع کے خلاف ہے۔ بیوی اپنے شوہر سے فقہ جنسی آسودگی ہی نہیں چاہتی، جو یہ کہ جائے کہ جتنے زیادہ شوہر ہوں گے اتنا ہی اچھا ہے۔ بیوی ایک ایسا وجود چاہتی ہے جس کے دل کو اپنائے اسے اپنا حامی و محافظ بنائے جو اسے ہر ناپسند بات بچائے اور وہ خود اس پر جان نثار کرے، محنت کرے اور اس سے دولت حاصل کرے، حاصل محنت و مشقت اس پر قربان کرے، غمخوار و ہمدرد ہو۔ ایک طوائف کو مرد جو پیسہ دیتا ہے یا وہ پیسہ جو عورت، محنت، مزدوری کر کے حاصل کرتی ہے، وہ عورت کے وسیع

اخراجات و ضروریات کے لیے ناکافی تھے۔ اس کے اخراجات ایک مردے کی گنا زندگی جوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس آمدنی کا مقابلہ اس دولت سے کہاں، جو دولت ایک مرد بیوی کے غش و محبت کی بنیاد پر پیش کرتا ہے۔ شوہر جو مال و دولت اپنی بیوی کے ضروریات کے لیے خرچ کرتا ہے وہ ایک فداکار کے انداز میں صرف کرتا ہے۔ گھریلو زندگی کی مرکزیت اور رفیق حیات و اولاد کی محبت و کشش، شوہر کو شوق دلاتی ہے کہ وہ اس سسے میں کار کردگی و فداکاری کو باقی رکھے۔

ایک عورت، اپنی شوہر سے ہوتے ہوئے، ایک مرد جیسی حمایت و محبت و مخلصانہ جذبات و فداکاری حاصل کر سکے، اسی لیے چند شوہری "سستم کو طوائف پیشگی کی طرح قابل نفرت سمجھا گیا ہے۔ لہذا "چند شوہری" رسم نہ مرد کے رجحانات کے مطابق ہے نہ عورت کے جذبات و رجحانات سے ہم آہنگ ہے۔

جنسی اشتراکیت کی شکست

بہنی اشتراکیت کی ناکامی کی علت بھی یہی ہے جنسی اشتراکیت میں اختصاص ختم ہو جاتا ہے نہ عورت کسی میں مرد سے اختصاص رکھتی ہے نہ مرد کسی معین عورت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ہم اٹارہ کر چکے ہیں کہ یہی تجویز افلاطون نے پیش کی تھی، یہ بات ضرور ہے کہ اس نے طبقہ حاکم کی سطح پر اسے سوچا تھا۔ یعنی یہ دستور اس کی زبان و اصطلاح میں فلسفی حاکم اور حاکم فلسفیوں کے لیے ہونا چاہیے۔ افلاطون کی یہ تجویز نہ دوسروں کے نزدیک منظوری کے لائق تھی نہ خود افلاطون اس نظریہ پر باقی رہا، اس نے بھی اسے بدل لی۔

ایک صدی قبل فارڈ ریک انجلس، کمیونزم کے دوسرے باپ نے بھی یہی تجویز رکھی اور اس کے خلاف نظریوں اور دیلوں کو رد کیا، لیکن کمیونسٹ بلاک نے اسے منظور کیا۔ کہتے ہیں کہ شوروی حکومت (روس) نے بے شمار تلخ تجربوں کے بعد عائلی اشتراکی تھیوری جو انجلس نے بتائی تھی اسے ۱۹۲۸ء میں بدل دیا، اور کچھ قوانین

گھریلو زندگی کی فلاح و بہبود کے واسطے وضع کر کے ایک شوہر ایک بیوی کا قانون کمیونسٹ حکومت کا رسمی قانون مان لیا۔

ایک شوہر کے لئے کئی بیویاں امتیازی بات مانی جا سکتی ہے، لیکن ایک بیوی کے واسطے چند شوہر کوئی عزیز نہ پہلے مانا گیا نہ آئندہ مانا جائے گا۔ اس فرق کا باعث یہی ہے کہ مرد عورت کی ذات چاہتا ہے اور عورت، مرد کا دل اور اس کی فداکاری کے طلب گار ہے۔ مرد جب تک بیوی کی ذات پر اختیار رکھتا ہے اس وقت اس سے اس کا دل دے دینے سے کوئی دلچسپی نہیں، لہذا، ایک سے زیادہ بیویاں اگر اسے اپنا دل نہیں تو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے مقابلے میں بیوی، شوہر کے دل اور توجہات کو حاصل سمجھتی ہے۔ اگر وہ ہاتھ سے دے دیتی ہے تو سب کچھ ضائع کر دیتی ہے۔

دوسری لفظوں میں — ازدواجی زندگی میں دو عنصروں کا دخل ہوتا ہے۔ ایک مادی دوسرا روحانی — مادی عنصر ازدواج جنسی پہنچنے ہوتا ہے جو انی میں یہ پہلو جوش و غروج پر ہوتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کم ہو کر ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ روحانی عنصر (معنوی نفسیاتی حصہ) میں وہ نرم و لطیف جذبات اور خلوص و محبت کی حکمرانی ہوتی ہے جو کبھی تو وقت گزرنے کے ساتھ بڑی مضبوط ہو جاتی ہے۔ عورت و مرد کے درمیان جو فرق ہیں، ان میں سے ایک فرق یہی ہے کہ عورت کی نفس میں دوسرا عنصر زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور مرد کے خیال میں پہلا عنصر، ورنہ کم زخم مرد کی نفس میں مادی و روحانی دونوں پہلو مساوی تو بہر حال ہوتے ہیں۔

ہم نے چوبیسویں مقالے میں اس موضوع پر گفتگو کے دوران ایک مغربی ماہر نفسیات قانون کو سن دیا تھا کہ عورت چونکہ شکم و غوش میں بچے کی پرورش کرتی ہے اس کے نفسیاتی حالات ہی کچھ اور ہوتے ہیں، وہ اپنے شوہر سے اس کی محبت اور خصوصی توجہ کی بے حد آرزو رکھتی ہے، اسی محبت و توجہ جو اس کے شوہریت کے احساس کے ساتھ



س کے زیر تربیت بچے کے باپ کی حیثیت بھی لیے ہوئے ہو۔ یہاں تک کہ ماں کی ماتا کو پتا، باپ کی محبت فرزند کے پلے سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ باپ کی محبت میں یہ حس ہوتا ہے کہ وہ بچے کے وجود میں آنے کا ایک عامل ہے۔ عورت کی یہ خاص نیاز زندگی اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب شوہر ایک ہو۔

بنابرین "چند شوہری کا مقابلہ" چند ازواجی سے بہت بڑی غلطی ہے، پھر ان میں فرق کا زمانہ، با دنیا کے یکساں بڑے حصے میں "چند ازواجی" نظام کے رواج پانے کی علت مرد کی نوآوری قرار دینا، اور یہ کہ عورت اپنی کمزوری اور بے اختیاری کی وجہ سے "چند شوہری" سسٹم جاری نہ کر سکی سراسر غلط ہے۔

کتاب "انتقاد بر قوانین اساسی و مدنی ایران" کے صفحہ ۳۴ پر خانم منوچہریان کہتی ہیں:

"قانون مدنی کی دفعہ ۴۹ میں ہے۔ "بیوی کی اجازت کے بغیر کوئی شخص، بھائی کی لڑکی، یا سالی کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا.... اگر بیوی اجازت دے دے تو اس کا شوہر بھائی کی یا سالی کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر بیوی اجازت نہ دے تو کیا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہی جوشل ہے "آنکہ عوض دارد گلہ ندارد مرد کسی اور سے نکاح کر لے گا۔ اچھا۔ اب مسئلہ کو الٹ کر دیکھیں پھر کیا ہو گا؟ مثلاً، یہ کہیں۔ بیوی اپنے شوہر کے بھائی کے لڑکے یا بہن کے لڑکے سے شوہر کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتی۔ جب تک وہ اس شخص کی بیوی ہے۔ یہ بات سن کر خدائی رنگ پھڑکتی، خون جوش مارتا اور آدمی چپخنے لگتا ہے، یہ تجویز خلاف انسانیت ہے۔ عورت و فطرت و مزاج کے خلاف ہے۔ جواب میں دینا چاہئے، کہ یہ تجویز دراصل اصل

کینیزی زوجہ کے خلاف ہے۔ جیسے ایک ماں کا ایک مالک ہوتا ہے اور اگر متعدد مالک ہوں بھی نفع اور محصول ایک ہی حاصل کرتا ہے، قانون مملکت کے واضح اور ضمنی مطالب کی بنا پر بیوی بھی اموال کے ذیل میں آتی ہے، لہذا اسے بھی ایک سے زیادہ مالک نہ رکھنا چاہئے۔

.....

اسی کتاب کے صفحہ ۷۳ پر لکھا ہے:

"ہم یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ جیسے مرد کو چار بیویوں کے رکھنے کا حق ہے، عورت بھی انسان ہے وہ بھی مرد کے برابر ہے۔ اسے بھی مرد جیسے حقوق کا مالک ہونا چاہئے۔ اس صغریٰ، کبریٰ کا نتیجہ مردوں کے لیے بڑا اثر ہے۔ اسی وجہ سے ان کی رگوں میں خون کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، چہرے بھڑک اٹھتے ہیں، آنکھیں آگ برسانے لگتی ہیں، گٹھے پھاڑ پھاڑ کر کھینچتے ہیں۔ عورت ایک شوہر سے زیادہ مرد کیوں چاہتی ہے؟ ہم اس کے جواب میں نرمی و سرد مہری سے کہتے ہیں۔ مرد ایک سے زیادہ بیویاں کیوں کرتا ہے؟ ہم فساد اخلاق کا پروپیگنڈا نہیں چاہتے۔ ہم خواتین کی عفت و آبرو کو حقیر نہیں جانتے۔ البتہ۔ مردوں کو یہ ضرور سمجھانا چاہئے ہیں کہ انہوں نے عورت کے بارے میں جو خیالات و نظریات قائم کر لیے ہیں وہ غیر مستحکم بنیاد پر قائم ہیں۔ مرد بھی کافی ہے، عورت بھی کافی ہے۔ اس لیے زن و مرد برابر ہیں۔ اگر مردوں کو مردانگی کی بنیاد پر چار عورتوں سے شادی کا حق دیا گیا ہے تو عورت کو بھی یہی حق ملنا چاہئے۔ فرض کیجئے کہ عورت عقل کے ذریعے سے بہ نسبت مرد کے عقل میں زیادہ توانا نہ ہو، جب بھی یہ یقین رکھنا چاہئے کہ روحانی تہجلی اور نفسیاتی کیفیت عورت

میں مرد کے کم نہیں ہے۔

پس نے ملاحظہ فرمایا۔ مذکورہ بالا بیانات میں "چند زنی" اور "چند شوہری" نصف مرد کی فرق نہیں بتایا جاسکتا ہے۔ بس ایک ہی بات دھرائی ہے۔ چونکہ مرد زور و تھکا ہند ذاتی نفع کے لیے "چند بیویوں" کی رسم چلائی، عورت زادہ تھی، لہذا وہ اپنی کمزوری کے خلاف "چند شوہری" کو رواج نہ دے سکی۔ اس مذکورہ بیان میں ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے "چند زنی" کے رواج اور "چند شوہری" کی ناکامی کا باعث مرد کی مالکیت اور عورت کی ملکیت تھی، مرد مالک سمجھا جاتا تھا اس لیے اسے ایک سے زیادہ عورتیں یعنی متعدد اموال رکھنے کا حق تھا۔ عورت ملوک تھی اور ملوک کو ایک مالک سے زیادہ مالک ہونے کا حق نہیں لہذا وہ چند شوہری نعمت سے محروم رہ گئی۔

اتفاقاً، مقدار نگہ رفاہوں کی رائے کے برخلاف "چند شوہری نظام" کا ناکام ہونا دلیل ہے کہ مرد عورت کو مال نہیں سمجھتا تھا۔ کیونکہ مال میں شرکت، چند آدمیوں کا ایک مال مل کر خریدنے اور سب کا مل جل کر ملکیتی مال سے فائدہ اٹھانے کی رسم پوری دنیا میں جاری ہے۔ اگر مرد، خواتین کو مال سمجھتے تو اس میں شرکت جائز سمجھتے اور سب مل جل کر فائدہ اٹھاتے۔ دنیا میں کہاں کا قانون یہ ہے کہ ایک مال کا مالک ایک سے زیادہ نہ ہو؟ اس کا جواب دیں، پھر ہم سمجھیں گے کہ ایک شوہری کا فلسفہ ملکیت ہے۔

کہتے ہیں: مرد اکائی ہے۔ عورت اکائی ہے۔ لہذا دونوں کے حقوق برابر ہونا ضروری ہے۔ مرد چند عورتوں سے فائدہ اٹھائے اور عورت چند مردوں سے فائدہ اٹھائے، کیوں؟

میں کہتا ہوں: آپ کی غلط فہمی یہی ہے کہ تعدد ازواج کو آپ حقوق مرد میں

شمار کرتی ہیں اور تعدد شوہر ان حقوق زوجہ میں۔ حالانکہ تعدد زوجات حقوق زن سے متعلق ہے اور تعدد شوہر ان مرد کے حقوق میں ہے نہ عورت کے حقوق سے اس کا کوئی تعلق ہے یہ بات مرد کے مقاصد و منافع کے بھی خلاف ہے اور عورت کے مقاصد و منافع کے بھی حق میں اچھی نہیں، ہم آگے چل کر ثابت کریں گے کہ قانون تعدد ازواج "اسلام نے عورت کے حقوق کو زندہ و ثابت رکھنے کے لیے منظور کیا ہے اگر اسلام مرد کی حمایت کرنا چاہتا تو وہی اقدام کرتا جو یورپ والوں نے کیا ہے وہاں قانون نے مردوں کو دوسروں کی عورتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا، اس نے پہلی بیوی کے علاوہ سب پہرہ اٹھالیا، پھر ستم یہ کہ اولاد بلکہ خود اس عورت کے قانونی حقوق بھی تسلیم نہیں کیے۔

چند شوہری، عورت کے لیے کوئی فائدہ رسان حق نہیں تھا جو اس کے چھین لیا گیا۔ کہتی ہیں۔ ہم مردوں کو سمجھا نا چاہتے ہیں کہ خواتین کے بارے میں ان کے نظریات خود ان کے پندار کے مطابق مضبوط و ناقابل تبدیلی نہیں۔

اتفاق دیکھیے کہ ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ آئندہ مقالات میں تعدد ازواج کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر واضح کریں گے، پھر اس معنف اور دوسرے انصاف پسند ملتان نصر سے التماس ہے کہ ان مقالات کو دیکھیں اور بتائیں کہ کیا اسلام کا نقطہ نظر کسی تغیرنا پذیر اصل پر مبنی ہے، یا نہیں؟ میں ایک شریفانہ وعدہ کرتا ہوں اگر کوئی شخص اس نظریے میں کوئی غیب کھل کر دکھائے تو میں حقوق خواتین کے بارے میں اپنی پوری بحث کو نظر انداز کر دوں گا۔



## تعدد ازواج کے تاریخی اسباب

(جغرافیائی علل)

(۳)

”چند زوجی“ کے رائج پانے کے لیے یہ عامل کافی نہیں کہ مرد ہوس پیشہ اور بے چارے جو اس کو تسلط حاصل ہے۔ یقیناً اس کے علاوہ کچھ اور علل و اسباب بھی موثر ہوں گے، ورنہ عیاش مرد کے لیے آسان اور بے درد سری کا راستہ پھر واپسی بازار کی آزادی و صوالہوں سے حاصل ہو سکتی تھی، دوست، ساتھی، معشوقہ اور آزادی کی آزادی، یک پسندیدہ عورت کو بیوی بنانا، اس کے شکوکے بچے کی ذمہ داری سنبھال

نیتا۔

بنابراین جن عاشقوں میں ”چند اندوگی“ رائج تھی وہاں یا تو عیاشی و ہوس پیشہ افراد کے لیے ملاقاتی رکھ دینے کا سہارا ملتا ہے یا سہارا ملتا ہے ہوس رانی اور تنوع طلبی کا جرمانہ پرکھا تھا کہ قانونی بیوی قبول کرے، اور اس کی اولاد کو اپنی اولاد ملنے اور سبکی دیکھال کرے۔ یا کچھ بچہ اور اسباب و وجوہ ہوں گے خواہ وہ جغرافیائی ہوں یا اقتصادی یا سماجی، بہر حال ہوس رانی و تنوع طلبی کا عمل دخل نہیں تھا۔

جغرافیائی عوامل

مان سکو۔ اور گوستا ووبن تو جغرافیائی عوامل ہی پر زور دیتے ہیں۔ ان مفکرین کے خیال میں مشرق کی آب و ہوا کا تقاضا ہی تھا کہ ایک مرد کو کئی بیویاں کرے۔ مشرقی علاقوں میں عورت جلدی بالغ ہوتی ہے اور جلدی بوجھ بھرتی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مرد کو دوسری اور تیسری

شادی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مزید یہ کہ مشرقی آب و ہوا مرد کی جنسی قوت کے لحاظ سے کچھ ایسی ہے کہ ایک بیوی اسے کافی نہیں ہوتی۔

گوستا ووبن، تاریخ تمدن اسلام و عرب، (ترجمہ فارسی) صفحہ ۵۹ پر لکھا ہے۔ مذکورہ رسم (تعدد ازواج) فقط مشرق کی آب و ہوا کا نتیجہ تھی۔ آب و ہوا کی وجہ سے نسلی اور طرز زندگی کے خصوصیات دوسروں سے الگ ہوئے۔ یہ نہیں کہ مذہب پر ہم لایا تھا۔ آب و ہوا، اور قومی خصوصیات ہی وہ عوامل ہیں جو رومرہ سے زیادہ مضبوط اور اثر انگیز ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم اس بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔ مشرقی عورت کی اصل فطرت و طبیعت اور اس کی رخت، نینر بچے کی پرورش اور بیماریاں جیسے عوارض انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ جلدی مرد سے دوری اختیار کریں موسم، اور قومی خیر کچھ ایسا ہے کہ مرد اس وقتی علیحدگی کو برداشت ہی نہیں کر سکتا، لہذا تعدد ازواج لازمی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

مان سکو، روح القوائین (فارسی ترجمہ) صفحہ ۴۲۰ پر لکھا ہے: ”جن ممالک میں گرم آب و ہوا ہے۔ وہاں لڑکیاں عموماً، آٹھ نو برس کی عمر میں بالغ ہو جاتی ہیں۔ اور شادی کے بعد حمل آجاتا ہے۔ یعنی گرم علاقوں میں شادی، ورجل کے بعد دیگرے ہونے والے عمل ہیں۔“

پیر پٹو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح میں کہتا ہے: ”حضرتؐ نے پانچ سال کی عمر میں فدیجہ رضوانہؓ سے عقد کیا اور آٹھ سال کی عمر میں ہم خوابی کی، اسی لیے گرم سرزمین کی خواہشیں برس برس میں بوجھ بھرتی ہوتی ہیں۔ جب وہ چاہتی ہیں کہ عقل کمال حاصل کرے تو بڑھاپے میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ جن ممالک میں موسم معتدل ہوتا ہے، وہاں خواتین کا حسن دیر تک باقی رہتا۔“

دین میں باغ ہوئی ہیں۔ جب تک کہ وہی تو زیادتی سن و سال کی وجہ سے  
تجربہ کار ہوئی ہیں۔ اولاد نہ ہونے کے بعد ان کی عمر اور آگے جاتی ہے اور  
میاں بیوی تقریباً ہم سن ہو جاتے ہیں، دونوں کا بڑھاپا ایک ساتھ آتا ہے  
دونوں میں برابری برقرار ہوتی ہے، مرد کو دوسری عورت کی ضرورت  
پیش نہیں ہوتی۔۔۔۔۔

اس وجہ سے یورپ میں تعدد ازواج کی مخالفت کا قانون اور ایشیا میں اس کا  
جواز موسم کا تقاضا ہے۔۔۔۔۔

یہ تو یہ کسی حیثیت سے درست نہیں۔ پہلے تو یہی دیکھئے کہ "تعدد ازواج" کی رسم  
مشرق کے گرم خطوں میں ہے۔ رائج نہیں۔ معتدل موسم کے علاقوں میں ایران کو لیجئے، یہاں  
تبل راہ سرد مچھی یہ رسم جاری تھی۔ مانٹکو کا یہ کہنا — گرم خطوں میں عورت میں  
برس میں بوڑھی ہو جاتی ہے، ایک بے حقیقت خرافات ہے۔ اور اس سے زیادہ  
ناف زنی — پیر دیدہ — نے کی، کہ پیغمبر اسلامؐ نے پانچ برس کی عمر میں حضرت  
خدیجہؓ سے عقد کیا۔ اور آٹھ برس کی عمر میں ہم خواب ہوئے۔ سب کو معلوم کہ حضرت  
نے اپنی پچیس برس کی عمر و حضرت خدیجہؓ کی چالیس برس کے سن سے زیادہ میں شادی  
کی تھی۔

دوسرے گروہ عورت کا جلدی بوڑھا ہونا، اور مرد کی جنسی طاقت کا میحان ہی  
اس رسم کا سبب ہوتا تو مشرقی اقوام نے مغربی علاقوں کے وسطی دور اور جدید  
زمانے کے رواج کیوں نہ اپنا لئے، یعنی تعدد ازواج کے بجائے، زنی کی بازی اور  
عیاشی کیوں نہ اختیار کی، کیونکہ بقول گوستاو لوہن، ایک بیوی کا فقر تو مغرب کے  
قانونی کتب میں تو ہے لیکن سماج میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔  
نیز بقول اسی مصنف کے — مشرقی علاقوں میں تعدد ازواج قانونی صورت میں

تو ہے ہی، رسمی طور پر یہ آبرو مندانہ معاہدہ قبول کیا جاتا ہے اور ان بیویوں کی اور  
کوان کا باپ بخوشی اپنی فرزندگی میں لے تا ہے۔ مغرب میں متعدد و فقار حیات  
مکملانہ و غیر قانونی طور پر پائی جاتی ہیں۔ یعنی معشوقہ سازی و رفیقہ بازی کے مذا  
ہیں باہمی معاہدے اور پدر کا ذمہ داری اولاد سے آزاد۔

یورپ میں چند ازواجی رسم کی صورت حال: || میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کھوڑ  
تفصیل مغرب میں چند ازواجی

رسم کے بارے میں لکھتا چلوں، وہاں قرون وسطیٰ میں کیا رویہ تھا۔ مغرب ہی کے  
ایک محقق کا بیان ناظرین ملاحظہ کریں۔ اور وہ لوگ بھی سنیں جو ایشیا کو "تعدد  
ازواج" اور کبھی "حرم سرانی" نظام کے نام سے قابل تنقید اور مشرق کی شرمندگی  
کی بات سمجھتے سمجھتے ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ ایشیا میں بہت سے غیب اور متعدد  
روایتوں کی باتیں ہوں گی، اس کے باوجود جو ماحول یورپ میں گذرتا ہے وہ ہر روز  
نفیلت و شرافت مندانہ ہے۔

"ویل ڈیورانت" تاریخ تمدن، جلد ۱، میں "ستی اخلاق" کے نام سے  
ایک فصل قائم کر کے، اٹلی کی عہد رنسانس میں عام اخلاقی ردیوں کی تفصیل لکھتا ہے۔  
"افدق و روابط جنسی" کے ذیل میں جو کچھ ہے اس کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے۔

ویل ڈیورانت بطور نمید کچھ باتیں یوں کرتا ہے، جیسے معذرت خواہی کرن  
ہو۔ کہتا ہے۔۔۔

"غیر مذہبی عوام کی اخلاقی حالات اور جنسی تعلقات کے بارے میں پ  
کرادوں کہ مرد، ذاتی طور پر چند ازواجی فطرت کا مالک ہے۔ و فقط  
طاقت و تین اخلاقی پابندیاں، غربت اور محنت کی ایک ص حد اور  
بیوی کی مناسب کچھ بھان مرد کو ایک بیوی برداشت کرنے پر مجبور کر سکتی ہے"



اس کے بعد وہ اصل مدعا پر آتا ہے :  
 ”معلوم نہیں، رنسانس کے عہد تک قرون وسطیٰ میں شوہر دار خواتین سے  
 زنا کم تھی، اور جس طرح قرون وسطیٰ میں پہلوانی کے پردے میں زنا خوبصورت  
 عمل قرار دیا گیا تھا، اسی طرح رنسانس کے دور میں یہی عمل طالب علم لڑکیوں  
 کے واسطے، دل کشی، اور نسوانی جادوگری کے نام سے عام تھا.....  
 اویسے خاندانوں کی لڑکیاں، بڑی مدت تک خاندان سے باہر کے مردوں  
 سے ٹک ورت چھپا کر رکھی جاتی تھیں۔ شادی سے پہلے ان کو پاک دانتی  
 کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کبھی اس تعلیم کے دور رس نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں  
 ایک واقعہ ہے کہ ایک جوان خاتون نے ناموس لوٹنے کے بعد دریا میں  
 ڈوب کر خودکشی کر لی۔ مگر یہ مثال اکیلی تھی۔ کیونکہ اس کی موت کے بعد  
 پادری کو اس کا جسم بنانے کی فکر ہوئی۔“

شادی سے پہلے کے فیصلے قابل توجہ تھے۔ رنسانس کے اٹلی میں سرنہر کے اندر جائز  
 بچوں کے وجود کی دلیل زنا کے علاوہ کیا ہو سکتی تھی۔ ناجائز اولاد کا کسی گھر میں نہ ہونا  
 عزت کی بات تھی مگر حرمی اولاد کا وجود کوئی رسوائی کا سبب بھی نہ تھا۔ عام رواج  
 کے مطابق شادی کے وقت ہی مرد اپنی بیوی کو ناجائز اولاد لکھنے لاسنے کی شوقین ہوتا  
 تھا۔ تاکہ دوسرے گھر کے بچوں کے ساتھ وہ بھی پرورش پائے۔ حرام زادہ ہونے سے  
 کسی کی عزت کم نہ ہوتی تھی۔ اور سماج کی طرف سے جو داغ لگایا جاتا تھا، اس کی کوئی  
 اہمیت نہ تھی۔ مزید برآں اس لڑکے کا جائز ہونا بھی مشکل نہ تھا، چرچہ کے  
 مجبوروں کو ثبوت دیکر سند حاصل کی جاسکتی تھی۔ اگر جائز اولاد نہ ہوتی تو باصلاح  
 ناجائز لڑکے کا تخت و تاج شاہی کا وارث بھی ہو سکتا تھا۔ اس کی مثال فرنیٹ اول  
 (FERRANTE) پیرز (NAPLES) کے بادشاہ، الفانسو اول

(1 - ALFONSO) کا جائز ہوا۔ یا۔ لیونی لو، ڈی ایرٹ (LEO - ACCOLO III)  
 (NELLO D'ESTE)، فیرارا (FERRARA) کے حکمران نکولو سوم  
 کا جائز ہوا تھا۔ ۱۴۵۹ء میں جب پیوس دوم (PIUS - II) فیرارا آیا تو  
 سات شاہزادوں نے اس کا استقبال کیا، یہ ساتوں شاہزادے ہلاں زادے  
 نہ تھے۔ رنسانس کے عہد میں حلال زادوں اور حرام زادوں میں بڑی رقابت اور  
 کشمکش رہی..... رہی ہم جنسی تعلقات کی بات تو یونان قدیم کی ایک  
 رسم کا جبری احیا ہوا.....

سان برنارڈینو (SAN, BERNARDINO) نے یہ شرمناک عمل اتنا دیکھا  
 کہ شہر کی قسمت کو سدوم اور غورہ کی سرنوشت کہہ کر ڈرایا۔ اریٹی نیو (ARE - TINO)  
 نے بھی روم میں اس بد اخلاقی کا مشاہدہ اسی فراوانی سے کیا.....  
 دوسری فحاشیوں کے سلسلے میں بھی باتیں کی جاسکتی ہیں۔ ”ابن فسور“  
 (AFESSURA) کو پورنٹین روم میں اپنے شہریات کی اہمیت بڑھانے کے شوق  
 نے کہا۔ ۱۴۵۹ء میں ۹۰ ہزار کی رومی آبادی تھی اور ۶۸۰۰ عوالفوں کے  
 نام درج دفتر تھے۔ اور اس تعداد میں چھپ کر اور بغیر لائسنس کی عوالفوں کا  
 شمار نہیں ہے۔ وینز کے شماریات ۱۵۰۹ء کے مطابق ۱۱۶۵۴ فاحشہ  
 عورتیں تھیں جبکہ شہر کی آبادی تین لاکھ تھی..... پندرہویں صدی میں  
 جو رٹ کی پندرہ برس کی عمر تک شوہر کے گھر نہ جاسکتی تھی وہ ننگ خاندان سمجھی  
 جاتی تھی۔ سولہویں صدی میں ”رسوالی کی عمر“ سترہ سال تک ردی گئی، تاکہ  
 رٹ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے۔ جن مردوں کو عیاشی کی تمام تر سہولتیں حاصل تھیں، وہ  
 صرف اس وقت شادی پر مائل ہوتے تھے جب لڑکی اپنے ساتھ قابل کشش  
 جہیز لائے..... قرون وسطیٰ کے قوانین ازدواج کے مطابق، شادی دوران

دونوں کے تعلقات دیکھے جاتے تھے کہ میاں بیوی میں محبت پنختہ ہو جائے، خوشی اور غمی، خوشی لی و تنگی میں ایک دوسرے کے ساتھی اور مخمخوار رہیں، عام طور پر یہ آرزو پوری بھی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود شادی شدہ عورتوں سے بدکاری کا رواج تھا اور بچے درجے کے آدمیوں میں شادیاں ڈیپلومیٹک اور سیاسی و اقتصادی اتحاد کے لئے ہوتی تھیں، بہت سے شوہر، کسی محبوبہ داشتہ سے تعلق اپنا حق جانتے تھے۔ بیوی کو ناگوار بھی ہوتا تو انھیں نب بند رکھنے پر مجبور ہوتی تھی۔

متوسط طبقے میں کچھ لوگ تفریحی بدکاری کو جائز سمجھتے تھے۔ یکساں ولی اور اس دوست اپنی بیویوں کی داستانوں سے رنجیدہ نہیں ہوتے تھے۔ ایسے موقعوں پر جب بیوی اپنے شوہر کی تقلید میں شوہر سے انتقام لیتی تھی تو عموماً شوہر اس اقدام سے چشم پوشی کرتے اور غیرت کی ٹوپی ذرا اور اونچی کر لیتے تھے۔

جی، یہ تھی عوامی زندگی ان حضرات کی جو تعدد ازواج کو مشرق کا ناقابل معافی جرم سمجھتے تھے اور کبھی کبھی اس علاقے کے موسم کو قبول ان کے، اس غیر انسانی عمل کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ مگر ان کا علاقہ، ان کا موسم اور ان کا ماحول انھیں بیوی سب سے فانی اور ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

ضمناً یہ نکتہ بھی بن کہا نہ رہ جائے کہ قانونی (شرعی) طور پر کئی بیویاں رکھنے نہ۔ کادستور اہل یورپ میں، اچھے برے سے بحث کے بغیر اصل دین عیسوی سے غیر متعلق ہے۔ دین مسیح میں کئی بیویاں نہ رکھنے کا کوئی حکم ہے ہی نہیں۔ بلکہ حضرت مسیحؑ تورات کے ضابطوں کی تائید کرتے ہیں اور تورات میں لئی بیویوں کو قانوناً تسلیم کیا گیا ہے۔ بنابرین میں تو یہ کہنا چاہئے کہ دراصل دین مسیح میں کئی بیویاں جائز قرار دی گئی ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پرانے مسیحی کئی کئی بیویاں رکھتے تھے۔ لہذا یورپ والوں کا کئی بیویوں کے قانونی نظام سے الگ رہنا ایک یا متعدد اسباب

مبنی ہوگا، مذہب تو علت نہیں ہے۔

### ماہواری :

کچھ لوگوں نے تعدد ازواج کا سبب بتایا ہے کہ ماہانہ بیماری، اور مدت ماہواری میں مرد کو لذت اندوزی سے روکنے کا احساس، پھر بچہ جننے سے تھکن اور عیسریگی کی خواہش، بچہ کی خوراک و پرورش کا مسئلہ، ایک بیوی سے زیادہ تقاضا کر لے۔ ویل ڈیورانٹ کے بقول:

”ابتدائی معاشرتوں میں بیوی جلدی بوڑھی ہو جاتی ہے اور مرد سے دوسری شادی کی خواہش کرتی ہے تاکہ اپنے بچوں کے کھانے پینے کا انتظام کر سکے اور تولید اولاد میں درمیانی فاصلہ بڑھاسکے اور مرد کے شوق تولید اور جنسی عمل میں رکاوٹ نہ بنے، عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ پہلی بیوی، اپنے شوہر سے دوسری شادی کی فرمائش اس لئے بھی کرتی تھی کہ اس کا کام ہلکا ہو، اور نئی خاتون سے بچے ہوں۔ جس سے فائدہ اور سرمایہ بڑھے۔“

بلاشبہ، عورتوں کی ماہانہ بیماری، اور بچہ جننے سے تھکن، کی بنا پر جنسی عمل میں دونوں دو الگ سمتوں میں واقع ہوتے ہیں، اس بنیاد پر مرد کو کچھ نہ کچھ دوسری عورت کا خیال آتا ہے لیکن دونوں مذکورہ علتیں مستقل سبب تعدد ازواج نہیں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اخلاقی یا سماجی رکاوٹ موجود ہو جو مرد کو اس کی آرزو پورا کرنے اور معشوق بنانے یا آزادانہ پرستی کا عمل نہ کرنے دے۔

### خواتین کی زچگی کا سن محدود ہوتا ہے

بعض حضرات کے خیال میں مرد کے برخلاف خواتین کی تولیدی قوت ایک خاص



عزیز رتی ہے۔ پھر وہ "یا لہ" ہو جاتی ہے، یہ بھی تعدد ازواج کی وجہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بیوی اس وقت "یا لہ" ہو جب یا تو شوہر کے لئے اولاد کافی نہ پیدا ہوئی یا وہ بچے فوت ہو چکے ہوں۔

مرد کا رجمان فرزند نہیں، اور بیوی کو طلاق نہ دینے کا خیال سبب ہوتا ہے کہ دوسری یا تیسری بیوی گھر میں لائے، جیسے پہلی بیوی کا ناقابل تولید ہونا شوہر کے لئے دوسری بیوی کا محرک ہے۔

## اقتصادی اسباب

تعدد ازواج کے اقتصادی اسباب و عوامل کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں، اس زمانے کے برعکس پرانے زمانے میں زن و فرزند کی کثرت اقتصادی طور پر مرد کے لئے نفع بخش چیز تھی۔ مرد، اپنے بیوی بچوں سے غلاموں کی طرح بیگا رہتا تھا، کبھی اپنے بچوں کو بچتا بھی تھا۔ بہت سے افراد کی غلامی، جنگی قیدی ہونے کی بناء پر نہیں بلکہ ان کے باپوں نے انھیں بازار میں سے جا کر بیچا تھا۔

تعدد ازواج کی یہ وجہ ممکن ہے صحیح ہو، کیونکہ فقط یہی ایک طریقہ ہے کہ مرد قانونی بیوی کے ذریعے کثرت اولاد سے فائدہ اٹھائے، محبوباؤں کی تلاش اور زندگی بازی سے مرد یہ خصوصیت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس سبب کو ہر ایسے معاشرے میں موثر نہیں مانا جاسکتا، جہاں کثرت ازواج کی رسم موجود ہو یعنی یہ سبب عام سبب نہیں ہے۔

فرض کریں کہ شروع شروع میں اقوام و قبائل اسی وجہ سے متعدد شادیاں کرتے تھے، لیکن سب قومیں ایسی نہ تھیں۔ پرانی دنیا میں کئی بیویاں رکھنے کی رسم اس طبقات میں رائج تھی۔ جوشان و شوکت، شخصیت و امتیاز کے ساتھ زندگی گزارنے

والے تھے۔ بادشاہ، امیر، سردار، مذہبی رہنما اور خاص ماجر جیسے لوگ۔ معلوم ہے کہ یہ طبقات بیویوں اور اولاد کی فراوانی سے کوئی اقتصادی فائدہ حاصل نہیں کرتے تھے۔

## تعدد و خاندان ایک سبب

کثرت اولاد، اور خاندان کی نفی بجائے خود ایک اور عامل تھا کہ کئی شادیاں کی جائیں۔ زن و مرد کو دو مختلف جہتوں اور دو فرق مراتب۔ کھنے والی یکیت یہ بھی ہے کہ ایک عورت جس تعداد میں بچے پیدا کر سکتی ہے وہ محدود اور گنتی کے ہیں، خواہ ایک شوہری نظام ہو یا چند شوہری۔ لیکن مرد کی قوت تولید، زیر اختیار عورتوں کی تعداد پر منحصر ہے۔ لیکن ہے ایک مرد سیکڑوں عورتوں سے ہزاروں بچے پیدا کروا سکے۔

آج کی دنیا کے برخلاف، پرانے زمانے میں ایک اور اہم عامل یہ تھا کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لڑکیوں کی شرح پیدائش لڑکوں سے زیادہ نہ اس وقت تھی نہ اب ہے۔ اگر اتفاقاً کچھ علاقوں میں لڑکیوں کی شرح پیدائش زیادہ ہو بھی تو دوسرے علاقے میں اس کے برعکس ہے وہاں لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں سے زیادہ ہوگی۔ ایک چیز ضرور ہے اور وہ ہے مردوں کی شرح موت کا عورتوں سے زیادہ ہونا۔ مردوں کی شرح موت ہمیشہ ایک سبب رہا ہے کہ اگر ایک بیوی کے دستور پر قائم رہ جائے تو عورتوں کی بڑی تعداد، قانونی شوہر، گھر، زندگی اور جائز اولاد سے محروم رہے گی۔

ابتدائی زمانے کے معاشرے میں ایسا ہی تھا، بحث کی بات ہی نہیں، ہم ویل ویل ٹیبلٹ کی رائے نقل کر چکے ہیں کہ :

سمان کی پہلی منزل میں جنگ و شکار کی وجہ سے مردوں کی زندگی خطرے میں رہتی تھی۔ اور مرد، عورتوں سے زیادہ مرتے تھے۔ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی سبب یا کئی بیویوں کا نظام رواج پاتا یا عورتیں بے شوہر کے رہتیں۔

## تحقیق

تاریخی لحاظ سے جن عوامل و اسباب کو تعداد ازواج کی اساس مانا جاسکتا ہے وہ یہی ہیں جو ہم نے بیان کیے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ان عوامل و اسباب میں کچھ علتیں حقیقی نہیں، تعداد ازواج کے ذیل میں ان کا تذکرہ بلاوجہ کیا جاتا ہے، جیسے موسم۔ اس کے علاوہ مزید تین قسموں کے علل و اسباب کا مزید جائزہ لیجئے۔

پہلی قسم ان علل و اسباب کی ہے، جن کے اثر سے مرد تعداد ازواج کی طرف مائل ہونا ممکن ہے، یعنی مرد کے لئے وجہ جواز تو کوئی نہیں، مگر زور و ظلم و تعدد کا پہلو قوی ہے۔ اقتصادی عامل بھی اسی قسم کا ہے، اور ہم اس پر توجہ دلا چکے ہیں۔

دوسرے علل کا قانونی زاویہ سے مطالعہ کرنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ وہاں کوئی وجہ جواز مرد یا معاشرے کے واسطے موجود ہو۔ مثلاً بیوی کا بانجھ ہونا یا اس کا "یائتہ" (ماہواری بند ہونے کی عمر کی عورت ہونا) دوسری طرف شوہر کا محتاج فرزند یا قبیلے اور ملک کا طالب کثرت آبادی ہونا۔ یہاں کلمہ کے طور پر زن و مرد کی فکری عوامل کو از زاویہ سے دیکھا جائے گا کہ جنسی آسودگی یا تولید نسل کی بنیاد پر دونوں کی نوعیت غیر مساوی ہے۔ اسی پہلو کو تعداد ازواج کے لئے وجہ جواز قرار دیا جاسکتا ہے۔

تیسرے علل کا وہ حصہ ہے، جسے تیسری نوع میں اس وقت شمار کیا جاسکے گا

جب یہ فرض کر لیں کہ وہ گزشتہ صدیوں میں موجود بھی تھے، یا آج وہ علل موجود ہیں ان میں سے بعض اسباب تو اتنے مؤثر ہیں کہ نہ صرف وہ تعداد ازواج کا جواز مہیا کرتے ہیں بلکہ اس سے تو مرد پر عورت کا ایک واجب الادا حق عائد ہوتا ہے اور فقط عورت ہی نہیں، معاشرے اور سماج کی ذمہ داری بھی یہی ہوگی کہ مرد کی شادی کرے، اس کی علت عورتوں کی عددی اکثریت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرض کریں گزشتہ دور یا موجود زمانے میں شادی کے قابل لڑکیاں، شادی کے قابل لڑکوں سے زیادہ ہوں اور ایک شادی ہی قانونی قرار دی جائے۔ تو بن بیای اور گھریلو زندگی سے محروم خواتین کا ایک طبقہ سماج میں موجود ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعداد ازواج، محروم عورتوں کی طرف سے ایک "حق" اور مردوں اور گھریلو عورتوں کے کا ندھے پر ایک قانونی پابندی آپڑے گی، کہ بن بیای اور عائلی زندگی سے محروم عورتوں کو آباد کریں تاکہ وہ بھی خانگی زندگی حاصل کر سکیں۔

گھریلو زندگی سے زیادہ انسان کا فطری حق ہے۔ کسی بشر کو کسی نام اور کسی عنوان سے اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ خانگی زندگی اب حق ہے جو، ہر فرد اپنے معاشرے میں پیدا کرتا ہے اور معاشرہ کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتا جس کے نتیجے میں سماج کا کوئی گروہ اس حق سے محروم رہ جائے۔ اس حق کی نظیر، روزگار، روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم و تربیت اور آزادی، ہر بشر کا اولین حق اور حقیقی حق ہے۔ یہ حق کسی نام و عنوان سے چھینا نہیں جاسکتا۔ عائلی زندگی بھی ایک فطری حق ہے اور حبشادی کے قابل عورتوں کی تعداد شادی کے لائق مردوں کی نفی سے زیادہ ہو تو "صرف ایک بیوی" کا قانون، مذکورہ فطری حق کے خلاف ہے لہذا یہ قانون بھی حقوق فطری بشر کے خلاف ہوگا۔



ماضی کے بارے میں تو یہ سب کچھ ہو گیا، سوال یہ ہے کہ آج کیا کہا جائے؟  
 کجا آج بھی ان اسباب کا وجود ہے جن کی بنا پر کئی بیویاں رکھنے کا جواز نکلتا ہے  
 اور وہ عورت بھی موجود ہے جو تعدد ازواج کو بطور حق فرض کرتی ہے۔ یہ آج  
 ان چیزوں کا وجود نہیں ہے۔

مقصود یہ ہے کہ اگر یہ مؤثر اسباب موجود ہیں تو پہلی بیوی کا حق کیا ہوگا؟  
 ان سوالوں کے جواب آئندہ فصل میں آ رہے ہیں۔

## کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق

”ایک بیوی کئی شوہر“ کی رسم ختم و ناکام ہونے، نیز ”ایک شوہر کئی بیویوں“  
 کی کامیابی کے اسباب و علل پر گفتگو ہو چکی۔ ہم نے ”تعدد ازواج“ کی رسم شروع  
 ہونے پر متعدد اسباب بیان کیے اور ان پر روشنی ڈالی۔ اس کا ایک سبب جنس مرد  
 کے نفسیات میں حکومت و استبداد کا جذبہ ہے۔ ایک وجہ زن و مرد میں فطری حسد  
 کا فرق ہے، دونوں میں سن و سال کے لحاظ سے تولید نسل کی صلاحیت، اور تولید فرزند  
 کی تعداد میں امکانات کا اختلاف بھی ”تعدد ازواج“ کا جواز بن سکتا ہے۔

لیکن جو خاص ”علت“ پوری تاریخ میں اثر انداز رہی ہے وہ ہے تعدد ازواج  
 عورت کا مرد پر ایک ”حق“ اور براہ راست مرد کا ایک ”فرض“ ہے۔ اور وہ علت ہے قبل  
 نکاح خواتین کی عددی کثرت اور شادی کے قابل مردوں کی کمی ہے۔

ہم طول کلام سے بچنے کے لیے ان علتوں پر بحث چھوڑ رہے ہیں جو اگرچہ وجوہ  
 چند زنی کے لیے کافی نہیں مگر مرد کے لیے ”وجہ جوز“ ضرور ہیں۔ ہم اپنی گفتگو اس علت  
 پر محدود کرتے ہیں کہ اگر وہ علت موجود ہو تو تعدد ازواج، عورتوں کے حق کے ”حق“  
 ضرور بنتا ہے۔

مذکورہ دعوے کے ثبوت سے پہلے دو باتیں بطور تمہید واضح ہونا ضروری ہیں:  
 ۱۔ حتمی و یقینی شہادت کی رو سے یہ ثابت ہونا چاہئے کہ قابل شادی عورتوں کی  
 تعداد، شادی کے قابل مردوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔

۲۔ اگر ایسی سند میں جائے تو حقوق انسانی کی رو سے محروم خواتین کا ایک حق، مردوں اور خاکی عورتوں کے ذمے عائد ہو جائے گا۔

پہلی بات: خوش قسمتی سے، آج کی دنیا کے پاس، اس بارے بڑی صحیح شماریات موجود ہیں۔ دنیا بھر کے ممالک چند سال بعد مردم شماری کرتے ہیں۔ مردم شماری کی مہم ترقی ملکوں میں بڑے اہتمام سے انجام دی جاتی ہے۔ اس طرح مرد و زن کی الگ تعداد ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس سے مختلف برسوں میں عورت و مرد کی اوسط تعداد بھی دریافت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ بھی علم میں آجاتا ہے کہ ۲۰ سے ۲۴ سال کے لڑکوں کی تعداد کیا ہے اور اسی عمر کی لڑکیاں کتنی ہیں؟ ہر عمر کے افراد معلوم ہو سکے ہیں۔ دارہ اقوام متحدہ، اپنے سال مردم شماری میں ان اعداد و شمار کی اشاعت کرتا ہے۔ غالباً اب تک سولہ رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۹۶۴ء کی مردم شماری کی رپورٹ ۹۶۵ او میں چھپی تھی۔ اس نکتہ پر توجہ دلانا ضروری ہے کہ ثبوت مدعا کے لیے، ہر ملک کے مردوں کی تعداد اور عورتوں کی مجموعی تعداد کیا ہے، یہی جاننا کافی نہیں ہے۔ مفید و لازم تو یہ معلوم کرنا ہے کہ شادی کے قابل لڑکوں اور شادی کے قابل لڑکیوں کی اوسط کیا ہے؟ کیونکہ قابل شادی مردوں اور شادی کے قابل عورتوں کی تعداد ان کے مجموعی اوسط سے عموماً مختلف ہوگی۔ اس کے سبب دو ہیں:

۱۔ لڑکیوں کے بلوغ کا زمانہ، لڑکوں کے زمانہ بلوغ سے پہلے آتا ہے، جب ہی تو دنیا بھر کے قوانین میں لڑکیوں کا قانونی سن لڑکوں کے قانونی سن سے کم ہے عملی طور پر دنیا کی اکثریت میں شادی کے وقت لڑکی کی عمر لڑکے سے کم از کم پانچ سال چھوٹی ہوتی ہے اور شوہر اوسطاً بیوی سے پانچ برس بڑے ہوتے ہیں۔

۲۔ سب اہم اور بنیادی علت یہ ہے کہ اگرچہ لڑکیوں کی پیدائش، لڑکوں کی پیدائش سے زیادہ نہیں ہو سکتا ہے، چند علاقوں میں تو لڑکوں کی پیدائش

کی شرح زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمیشہ جنس ذکور کی موت کا وسط جنس اناث سے زیادہ ہے اس سے شادی کی عمروں میں فرق پڑ جاتا ہے اور کبھی تو بہت زیادہ فرق نظر آنے لگتا ہے۔ یوں شادی کے قابل عورتوں کی تعداد، شادی کے قابل مردوں سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے لہذا، ممکن ہے، ایک ملک میں ذکور کی تعداد اناث کی مجموعی تعداد سے ساوی یا زیادہ ہو لیکن شادی کے قابل دیجے میں، یعنی شادی کے قانونی عمر تک پہنچنے پہنچنے صورت حال برعکس ہو جائے۔ مردم شماری کی رپورٹ ۱۹۶۴ء جو اقوام متحدہ کا اس بارے میں آخری نشر ہے، (جب زیر نظر بحث لکھی گئی تھی) اس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔

مثلاً اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق کوریا کی مجموعی آبادی ۲۶,۲۴۴,۶۳۵ تھی ان میں مردوں کی تعداد ۱۲,۵۸۹,۱۴۵ تھی اور خواتین کی تعداد تھی ۱۳,۶۵۵,۴۹۰۔ یعنی کل آبادی میں سے ۱۲,۹۴۳ مرد، عورتوں سے زیادہ تھے۔ اس تعداد میں ایک سال سے کم عمر کے بچے، ایک سال سے ۴ برس تک اور پانچ برس سے نو برس تک اور بارہ برس سے چودہ، پندرہ سے انیس برس تک کی عمر کے بچے بھی شریک ہیں۔

شماریات بتاتے ہیں کہ ان عمروں میں ذکور کی تعداد اناث سے زیادہ ہے۔ لیکن بیس برس سے چوبیس برس تک کے ٹوٹل میں یہ نسبت بدل جاتی ہے۔ اس سن میں ۳,۶۴,۰۸۳ ذکور اور ۱۱,۰۰۵,۱۱۱ عورتیں۔ اور اس کے بعد قانونی شادی کئے زن و مرد کی عمروں کا حساب کریں تو عورتیں، مردوں سے زیادہ نکلتی ہیں۔

جمہوری کوریا کے شماریات استثنائی ہیں، وہاں مردوں کی مجموعی تعداد، عورتوں سے زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف اکثر ممالک عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے، یہ زیادتی، شادی کی عمر کے حساب سے بھی برقرار رہتی ہے۔

روس کی مجموعی آبادی ۲۱۶,۱۰۰,۰۰۰ ہے، اس میں مرد ۸۸,۰۰۰,۰۰۰ عورتیں ۱۱۸,۲۶۱,۰۰۰ ہیں، یہ فرق شادی سے پہلے کی عمر تک ہے، شادی کی عمر یعنی بیس سال



۷۷

انگلستان، فرانس، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، چیکوسلوواکیہ، پولینڈ، رومانیہ،  
منگری، امریکہ اور جاپان میں یہی مناسب ہے۔ بعض علاقے ایسے ہیں جہاں اختلاف ہے  
مثلاً مشرقی و مغربی جرمنی میں فرق مناسب زیادہ نمایاں ہے۔

ہندوستان میں، عام حویہ پر اور عمر ازدواج میں خاص طور پر مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے۔ البتہ بچی سے بڑھیں اور اس کے اوپر عورتیں زیادہ، مرد کم ہو جاتے ہیں، بظاہر عورتوں کی کمی کا سبب ہندوستان کی وہ قدیم رسم ہے کہ جس میں بیوہ کو معاشرے سے ختم کر دیا جاتا ہے۔

گزشتہ سال ایران کی مردم شماری میں یہ بات سامنے آئی کہ ایران استثنائی ملک ہے جہاں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے اس رپورٹ کے مطابق ایران کی مجموعی آبادی ۹۰,۷۸,۰۲۵ ہے۔ اس میں سے مردوں کی تعداد ۴۴,۳۳,۷۱۳ ہے اور عورتیں ۴۵,۷۴,۳۱۲ ہیں۔ ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہیں۔

مجھے یاد ہے، اُن دنوں، تعدد ازواج پر بحث کرنے والوں نے لکھا تھا۔ دیکھیے،  
تعدد ازواج کے حامیوں کے دعوے کے برخلاف، ہمارے ملک میں مردوں کی تعداد عورتوں  
کی تعداد سے زیادہ ہے۔ اس بنا پر قانون تعدد ازواج کو ختم کر دینا چاہئے۔

مجھے ان دنوں تعجب ہوا تھا کہ یہ لکھنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ پہلے تو قانون تعداد ازدواج ایران ہی سے مخصوص نہیں۔ دوسرے یہ کہ موضوع سے مربوط و مفید بات تو یہ ہے کہ آیا نساوی کے قابل مرد، ان عورتوں سے زیادہ ہیں جو نساوی کے لائق ہیں، یا کم ہیں؟ فقط یہ کہنا کہ مردوں کی تعداد، عورتوں سے زیادہ ہے، زیرِ نظر مقصد کے لیے کافی نہیں ہے۔ ابھی دیکھا ہے کہ جمہوری کوریا اور دوسرے ممالک میں بھی مرد زیادہ ہیں۔

لیکن شادی کے قابل افراد کی نسبت سے مردم شماری کی رپورٹ دیکھی تو غورتور کی تعداد زیادہ نکلی۔ ایران جیسے ممالک کی مردم شماری کے قابل اعتبار نہ ہونے سے قطع نظر، مگر صرف ایران میں عورتوں کے رجحان پسزائی کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایرانی عورت مردم شماری کے آدمیوں کے جواب میں لڑکی پیدا ہونے کی جگہ، یہی کہیں گی کہ سن کے یہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اور وہ لڑکا ہی نکھوٹیں گی۔ یہی بات، مردم شماری کی رپورٹ سے اعتماد اٹھانے کے لیے کافی ہے۔ ملک میں ہر جگہ منگنیوں اور رشتہ مانگنے کی رسم بس کثرت سے ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے، کیونکہ تعداد ازواج کی رسم اس ملک کے شہروں اور دیہاتوں حتیٰ کہ قبائل میں بھی عام تھی اور اب بھی ہے کبھی کسی نے یہ محسوس نہیں کیا کہ یہاں خواتین کم ہیں۔ کبھی عورت کی بلیک مارکیٹ نہیں ہوئی، اس کے برعکس ہمیشہ رشتے کی خواہش کے جریچے عام رہے۔ لڑکیاں، بیوہ خواتین، یا کسی وجہ سے شادی سے محروم جوان عورتیں مجرد مردوں سے زیادہ موجود ہیں۔ بد صورت و غریب مرد بھی شادی کی طلب گاری کیے لکے ہیں تو ناکام نہیں ہوئے، مگر لڑکیوں کی صورت اس کے برعکس ہے اور بے چاری لڑکیاں مجبوراً بے شوہر کے رہ گئی ہیں۔ یہ بات اتنی عام اور ہر جگہ ہوتی ہے کہ ہر رپورٹ اور شماریا سے زیادہ یقینی ہے۔

”اٹھی لے نوٹینگلو“ نے ”زن جنس برتر“ میں ایک بے معنی بحث ”عورت کا آرٹسٹ بننا ہونا سماجی مطالبہ کا نتیجہ ہے“ اور اسی ضمن میں اس نے کہا — پوری دنیا میں ہمیشہ شادی کے قابل عورتوں کی تعداد زیادہ رہی ہے۔“

۱۵۔ مذکورہ کی مردم شماری سے نشاندہی ہوتی ہے کہ امریکہ میں شادی کے قابل عورتوں کی تعداد اندازاً دس لاکھ، تیس ہزار اور چار سو ہے، یہ تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔

روزنامه شماره ۶۹ و صفحه ۱۱۱

بریتنڈرس مے شادی و اخلاق پر جو کتاب لکھی ہے، اس میں بحث میں صفحہ ۱۱۵ پر لکھا ہے :-

”آج کے انگلستان میں بیس لاکھ سے زیادہ ایسی خواتین ہیں جو مردوں سے زیادہ ہیں اور روزمرہ کے مطابق ان کو ہمیشہ بے اولاد رہنا ہے۔ اور یہ ان کی بڑی محرومی ہے۔“ چند سال پہلے ایرانی اخبارات میں یہ خبر پڑھی تھی کہ جرمن میں جنگ عظیم دوم کے نتیجے میں بے شوہر عورتوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ قانونی شوہر اور گھریلو زندگی سے محرومی کے سبب ان عورتوں نے حکومت سے ”یک شوہری“ قانون کے خاتمے کا مطالبہ کیا تاکہ ایک شوہر کی کئی شادیاں کر سکے۔ حکومت نے اسلامی واشگاہ ”المازہر“ سے سرکاری طور پر کوئی فارمولہ طلب کیا۔ پھر ہم نے دریافت کیا تو اطلاع ملی کہ چرچ نے اس کی بڑی مخالفت کی۔ دراصل کلیسا کی نظر میں خواتین کی محرومی یا بدکاری کی فراوانی صرف اس لئے قابل قبول ہے کہ تعداد ازواج ایک مشرقی و اسلامی فارمولہ ہے اور اسے کسی حالت میں قبول نہ کرنا چاہئے۔

**شادی کے قابل عورتوں کی مردوں کے مقابلے میں عدلی کثرت کے علل و اسباب**

کی علت ہے؟ کیا وجہ ہے کہ لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں سے زیادہ ہونے کے باوجود

شادی کے لائق عورتیں مردوں سے زیادہ ہیں؟ اس کی علت دو وجہ ظاہر ہے۔ مردوں کی شرح اموات عورتوں کی شرح اموات سے زیادہ ہے۔ جانی نقصانات کا زمانہ عموماً وہ عمر ہے جب مرد شادی کے قابل ہوتا ہے یا اس کے قریب، ناگہانی حادثات پر غور کریں۔ اور حوادث پر نظر ڈالیں جنگ غرق۔ بلندیوں سے گرنا۔ عمارتوں میں دہنا۔ ٹکڑیاں اکیڈنٹ۔ جیسے حادثات جنس ذکور سے زیادہ متعلق ہوتے ہیں۔

بہت کم ایسے حادثات میں عورت دکھائی دیتی ہے۔ انسان کا انسان سے متعلقہ

یا انسان کا فطرت سے تصادم ہر جگہ نقصان مرد کو ہوتا ہے۔ فقط جنگ ہی کا مطالعہ کریں تو اول تاریخ بشریت سے آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں جب کسی نہ کسی عدلتے میں جنگ ہو اور مرد کو جانی نقصان نہ اٹھنا پڑیں۔ یہی بات مکمل جواب ہے کہ شادی کی عمر میں زن و مرد کا توازن کیوں باقی نہیں رہتا۔

صنعتی عہد میں جنگی نقصانات کا مناسب اس جنگ سے کئی سو گنا بڑے گیسے جوڑی اور شکاری دور میں ہوتی تھی۔ آخری دونوں غنیم جنگوں میں جنس ذکور کا جانی نقصان تقریباً سات کروڑ افراد تک پہنچا تھا۔ یہ تعداد کئی صدیوں پہلے بے شمار لڑائیوں کے برابر ہوگی اب ان آخری برسوں میں ہونے والی لڑائیوں ہی کو دیکھئے جو مشرق بعید، مشرق وسطیٰ، افریقہ میں ہو رہی ہیں۔ وہاں جو کچھ گذر رہا ہے اس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوگی۔ ویل ڈیورانت کہتا ہے :-

”تعداد ازواج کی رسم کے زوال میں چند عموماً کا دخل ہے۔ کاشتکاری کی زندگی جس میں سکون و قرار رہے، اس سے مردوں کی زندگی میں اضطراب و خفتار کم ہو گیا۔ اسی وجہ سے مرد و زن تقریباً مساوی ہو گئے۔“

ویل ڈیورانت کے قلم سے عجیب بات دیکھی، یعنی اگر مردوں کا جانی نقصان فقط فطرت سے ٹکرانے کی بنا پر تھا، جب تو شکاری زندگی اور کاشتکاری میں فرق تھا۔ کیونکہ جنس ذکور کا نمایاں اتلاف جنگ سے ہوتا ہے۔ اور یہ صورت کاشتکاری زندگی میں شکاری زندگی سے کم نہ تھا، دوسرے یہ کہ مرد، ہمیشہ عورت کو پی نگہداشت میں رکھتا رہا اور جان جو کھوں کے کام خود انجام دیتا رہا ہے، نابریں عہد کاشتکاری میں بھی اسی طرح غیر متوازن تھا، جیسے دور شکاری میں تھا۔

ویل ڈیورانت، مشینی دور کی بات صنعتی عہد کا نام نہیں لیتا، حالانکہ یہ عہد مردوں کی جان ضائع کرنے میں سب سے بڑھ کر ہے اور توازن کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے۔



## بیماریوں کے خواتین کی قوت مدافعت

مرد کے جانی اتلاف عورت کے جانی نقصان سے زیادہ ہونے، ایک سبب نئے علوم کی ترقی کے نتیجے میں دریافت ہوا ہے وہ موضوع یہ ہے کہ بیماریوں سے مرد کا مقابلہ عورت سے کمزور ہے۔ ہندو بیماریوں میں مرد زیادہ مرتے ہیں اور خواتین کم۔

دسی ماہ، ۱۹۵۶ء (۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء) کے روزنامہ اطلاعات (پہران) میں تھا: "ادارہ شماریات فرانس کے مطابق، فرانس میں لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں سے زیادہ ہونے، یعنی سو لڑکیوں کے مقابل ایک سو پانچ لڑکے پیدا ہوتے کے باوجود، عورتوں کی تعداد سترہ لاکھ پینسٹھ ہزار افراد مردوں سے زیادہ ہے۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ خواتین مردوں سے زیادہ بیماریوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔"

رسالہ سخن، جلد ۶، شمارہ ۱۱ میں ایک مقالہ چھپا ہے —

"زن درسیات و اجتماع" یہ مضمون، یونیسکو کے با تصویر ماہنامے کے ایک مقالے کا ترجمہ ہے، ڈاکٹر زہرا خانم نے "اشلی مونٹاک" سے نقل کیا ہے:

"عملی نقطہ نظر سے عورت کی فطرت مرد کی فطرت پر فوقیت رکھتی ہے۔

X کروموزوم (CHROMOSOME) جنس مادہ میں، کروموزوم ۲۲ جنس نہ

سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ اسی وجہ سے عورتوں کی عمر مردوں سے زیادہ

ہوتی ہے۔ خواتین کی اوسط عمر مردوں سے زیادہ ہے، عورت عام طور

پر مرد سے زیادہ تندرست ہوتی ہے، بہت سی بیماریاں وہ مردوں سے

زیادہ مقابلہ کر کے جیس جاتی ہے۔ علاج کا اثر بھی جلدی قبول کرتی ہے۔

عورت یک گونگی و مرد پانچ گونگی، رنگوں کی ایک نابینا عورت کے

مقابلے، رنگوں کے سولہ اندھے مرد، دیکھے گئے ہیں۔ نزوف الدم

"HAEMORRAGIA"، میمرج کی تکلیف، تقریباً مردوں کو ہی

ہوتی ہے۔ حادثات سے مقابلہ کرنے میں عورت زیادہ مضبوط ہے۔ آخری جنگ عظیم میں ہر جگہ دیکھا گیا ہے کہ ایک جیسے حالات میں، مرد سے بہتر عورتوں نے مقابلہ کیا ہے۔ محاصرہ۔ قید۔ قیدیوں کے ٹیمپ میں مردوں سے زیادہ..... قریب قریب ہر ملک میں مردوں کی خودکشی عورتوں سے گنتی ہے۔

.....

"زن جنس برتر" میں، اشلی مونٹاک کا نظریہ اس سے زیادہ واضح ہو رہا ہے۔ جناب مسام الدین امامی کا ترجمہ شمارہ ۱۱، رسالہ زن روز" میں چھپ چکا ہے۔

بیماریوں کا زیادہ دھیری سے مقابلہ کرنے کی نسوانی قوت کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے

کہ ایک دن مرد قوت حاصل کر کے عورت سے انتقام لے۔ اور اسے خطرناک و

بھاری کاموں میں لگا دے جس سے وہ موت سے دوچار ہو، خصوصاً اسے میدان

جنگ میں لے جا کر اس کے تن نازنین کو گولیوں کا لاش نہ بنوادے یوں اس کو ان کاموں

کا مزہ چکھائے۔ اس کے بعد بھی بیماریوں سے مقابلے کی قوت مدافعت کی وجہ سے جنس

زن و مرد کا توازن محفوظ نہ رہے گا۔

یہ سب باتیں، پہنی تمہید پہلے مقدمے سے متعلق تھیں، یعنی شادی کے قابل عورتوں

کی نسبت مردوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ واقعتاً، یہ بات حقیقت رکھتی ہے،

اور اس کی علت بھی واضح ہو گئی۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ علت یا اسباب آغاز تاریخ بشر

سے موجود تھے اور آج بھی ہیں۔

کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق

اور شادی کے قابل مردوں کی کمی سے طبقہ خواتین کا ایک حق پیدا ہوتا ہے۔ یہ حق

شادی شدہ عورت و مرد کے ذمے ہے:

نسب و حقوق میں عائلی زندگی کے فطری و حقیقی حق ہونے میں تو کوئی جاہل حرف زن نہیں ہے۔ زن و مرد میں سے ہر ایک کا عائلی زندگی بسر کرنا، ایک حق ہے۔ مرد بے بیوی، عورت بے شوہر و اولاد سے بہرہ ور ہونا ایسا ہی حق ہے جیسے مکان، تعلیم و علاج و معالجہ، امن و آزادی کے حقوق ہیں۔

سماج کو اس معاملے کی رکاوٹ ڈالنے کا حق نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان حقوق کو فراموش کرے۔

ہمارے نزدیک "منشور حقوق انسانی" میں ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں "حق شادی" پر دھیان نہیں دیا گیا ہے۔ حق آزادی حق امن مؤثر قومی عدالتوں رجوع کا حق، حق قومیت، حق ترک قومیت، ہر مذہب و قوم سے شادی کرنے کا حق، مالکیت کا حق، اتحادی اور سے بننے کا حق، سکون و راحت کا حق، تعلیم و پرورش کے حق، تو یاد رکھے ہیں۔ لیکن "عائلی زندگی کے حق کا تذکرہ چھوڑ دیا ہے۔ یعنی خاندانی مرکزیت بنانے کا حق اور اس کے قانون بات ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ حق عورت کی جہت سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ عورت کو مرد سے زیادہ گھریلو مرکزیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقالہ نمبر ۲ میں کہہ چکا ہوں، شادی، مرد کے لیے مادی لحاظ سے اور عورت کے واسطے جذباتی و نفسیاتی سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مرد اگر گھر کو چھوڑ دے تو عیاشی و بار بازی کے ذریعہ آدمی ضروریات پورے کر سکتا ہے۔ مگر خاندان اور گھر کی اہمیت عورت کے لیے ان باتوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ عورت اگر عائلی فضا کو بیٹھے تو عیاشی و بار بازی سے اپنے مادی و نفسیاتی ضروریات سے تھوڑا بہت بھی مطمئن نہیں ہو سکتی۔

عائلی زندگی کے حق کا مطلب مرد کے نزدیک ایک فطری خواہش کی آسودگی، ایک ہمسر، شریک زندگی اور یک دل ساتھی اور قانونی اولاد رکھنے کا حق ہے۔ لیکن عائلی

زندگی رکھنے کا مطلب عورت کی اصطلاح میں نام ہے۔ مذکورہ باتوں کے علاوہ ایک حامی و سرپرست رکھنے کا، جذبات کی حمایت رکھنے کا۔

ان دو تہیہوں و مقدمات کے اثبات کے بعد:

۱۔ عورتوں کا عدوی تناسب مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

۲۔ عائلی زندگی انسانی فطرت کا ایک حق ہے۔

نتیجہ۔ اگر ایک بیوی ہی کو شادی کی قانونی صورت دی جائے تو عورتوں کا بہت بڑا گروہ اپنے انسانی فطری حق "عائلی زندگی" سے محروم رہے گا۔ خاص شرائط کے ساتھ، تعدد ازواج کا قانون ہی اس فطری حق کا احیا کر سکتا ہے۔

روشن فکرمندان خواتین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حقیقی شخصیت کو پہچانیں۔ اور خواتین کے برحق حقوق، اخلاق، نسل بشر کی حمایت کے عنوان سے ان کے رب سے ہم فطری حق کے بارے میں، حقوق انسانی کے گیشن کو "یو این" اور "یو ایس" میں قرارداد پیش کریں، جس میں ان منطقی شرائط کے ساتھ تعدد ازواج کے جواز پر حقوق بشری میں سے ایک حق تسلیم کرنے پر زور دیا جائے، مطالبہ کریں کہ وہ اس تجویز کو قانونی طور پر تسلیم کرے۔ یہ خدمت خواتین اور اخلاق کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ فقط یہ بہانہ کہ مشرقی فارمولے کی اس مغرب پسندی کریں، کوئی گناہ کی بات تو نہیں ہے۔

ہم نے گذشتہ صفحات میں "برٹرینڈ راس" کے بارے میں اشارہ کیا ہے کہ موصوف اس نکتے کو دھیان میں رکھتے تھے کہ اگر

فقط "ایک بیوی" کے طریق کار کو قانونی حیثیت دی جائے، تو اس سے عورتوں کا ایک بڑا گروہ قانونی شادی سے محروم رہے گا۔ لہذا انھوں نے "او ایس نکالی، مگر کیا راہ حل؟ بڑی سادہ تجویز کہ اس قسم کی عورتوں کو اجازت دی جائے کہ وہ فرزند سے محروم نہ رہیں، وہ مردوں کا سکور کر کے بے پدر اولاد کو جنم دیں، اور حاملہ ہونے یا گود میں بچہ ہونے



کی حالت میں، ان کو مالی مدد کی جو ضرورت پیش آتی ہے اور عام طور پر ایک باپ جو نفقہ دیتا ہے، حکومت اس کی ذمہ دار بنے اور اس زاویے سے باپ کی جائشیں ہو کر ایسی عورتوں کی مدد کرے۔

اس کے بعد رسل نے کہا:

”آج کے انگلستان میں مردوں سے دو بیس لاکھ عورتیں زائد ہیں۔

رسم ”یک زوجہ“ کی وجہ سے یہ عورتیں ہمیشہ بے اولاد رہیں گی۔ یہ ان کی بڑی محرومی ہے۔“

پھر لکھتا ہے:

مکمل شادی ایک بیوی پر مبنی ہے مگر یہ قانون اس مفروضے پر ہے کہ زن و مرد میں تقریباً یکسانیت ہے۔ مگر جہاں برابری نہ ہو وہاں بڑی زیادتی (قساوت) ہوگی کہ ریاضی کلیے کے مطابق دوسرے افراد مجبور رہیں۔ پھر اگر ہم قوم میں افرادی کثرت کی ضرورت بھی محسوس کریں تو یہ طریق کار خصوصی قساوت و سخت دلی سے بڑھ کر عام صورت میں جائز قرار نہیں دی جاسکتی۔“

یہ تھا بیسویں صدی کے ایک فلسفی کا حال جو اس نے ایک معاشرتی مسئلے کی الجھن کے لئے پیش کیا، اور وہ تھا اس مشکل کا حل جو اسلام نے تجویز کیا۔ اسلام کہتا ہے — کہ یہ مشکل بول چال کر دے کہ ایک شخص جس میں مالی، اخلاقی اور جسمانی صلاحیتیں ہوں اور وہ ایک بیوی سے زیادہ بیویوں کی کفالت کر سکتا ہو تو وہ دوسری قانونی و شرعی بیوی قبول کرے، مگر پہلی بیوی اور اس کی اولاد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز روانہ رکھے۔ پہلی بیوی بھی ایک معاشرتی ذمہ دہ سمجھ کر اپنے حق اور اپنی فداکاری کے ذریعے شرکت کو تسلیم کرے، گویا ایک خاص قسم کا توسل و تسخیم جو سوسائٹیزم کے تمام اقسام میں سب سے اہم ہے، قبول کرے۔ مگر بیسویں صدی کا یہ فلسفی کہتا ہے: محروم عورتیں دوسروں کے شوہروں پر ڈاکہ ماریں

انہیں چرائیں، بے پردہ پنچے جنہیں اور حکومت سے کفالت حاصل کریں۔ بیسویں صدی کے اس فیلسوف کی نظر میں عورت کی ضرورت خانہ داری صرف تین زاویوں سے ہے۔

۱۔ جنسی زادیہ جو عیاری، دل ربائی کے ذریعے عورت حاصل کر سکتی ہے۔

۲۔ اولاد کے زاویہ سے بھی چوری، جس سے بچہ نکلتا ہے۔

۳۔ اقتصادی زاویہ سے، دولت ملنا چاہئے۔ اس فیلسوف کی نظر میں جس چیز کی ضرورت نہیں ہے وہ شوکھر مخلصانہ جذبات ہیں، اور اس کی یہ ضرورت کہ ایک مرد (شوہر) اسے اپنی حمایت کے دامن میں لے، اسے فقط منہسی نظر سے نہ دیکھے۔ اس فلسفی کے نزدیک ایک بات اور غیر اہم ہے اور وہ ہے نومولود کی حالت زار، یہ بچہ اس نے جنم لے۔ یہ بچہ اسے پریشان کرتا ہے۔ ہر بچہ، بلکہ ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے باپ اور اپنی ماں کے حوالے سے جانا پہچانا جائے، ہر بچہ چاہتا ہے کہ ماں باپ کی سچی محبت اور مامتا اپنے نحر بہ گواہ ہے کہ جس ماں کا بچہ کوئی معین باپ نہ رکھتا ہو، اس ماں کے دل میں اس بچے کی محبت کا چشمہ نہیں پھوٹتا جسے بچے کے باپ کی توجہ نصیب نہ ہو۔ وہ ایسے بچے سے بہت کم پیار کرتی ہے۔ محبت کی یہ کمی کہاں سے پوری کی جائے؟ کیا حکومت اس کمی کو چورا کر سکتی ہے؟

غالب رسل صاحب کو افسوس ہے، اگر ان کی تجویز سے قانونی شکل حاصل نہ کی جوت بہت سی بے شوہر عورتیں بے اولاد رہ جائیں گی۔ لیکن خود رسل صاحب بہتر جانتے ہیں کہ انگلستان کی بے شوہر عورتیں ایسے قانون کا انتظار نہیں کر سکتی تھیں انھوں نے عملی طور پر خود ہی تنہائی، بے شوہری و بے اولادی کا حل نکال لیا ہے۔

”دس لاکھ بیویوں میں ایک.....“

اخبار اطلاعات، تہران، ۲۵، ۲۸، ۲۹ (دسمبر ۱۹۵۹ء) میں ایک سرفنی تھی۔

۔ ”دس انگریزوں میں سے ایک حرام زادہ ہے“ ۔ نیچے تھا ۔ ”لندن، رائٹر،  
۶ دسمبر، فرسبی نیوز ایجنسی نے خبر دی ہے کہ ڈاکٹر زیڈ ۔ لے ۔ اسکاٹ، میڈیکل  
آفیسر لندن نے اپنی تیار کردہ رپورٹ میں خاطر نشان کیا ہے کہ گزشتہ سال لندن میں  
جونپے پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے ہر دس میں سے ایک ناجائز ہے ۔ ڈاکٹر اسکاٹ نے  
زور دیکر کہا ہے کہ ناجائز بچوں کی شرح پیدائش مسلسل بڑھ رہی ہے ۔ ۱۹۵۷ء میں ،  
۳۲۸۳۸ سے بڑھ کر ایک سال میں ۵۳۴۲۳ تک پہنچ گئی ہے۔“

انگریز قوم نے جناب ۔ س کی تجویز پر قانون بننے سے پہلے اپنا مسئلہ حل کر لیا ہے  
”تعدد ازواج ممنوع اور  
ہم جنس بازی کی اجازت“  
برعکس کام کیا اور بجائے بے شوہر عورتوں  
کی مشکل حل کرنے کے، اس کے مرد حریفوں  
کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا ۔ اسی طرح انھیں پہلے سے زیادہ محروم بنانے کی سعی کی حکومت  
نے ”ہم جنس بازی“ کا قانون منظور کر لیا، ۱۴/۴/۶۶ شمسی مطابق ۵/۴/۱۹۶۶ء  
کے اطلاعات نے خبر دی ۔

”لندن، برطانیہ کے دارالعوام نے آٹھ گھنٹے کی طویل بحث کے بعد ”ہم جنس بازی  
کے مسودہ قانون کی منظوری دیکر، قرارداد کا متن دارالامرا کو بھیج دیا۔“

۲۴/۴/۶۶ ہجری شمسی مطابق ۱۵/۴/۱۹۶۶ء یعنی دس روز بعد اطلاع دی  
ہو اس آف لارڈز نے اپنی دوسری نشست میں ”ہم جنس بازی“ کے مسودہ قانون  
کی منظوری دیدی ۔ اس مسودہ کو پہلے، انگلستان کا دارالعوام منظور کر چکا تھا ۔ اس کے  
بعد یہ قانون مکہ ازبجہ کے پاس جائے گا اور وہ بہت جلد دستخط کریں گی۔“  
موجودہ صورت حال یہ ہے کہ انگلستان میں تعدد ازواج ممنوع ہے لیکن ۔

”ہم جنس بازی“ صحیح ہے ۔

ان عوام کی نظر میں اگر ایک مرد اپنی بیوی کی ”سوت“ عورت سے آئے تو قانوناً  
درست نہیں ہے، اس نے غیر ذاتی کام کیا ۔ لیکن اگر وہی نوعیت عورت کے بجائے  
ٹرکے سے بدل جائے تو شرعیانہ، انسانی، اور بیسویں صدی کے مطابق کام ہوگا۔ دوسری  
لفظوں میں انگلستان کے ارباب حل و عقد کے نزدیک اگر شوہر کے گھر میں اس کی بیوی کا  
شریک خانہ ڈاڑھی موچھ والا ہو تو ”چند زواجی“ (چند ہسری) میں کوئی عیب نہیں ہے۔ یہ  
جو کہا جاتا ہے کہ یورپ نے جنسی اور گھربلو جھگڑے حل کر کے اب ہیں بھی اس سے فائدہ  
اٹھانا چاہئے ۔ تو انھوں نے یہ مسائل اس طرح حل کئے ہیں جیسے آپ دیکھ رہے ہیں ۔

یہ باتیں میرے لیے باعث تعجب نہیں ہیں ۔

تعجب و افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے عوام اپنی منقہ اپنے ہاتھ سے دبیٹھے  
ہمارے جوان، اور تعلیم یافتہ لوگ واقعات کے تجزیہ و تحلیل سے کیونکر ہاتھ دھو بیٹھے؟  
انھوں نے اپنی شخصیت کیوں گم کر دی ہے؟ ہاتھ کے قیمتی پتھر کو دنیا کی اس طرف کے  
لوگوں کے اخروٹ کہنے سے کیوں پھینک دیتے ہیں؟ کیوں بات مان لیتے ہیں ۔ اور اگر  
غیر کے ہاتھ میں اخروٹ ہو اور ان سے کہا جائے کہ یہ قیمتی جوہر تو اے کیوں مان لیتے  
ہیں؟



## کیا چند ازواجی مرد کی فطرت ہے؟

یقیناً آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ بورپ کے ماہرینِ نفسیات و فلاسفہ معاشرت کا نظریہ یہ ہے کہ مرد چند ازواجی فطرت سے کرپیدا ہوا ہے اور ایک ازواجی خلاف فطرت انسانی ہے۔ ویل ڈیورانت لذات فلسفہ میں صفحہ ۹۱ پر اس دور کی جنسی اخلاقی آوارگی پر تفصیلی بحث کے بعد لکھتا ہے:

”بلاشبہ ان میں سے بہت سی باتیں اصلاح ناپذیر ہیں اس کا سبب تنوع پسندی (ہر روز نئی چیز) اور فطرت ایک بیوی پر اکتفا نہیں کرتی۔“

”مرد، فطرت میں ذاتی طور پر چند ازواجی واقع ہوا ہے۔ ایک بیوی پر اسے پابند کرنے والی مضبوط چیز ہے، اخلاقی پابندیاں، سخت محنت اور غربت کا معین معیار اور پہلی بیوی کی سخت نگہداشت۔“

”زن روز“ کے شمارہ ۱۱۲ میں ایک مضمون تھا:

”کیا مرد فطرتاً خیانت کا رہے؟“

اس میں درج ہے کہ ایک جرمن پروفیسر آشمید (SCHMIDT) کہتا ہے:

”..... پوری تاریخ میں مرد ہمیشہ خیانت کا رہا ہے اور عورت خیانت میں اس کے پیچھے پیچھے، قرون وسطیٰ میں بھی مسلسل ایسے شواہد ملتے ہیں کہ نوے فی صد جوانوں نے بار بار رقیقہ حیات بدل لی ہے۔ اور پچاس فی صد مردوں

نے اپنی بیویوں سے خیانت کی ہے۔ رابرٹ کینسی (DR. ROBERT KINSEY) مشہور امریکی محقق تھا، اس نے ایک رپورٹ جو کینسی رپورٹ سے شہرت پائی، میں لکھا ہے: امریکہ کے زن و مرد نے بے دفاعی و خیانت میں تمام قوموں کے ہاتھ پتھ کے پیچھے باندھ رکھے ہیں۔ کینسی اپنی رپورٹ کے دوسرے حصے میں لکھتا ہے: عورت، مرد کے برخلاف، عشق و لذت میں تنوع جوئی (ہر روز نئی یاری) سے میزبان ہے، اسی وجہ سے بعض اوقات مرد کے روکتے نہیں جاتی۔ لیکن مرد تنوع کو ایک قسم کی مہم سمجھتا ہے اور سانی سے رستے کا تہ جہ ہے اس کی نظر میں ہم ترین چیز ہے جسمانی لذت اسے جذباتی لذت پسند، نہ روحانی سے۔ روحانی اور جذباتی باتوں کا فہم اس وقت تک رہتا ہے جب تک جسمانی چکا نہیں بیتا ایک ٹھوکر لگانے کے بعد کہتا ہے: مرد کا پالی گیمٹ (POLYGAMIST) ہونا، اور اس کی تنوع پسندی و تعدد خواہی اور عورت مونو گیمٹ (MONOGAMIST) ہونا، یعنی انحصار جنسی اور ایک پر اکتفا کرنے کا جذبہ صاف اور سامنے کی بات ہے۔ کیونکہ مرد میں ملینوں خیمے پر کے پیدا ہوتے ہیں (SPERMATOZOA) جب کہ عورت میں آمادگی کے وقت تخمدان (رحم) میں صرف ایک تخم (PREGNANT) ہی پیدا ہوتا ہے۔ کینسی کے مفروضے سے قطع نظر، ہم خود اپنی ذات سے پوچھیں، کیا مرد کے لیے وفاداری مشکل ہے؟

فرانسیسی، ہنری ڈی مونٹھرلان (HENRI DE MONTHERLAN) نے اس سوال کے جواب میں لکھا ہے:

”مرد کے لیے وفادار ہونا مشکل ہی نہیں، بلکہ غیر ممکن ہے۔ ایک عورت ایک مرد کے لیے پیدا ہوئی ہے اور ایک مرد، زندگی اور تمام عورتوں کے لئے۔ مرد اگر اندھیرے میں اڑتا اور اپنی بیوی سے خیانت کرتا ہے تو خود کوئی غلطی نہیں کرتا۔ کوتاہی اس کی خلقت و فطرت کی ہے جس نے اس کے اندر خیانت کو جنم دیا ہے۔“

اس رسالے کے شمارہ نمبر ۱۲۰ میں ایک مضمون ہے۔ ”فرانسیسی عشق اور شادی کا شاعر“

اس ذیل میں تحریر ہے :

”فرانسیسی میاں بیویوں نے، آپس میں ”بے وفائی کا مسئلہ“ حل کر لیا، انھوں نے اس بارے میں قاعدہ و قانون، حدود و حدود مان لئے ہیں۔ اگر شوہر اس قانون کی سرحد سے گئے برقعے تو اندھیرے کی طرف اس کی پیش قدمی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ عورت، ایک مرد، دو سال عائی زندگی بسر کرنے کے بعد وفادار رہ سکتا ہے؟ یقیناً نہیں رہ سکتا۔ یہ بات اس کی فطرت کے خلاف ہے لیکن خواتین کے معاملے میں ایک حد تک فرق ہوتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ اس فرق سے باخبر ہیں۔ فرانس میں اگر کوئی شوہر خیانت کرتا ہے تو اس کی بیوی ناراضگی محسوس نہیں کرتی، غصہ نہیں آتا، وہ اپنے دل کو سمجھاتی ہے۔ اس نے دوسری سے فقہ جسمانی لمس کیا ہے، روح اور جذبات اسے نہیں دیے، روح اور جذبات میری ملکیت ہیں۔“

چند برس پہلے، بیاجی کے پروفیسر ڈاکٹر رسل لی (DR RUSSELL LEE) اس بارے میں نظریہ ”ڈیٹامہ کیچن“ میں چھپا تھا اور ایرانی لکھنے والوں نے کچھ عرصے تک اس پر بحث جاری رکھی تھی۔ ڈاکٹر رسل لی کے نزدیک مرد کا ایک عودت پر قانع نہ ہونا، نسل خیانت کرنا ہے، فقط مقصد ہی نہیں کیفیت کے لحاظ سے بھی برا ہے۔ کیونکہ ایک عورت پر اس کا تسلط کرنے سے اس کی نسل کمزور ہوتی ہے۔ کئی بیویوں کی وجہ سے نسل قوی اور طاقت ور پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے خیال میں مرد کی فطرت کا یہ تعارف ہے کسی طرح صحیح نہیں ہے، ان مفروضوں کے نظریہ کی پیدوار ان کے معاشرتی، عوام کے سب سے مرد کی حقیقت فطرت ایسی نہیں ہے۔ ہم سرگزمدی نہیں ہیں کہ عودت و مرد بیاجی (زیست شناسی) کے زاویے سے مشابہ حیثیت کے مالک ہیں۔ ہم تو اس کے برعکس یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ زیست شناسی اور نفسیات

کے زاویے سے مرد و عودت میں فرق ہے۔ اس اختلاف میں تحقیق کا ایک مقصد ہے۔ اس بنا پر زن و مرد کے انسانی حقوق کی یکسانیت کو دونوں کے تمام حقوق کی اکائی قرار دینے کا بہانہ بنانا غلط ہے۔ ایک شوہر دز و صبر کی رسم میں بھی نفسیاتی اعتبار سے زن و مرد کے نفسیات ایک الگ الگ اور قطعاً مختلف ہوتے ہیں۔ عورت فطرتاً ایک شوہر پسند ہے، ”چند شوہری“ رسم اس کی نفسیات کے خلاف ہے، ایک شوہر سے بیوی کی زندگی بے انگ انگ مناسبت کی وابستگی کا ”چند شوہری“ نظام سے کوئی ربط نہیں۔ لیکن مرد ایک بیوی کی رسم سے صعباً ہم انگ نہیں ہے، بین معنی کہ چند ازواجی زندگی اس کے نفسیات سے اختلاف نہیں رکھتی۔ ہم اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں رکھتے کہ مرد کے نفسیات ایک بیوی کی رسم سے ہم انگ نہیں۔ ہم اس نظریے کے منکر ہیں کہ جو کہا گیا ہے کہ :

”مرد تنوع پسندی کا رجحان اصلاح ناپذیر ہے۔“

ہم اس رائے کے خلاف ہیں کہ :

”مرد کے لئے وفاداری ناممکن ہے۔ اور ایک بیوی ایک شوہر کے سے پیدا کی گئی ہے۔ اور ایک مرد تمام عورتوں کے لئے۔“

ہمارے خیال میں مرد کے اندر خیانت کاری، سماجی ماحول پیدا کرتا ہے، خلقت و فطرت کی دین نہیں ہے۔ مرد کی خیانت کاری کی ذمہ داری خلقت پر نہیں ہے۔ اس جواب دہ سماجی فضا اور ماحول ہے۔ خیانت کاری کے اسباب ماحول پیدا کرتا ہے یہ ماحول عورت کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ اغوا اور اجنبی مرد کو بے راہ کرنے میں ہر قسم کی عیاری استعمال کرے، ایک ہزار ایک میزنگ دکھائے اور اسے اپنی راہ پر لائے۔ دھڑلے قانون ازدواج کو ایک بیوی میں منحصر و محدود کر کے ہزاروں، لاکھوں، بلکہ بیسیوں شادی کے قابل عورتوں کو ازدواجی زندگی سے محروم کرتا ہے۔ پھر ان کو مرد کے غوا کرنے کی خاطر سماج میں دھیس دیتا ہے۔



مغربی آداب کے عام ہونے سے پہلے اسلامی مشرقی علاقوں میں نوے فی صد ایک بیوی ہی کا رواج تھا۔ نہ ایک شرعی بیوی کے علاوہ ان کے گھر میں کوئی اور ہوتی نہ یا بیوی محبوبہ سے عشق بازی ہوتی تھی۔ خصوصی روابط زن و شوہر اپنے تمام مفہوم و معنی کے ساتھ کثرت و عمومی طور پر مسلمان خاندانوں میں حکمران تھی۔

### پندرہویں نظام یک زوجہ نظام کی پابندی کا سبب

مشرق میں چند ازدواجی نظام ہی ایک زوجہ رسم کی قوت کا باعث و سبب ہوا۔ ہاں مقدونیوں رکھنے کی اجازت بہت بڑا سبب ہے کہ ایک زوجہ کی رسم پائدار ہو جائے، یعنی یعنی جن حالات میں تعدد زوجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ شادی کے قابل عورتیں شادی کے قابل مردوں سے زیادہ ہوں۔ اگر عورتوں کی اس تعداد کو قانونی تحفظ نہ دیا جائے، اور شرعاً اپوری کرنے والوں خدائی، مانی اور جسمانی صداقت رکھنے والوں کو کئی بیویاں رکھنے کا حق نہ دیا جائے تو یاری و معشوقہ بازی قدم بڑھا کر "ایک بیوی" کے نظام کو جڑوں سے خشک کرے۔

اسلامی مشرق میں، ایک صرف تعدد ازدواج کی اجازت اور دوسری طرف بیجان انگیز اور انگو کے محرکات موجود نہ تھے، لہذا ایک ازدواجی نظام اکثر خاندانوں پر حکومت کرتا تھا اور عشق بازی کا رواج بار بار تباہ تھا کہ اس کے لیے خاص فلسفہ وضع کیا جائے اور کہا جائے کہ مرد کی تخلیق کئی بیویوں کا تقاضا کرتی ہے اور ایک بیوی پر اکتفا کرنا مرد کے لیے ممالات و ناممکنات عالم ہے۔

ممکن ہے آپ سول کریں کہ ان دانشوروں کی رائے کے مطابق جو مرد کے لیے چند زوجہ کو مطابق فطرت بتاتے ہیں اور قانونوں معاشرت کے زوایے سے برا سمجھتے ہیں، مرد کی ذمہ داران و قانونوں کے مابین کیا ہے؟

ان حضرات کے دستان فکر میں مرد کی ذمہ داری واضح ہے۔ قانوناً ایک بیوی

عند چند بیویاں۔ ایک بیوی تو قانونی و شرعی ہونا چاہئے۔ اس کے بعد یار و محبوبہ و معشوقہ جنہی پہلے بنے، کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ان حضرات کی رائے میں یار بناتے، معشوقہ ساتھ رکھتے۔ کا حق مرد کو فطرت نے دیا ہے تو تسلیم نہ رہے اور قانونی ہے۔ ساری زندگی ایک بیوی کے ساتھ گذر کر ایک قسم کی زندگی

بہشت کی اصل صورت

میرا گمان ہے کہ اب وہ لمحہ آگیا ہے، جب ہمارے قارئین کرام توجہ کریں کہ انسان کے لیے "چند ازدواجی" کا جو مسئلہ زیر بحث تھا اور اب بھی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ایک بیوی کی رسم بہتر ہے یا چند بیویوں کی؟ ایک بیوی کی رسم کے اچھے ہونے میں تو کوئی تردید ہے ہی نہیں۔ ایک بیوی کے نظام کا مطلب ہے خاندانی لگاؤ، یعنی میاں بیوی کے جسم و جان ایک ہوں، ظاہر ہے کہ ازدواجی زندگی کی جان وحدت و یگانگت ہے۔ اور یہ بات انفرادی صورت ہی میں کامل و مکمل طور پر جلوہ گر ہو سکتی ہے۔ دراصل آدم زاد اس دور سے پر نہیں ہے کہ ایک بیوی کا نظام اختیار کرے یا کئی بیویوں کا مسئلہ تو یہ آن پڑے کہ سماجی ضرورتوں کے پیش نظر، خصوصاً شادی کے قابل لڑکیوں کی فراوانی ان مردوں سے جو شادی کے قابل ہوں، ایک بیوی کا نظام ملے طور پر خطرے میں ہے۔ فقط ایک بیوی کا نظام تمام خاندانوں میں نافذ ہو، ایک افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، دو میں سے ایک راستہ ہے۔

یا تعدد ازدواج کا قانون

یا معشوقہ بازی کا رواج

یوں کہیے کہ۔ یا۔ چند شادی شدہ افراد کئی بیویاں رکھیں، جن کی تعداد تقیباً دس فی صد سے زیادہ نہ ہوگی۔ اسی سے بے شوہر خواتین گھر بار بنا سکیں گی، زندگی کا کو کوئی سرسیر ہو سکے گا۔ یا پھر معشوقہ بازی کی زہیں کھول دی جائیں۔ چونکہ دوسری صورت میں ہر معشوقہ کئی مردوں سے تعلق پیدا کر لے گی لہذا تقریباً بیوی والوں کی

کثرتِ عقد چند بیویوں والے ہو جائیں گے۔

"کئی بیویوں کے جواز و عدم جواز کی بات یوں پیدا ہوتی ہے اور یہی صحیح اندازِ مسئلہ ہے مگر یورپی پروپیگنڈا کرتے والے حقیقت آشکار نہیں کرنا چاہتے یہ لوگ درجس معشوقہ بازی و یار بازی کے حامی ہیں، قانونی و شرعی بیوی کو بارہ دوش اور راستے کی رکاوٹ جانتے ہیں۔ یہ تو ایک بھی زندہ مانتے ہیں، دو، تین اور چار بیویوں کی تو بات ہی چھوڑئے۔ اصل لذت تو پابند ازدواج سے آزادی میں سمجھتے ہیں۔ مگر بات یوں کرتے ہیں کہ جیسے وہ "ایک بیوی کے نظام کے حامی ہیں۔ وہ بڑی معصومیت سے کہتے ہیں، ہم تو اس کے طرفدار ہیں کہ ایک شوہر ایک بیوی ہو، دونوں وفادار ہوں۔ کئی ہمسرے و ناہم نہیں مانتے۔

## بیسویں صدی کے مرد کی نیرنگیاں

بیسویں صدی کا مرد عائلی حقوق سے متعلق بے شمار مسائل میں الٹی جوتی مارنا چاہتا ہے۔ وہ مساوات و آزادی کے خوبصورت ناموں سے عورت کو بہلا کر اس کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کو کم کر کے، بے حساب انداز سے اپنے کام بنانے کی فکر میں رہتا ہے۔ مگر "تعددِ ازدواج" کے سوا بہت مسائل میں کامیاب ہو سکا ہے۔

بیسویں صدی کے مرد میں کبھی کبھی ایرانی مصنفین اور مضمون نگاروں کے یہاں ایسی چیزیں دیکھتا ہوں تو ایک شک سے دوچار ہو جاتا ہوں کہ یہ لوگ سادہ دل ہیں یا گرفتِ غفلت؟

"تعددِ ازدواج" کے بارے میں ایک صاحب لکھتے ہیں:

"آج کل ترقی یافتہ ملکوں میں باہمی ذمہ داریوں کی بنیاد پر میاں بیوی کے تعلقات استوار ہوتے ہیں، لہذا تعددِ ازدواج کی قانونی حیثیت ردائی نکاح ہو نا منطقی عورت کی طرف سے بھی ویسی ہی مشکل جیسے شوہر سے چاہیں کہ رقیبوں کو اپنی عائلی زندگی

میں برداشت کرے۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان حضرات ذہن میں واقعا صورتِ معاملہ یہی ہے یا جوتی مار رہے ہیں؟ (جس کی میں بات کچھ سے کچھ کہہ رہے ہیں)

کیا، واقعا ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ "تعددِ ازدواج" معشرتی مشکل کی وجہ سے ہے۔ اس مشکل کی ذمہ داری تمام شادی شدہ مرد و زن پر یک بوجھ کی صورت میں ہے اور اس کا سب سے اچھا حل "تعددِ ازدواج" ہی ہے؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ انھیں بند کر کے نعرے لگانا "ایک زوجہ" نظامِ زندہ باد۔ "کئی ازدواجی نظام مرد و بیواری کا علاج نہیں ہے؟

کیا انھیں نہیں معلوم کہ تعددِ ازدواج، عورت کے حقوق کا ایک حصہ ہے، مرد کا نہیں زن و مرد کے تقابلی حقوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔؟

مضمک خیر بات ہے، کہتے ہیں:

"تعددِ زوجات" عورت کی طرف سے اتنا ہی مشکل کام ہے، عورت بھی چاہتی ہے کہ ازدواجی زندگی کے دوران مرد بھی اپنے رقیبوں کو برداشت کرے۔ اس سے قطع نظر کہ دونوں باتوں کا قیاس غلط ہے۔ شاید، وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ آج کی دنیا میں کچھ حضرات نیا چیز کو آنکھ بند قبول کر لیتے ہیں اور ماجرے کی صحت میں کوئی شک و تردد صحیح نہیں سمجھتے۔ آج کی دنیا مرد سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی بیوی کے عشق کا احترام کرے اور حقیقتاً زن و شوہر کے ہوتے ہوئے اپنے رقیبوں کو سمجھے۔ آج کی دنیا "ناقابلِ برداشت" توں کو حسد، تعصب اور فینٹزم جیسے ناموں سے ٹھکراتی ہے۔ کاش ہمارے جوانوں کو یورپ اس کے ضمن میں ہونے والے واقعات کی تھوڑی سی بھی سگاہی ہو جاتی۔

oooooooooooo

تعددِ ازدواج مرد کی فطری مانگ نہیں، یہ سماج سے ابھرنے والی ایک ضرورت ہے۔



اگر کسی شہری سے دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ اگر کسی سماج میں شوہروں کی خوشنمندی  
نہ ہو تو بہت کم مردوں سے زیادہ نہ ہو جو ہمسروہ فیقہ حیات کے متلاشی ہوں تو کئی بیویوں  
کا دستور خود بخود یا تو بالکل ختم ہو جائے گا یا کمی آجائے گی۔ اور اگر ایسے حالات میں رکھ دین  
کیجئے، عورتیں عددی کثرت کی وجہ سے معاشرے سے خانہ آبادی چاہتی ہوں قانون تعدد و  
زواج ختم کر دیا جائے تو فقط یہ اقدام نہ کافی ہوگا نہ صحیح ہوگا۔ اس کے لیے کچھ اور اقدامات  
ضروری ہوں گے :

- ۱۔ عدت جنمٹی، ہر شخص کو روزگار مہیا کیا جائے، ہر شخص کی اتنی آمدنی رکھی جائے  
کہ جو شخص بھی شادی کی ضرورت محسوس کرے وہ گھریلو مرکز کی زندگی حاصل کر سکے۔
- ۲۔ عورتوں کو ارادہ و انتخاب کی آزادی دی جائے کہ وہ شوہر خود منتخب کر سکے۔  
باپ یا بھائی یا کسی ورشتے دار کو حق نہ ہو کہ وہ شادی شدہ، بیوی والے دولت مند  
مرد سے س عورت کو بیاہ دے، ظاہر ہے کہ عورت آزاد و خود مختار ہو، اور اپنے لئے ایک  
مجزو شوہر کو تلاش کر سکے تو وہ ہرگز یہ مرد کا انتخاب نہیں کرے گی جس کے گھر میں پہلے  
سے بیوی موجود ہو، اور یہ سوت بن کر اس کے سر پر سوار ہو۔ عورت کے سر پرستوں کا  
طریقہ ہے کہ پیسے کے لالچ میں، رزکی یا بہن کو بیوی والے مردوں کے ہاتھوں بیچ دیا کرتے ہیں۔
- ۳۔ ہیجان آفرین، اغوا اور خانہ خرابی کی تحریکیں اس فراوانی نہ ہونے دی جائیں جن کے  
دباؤ سے شوہر در بیویاں، شوہر کے گھر سے نکل کر اجنبی کے گھر نہ جانے پائیں۔ بن بیاہی  
بے شوہر عورتوں کا تو کم نہیں کیا ہے۔

معاشرہ اگر واقفاً اصلاح احوال چاہتا ہے اور "ایک بیوی" ہی کا نظام پسند کرتا  
ہے تو مذکورہ تینوں اسباب و عوامل کو بروئے کار لائے۔ ورنہ تعدد ازدواج کے  
دستور پر پابندی لگانے سے صرف عیاشی کی راہیں ہی کھل سکیں گی اور کوئی فائدہ  
نہ ہوگا۔

## بے شوہر خواتین کی محرومی سے پیدا ہونے والا بحران

جس صورت میں مردوں کی طلب گار عورتوں کی  
فراوانی ہو اور ضرورت مندان ازدواج مرد کم ہوں  
تو اس حالت میں تعدد ازدواج پر پابندی لگانا  
انسانیت سے خیانت ہے۔ کیونکہ اس سے فقط حقوق خواتین ہی پامال نہیں ہوتے، اگر چند  
عورتوں کا حق تلف ہوتا تو شاید اسے برداشت کر لیتا تا بسندہ تو وہ بحرآن ہے جو اس  
اقدام کے بعد معاشرے میں سر ٹھکانے گا اور وہ بحرآن ہر چیز سے زیادہ خطرناک ہوگا جبکہ  
بان بچوں کا گھر ہر مرکز سے زیادہ متاثر ہوگا۔

چونکہ جو اپنے فطری حق سے محروم ہوتا ہے وہ ایک موجود زندہ ہے۔ ایک موجود زندہ  
اپنے تمام علامات کے ساتھ جو محرومی و ناکامی میں رد عمل دکھاتا ہے کیونکہ وہ انسان ہے۔  
روحانی و نفسیاتی الجھنوں کی ناکامیوں کے تمام حالات میں عورت ہے۔ زنانہ میسرگوں  
کے ساتھ حوا کی بیٹی ہے، "آدم فریبی" کی مکمل دست ریس کے ساتھ۔

وہ جو اور گھریلو نہیں ہے کہ استدلال سے بچے تو سمجھ دے پھینک دیں، یہ "قحط  
سانی" کے ڈر سے گودام میں رکھ دیں۔ وہ گھر اور کمرہ نہیں کہ ضرورت نہ ہو تو قفل ڈال دیں  
یاں، وہ ایک زندہ موجود ہے، ایک انسان ہے، ایک عورت ہے، وہ اپنی خیرگیز  
قوت کا مظاہرہ کرے گی اور معاشرے کے چھتے چھڑا دے گی۔ وہ برآمد کیے گی :

نخن در دست بگویم نمی توانم دید  
کمی خورند حریفان و من نظاره کنم

ز غائبے اس کا مفہوم یوں ادا کیا ہے :

غیر میں محفل میں بوسے جام کے

ہم رہیں یوں تشنگان بنیام کے

یہی "نمی توانم دید" میں نہیں دیکھ سکتی، بہت کام کرے گی، گھر اور خاندان ویران کرے گی۔

دشمنوں اور کینے پیا ہوں گے، وہ دن ان کے لیے کس قدر تباہ کن ہوگا جب سانی جنت و فیہی گرجیں آپس میں متحد ہو جائیں۔

گھر سے محروم خواتین، اس مرد کو اغوا کرنے کی کوشش کریں گی جس کے قدم نہیں بھی اتنی جلدی نہیں پھسنے جتنی جلدی یہاں بڑھکھڑاتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ جب بھلسن زیادہ ہوتی ہے تو ہاتھی پھس جاتے ہیں (چوگن بسیار شد پیلان بلغند) افسوس تو یہ ہے کہ پھسنے لگے تھوڑی بھی ہوتو اس ہاتھی کے پھسنے کے لیے کافی ہے۔

پھر کیا بات ہیں ختم ہو جائے گی؟ نہیں۔ گھر بار والیوں کی باری اس کے بعد آئی گی، وہ بیویاں جو اپنے شوہروں کو خیانت کرتے دیکھیں گی وہ انتقام و خیانت کے لیے آگے آئیں گی، وہ بھی شوہر کی خیانت کا پیچھا کریں گی۔ آخری نتیجہ کیا ہوگا۔؟  
اس کا آخری نتیجہ "کنیسی کی رپورٹ" میں درج ہے، اور وہ بھی ایک جگہ

میں:

"امریکہ کے مرد و عورت، فساد و کج روی و خیانت میں اقوام عام کے ہاتھ پست پر باندھ چکے ہیں۔"

ملاحظہ فرمائیے کہ فقط مرد کی کج روی اور فساد ہی پر قصہ تمام نہیں ہوتا، اس آگ کا شعہ خانہ نشین، باں بچوں والیوں کے دامن تک پہنچا ہے۔

**عورتوں کی فراوانی میں مختلف رد عمل -** ان کی زندگی میں عورتوں کی عددی افزائش ہمیشہ

ہی ہے، اس کی وجہ سے اصل چیز اس کے رد عمل ہیں، جو معاشرے میں کبھی ایک جیسے نہیں رہے جن قوموں کے مزاج تقویٰ اور پاک دامن ہی سب وابستہ رہے وہ بڑے بڑے سسانی دیاں کے وسیلے سے اس مشکل کو تعدد ازواج کے طور پر حل کرتی رہیں جن قوموں کا مزاج خوف خدا اور پاک دامن سے زیادہ ساڑ گرجا

نہوں نے اس مشکل کا حل عیاشی سے نکالا۔

"تعدد ازواج" نہ مشرق میں اسدم کی پیداوار ہے نہ اس کے چھوڑنے میں یورپ کے دین مسیحی کا کوئی ہاتھ ہے، مشرق میں یہ دستور سدھ سے پہلے بھی تھا، یہاں کے مذاہب نے اس کی اجازت دی تھی، خود اصل دین مسیح میں بھی اس کی ممانعت پر کوئی صریح حکم موجود نہیں۔ والوں جو کچھ ہے وہ خود مغربی اقوام کے رسم و رواج کی بنا پر ہے، دین مسیح کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

جن قوموں نے عیاشی کا رویہ اپنا یا ہے وہ ان قوموں سے زیادہ ہیں جن کا رویہ تعدد ازواج ہے اور انھوں نے "یک مہری" پر مضبوط چوٹ لگائی ہے۔  
ڈاکٹر محمد حسین سیکل، مصنف "زندگانی محمد" تعدد ازواج کے بارے میں قرآن مجید کی آیتیں لکھنے کے بعد کہتے ہیں:

"یہ آیتیں ایک بیوی پر اکتفا کرنے کو بہتر قرار دیتی ہیں، اور ان کا مطلب ہے کہ اگر تم ڈرتے ہو کہ عدل کا رویہ نہ رکھ سکو گے تو بس ایک بیوی کرو۔ فوراً ہی امر کیا ہے کہ تم انصاف نہ رکھ سکو گے۔ اس صورت حال کے باوجود ممکن ہے کہ معاشرتی زندگی میں ایسے حادثے پیش آجائیں کہ تعدد ازواج کی ضرورت پڑے تو بشرط عدالت اس کو جائز بھی قرار دیا ہے۔"

جنگ کے دنوں میں جب مسلمانوں کے گروہ شہادت حاصل کر گئے تھے اور فطرتاً ہی وہ عورتیں رہ جاتی تھیں، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی دستور دیا تھا کہ یہ واقعی عورت پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم ایسے اور وباد اور شور شوں کے بعد جن میں مینوں مرد جاک موتے ہیں اور بے شمار عورتیں بے شوہر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت بھی چند بیویاں کے بجائے ایک بیوی پر اکتفا کرنا بہتر ہے؟ جب کہ چند



یہودیوں کی اجازت، عدل و انصاف کے رویتے کے ساتھ دی گئی ہے

اور بطور استثناء ہے؟

کیا یورپ کے عوام دعویٰ کر سکتے ہیں کہ جنگ عظیم کے بعد ایک یو  
پرائٹ کا قانون جس طرح موجود تھا، عملاً بھی اسی طرح نافذ تھا؟

## چند ازواجی کے مشکلات و عینو

خوشی - سعادت - برکت - خوش حالی - خلوص - درگزر - جان نثاری -  
ومدت و یگانگت، غرض سب کچھ ایک گھروں میں ایک میاں کو نصیب ہوتا ہے -  
چند ازواجی زندگی میں یہ سب باتیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں -

دو مائیں رکھنے والے بچوں کی تباہ حالی سے قطع نظر، خود شوہر کی ذمے داریاں  
کئی بیویوں کے ساتھ اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ وہ ان میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ہے - ان مشکلات  
کا سامنا دراصل مسرت و آسودگی کو پس پشت ڈالنے کی برابری ہے -

تعدد ازواج سے خوش و مطمئن لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو عیسیٰ  
طوبہ پر اپنی شرعی و اخلاقی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے - ایک بیوی سے زیادہ محبت  
کرتے اور دوسری کو نظر انداز کر دیتے ہیں - قرآن مجید اس بد نصیب کی تعبیر کا معلقہ  
سے کرتا ہے، شوہر سے ہوا میں معلق چھوڑ دیتے ہیں - اس قسم کے لوگ جب تعدد ازواج  
کا نام لیتے ہیں تو دراصل ان کا مقصد "ایک بیوی" ہوتی ہے، ضمیمہ ظلم و ستم، جرم و بیداد  
گزی -

ایک بازاری محاورہ لوگوں کی زبان پر ہے: "ایک خدا ایک بیوی" -  
اکثر لوگوں کا خیال یہی تھا اور اب بھی یہی ہے - اور حقیقت میں اگر خوشی و مسرت  
کو معیار سمجھا جائے اور مسے کا انفرادی اور شخصی زاویہ سے جائزہ لیں تو یہ خیال  
بالکل ٹھیک ہے - ممکن ہے سب شوہروں کے بارے میں صحیح نہ ہو، اکثریت کے لیے تو

بہر حال ٹھیک ہے۔

اگر کوئی شوہر تمام شرمی و اخلاقی ذمہ داریاں قبول کرنے کے بعد بھی تعدد ازواج کو اپنے لیے مفید سمجھتا، اور تن آسانی چاہتا ہے تو یقیناً اسے بڑی غلط فہمی ہے "ایک بیوی" خوشیوں اور راحتوں کی ضمانت کے لحاظ سے "کئی بیویوں" پر بہر حال اور مستحکم طور پر بہتر و برتر ہے۔ لیکن.....

**تحقیق کا صحیح راستہ** | تعدد ازواج جیسے مسائل کے صحیح اور غلط ہونے کی چھان بین کا طریقہ صحیح نہیں ہے، یہ مسئلہ شخصی اور سماجی مسئلہ ہے۔ اس کا قیاس "ایک بیوی" کے مسئلہ سے غلط ہے۔

اس قسم کے مسائل کا حل اس بات سے وابستہ ہے کہ ایک طرف تو ہم ایسے عمل و سبب کو دیکھیں جن سے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ غور کریں کہ ان سببے تو جہی کے خطرناک نتائج کیا ہیں۔ دوسری طرف اس پر دھیان دیں کہ خود اس مسئلے یا مسائل سے کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر دونوں زاویوں سے جو آثار و نتائج سامنے آئیں ان کا جائزہ لیں۔ ان مسائل پر گفتگو اور ان کے واقعی حل کا تنہا ہی ایک راستہ ہے، جس سے تحقیق کرنا چاہیے۔ وضاحت کے لیے ایک مثال:

فرز کریں۔ جبری فوجی بھرتی کی رائے ہے۔ اگر اس مسئلے کو فقط نفع اور جس گھر سے اس سپاہی کا تعلق ہے اس خاندان کے رجحانات کے زاویے سے دیکھیں تو قانون کا یہ اقدام اچھا نہیں۔ کس قدر اچھا ہوتا اگر سپاہی بھرتی ہونے کا یہ قانون نہ ہوتا اور خاندان کا محبوب فرزند ان کی گود سے دور نہ ہوتا، میدان جنگ میں جا کر خاک و خون میں نہ نہاتا۔

لیکن مسئلے کی تحقیق کا یہ صحیح انداز نہیں ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی خاندان سے ایک جوان بیٹے کا جدا ہونا، نیز ممکن حد تک گھر والوں کے لئے غم نصیبی کو سامنے رکھنے کے

بعد ملک کے دفاع میں سپاہیوں کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے بدترین نتائج پر غور کریں، پھر منطقی اور معقول بات معلوم ہوگی کہ فرزند ان وطن کا ایک گروہ سپاہی کے نام سے ملک اور ملت پر جان نثاری کے لیے موجود ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے سے خاندان کو رنج برداشت کرنا چاہئے۔

ہم نے گذشتہ مقالات میں شخصی اور سماجی ضرورتوں کو تعدد ازواج کی وجہ جواز بتایا ہے۔ اب ہم تعدد ازواج سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ اس طرح ایک مجموعی حساب کا راستہ ہموار ہو سکے گا۔ نیز اسی سلسلے میں یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہم تعدد ازواج کی خرابیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے اعتراضات تسلیم بھی نہیں کرتے جیسا کہ عنقریب عیاں ہوگا۔ تعدد ازواج کی بہت سی خرابیاں بیاں ہو سکتی ہیں اور ہم مختلف پہلوؤں سے بحث شروع کر رہے ہیں۔ ان اعتراضات اور خرابیوں کا بیان یہ ہے:

**روحانی زاویہ نظر** | زن و شوہر کا رشتہ فقط مادی و جسمانی ہی نہیں ہے، یہی نہیں کہ یہ تعلق بدنی لمس اور مالی امداد کا ہو۔ اگر یہی بات ہوتی تو کئی بیویوں کا نظام ایک تاویل رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ مادی و جسمانی معاملات کو متعدد افراد میں تقسیم کیا جاسکتا تھا اور ہر ایک کا ایک حصہ ہوتا۔

میاں بیوی کے رشتے میں سب سے عمدہ اور اساسی بات روحانی اور حقیقی معاملات ہیں۔ عشق وہ جذبہ ہے — شادی کی مرکزیت دو دلوں کو جھوڑنے کا سبب ہے۔ ہر اندرونی حسن کی طرح عشق و احساسات قابل تجزیہ و تقسیم نہیں ہیں۔ انھیں توڑ پھوڑ کر ڈیسیریاں لگا کر آدمیوں میں بانٹا نہیں جاسکتا۔ بھلا ممکن ہے کہ دل کے دو کمرے کر دے جائیں یا ایک دل دو جگہ رہن رکھا جاسکتا ہے؟ کیا ایک دل دو آدمیوں



کو دین ممکن ہے؟ عشق و پرستش کی جڑی چاہتی ہے، اس میں شریک و رقیب کی گنجائش نہیں ہے۔ گندم اور جو نہیں کہ پیانے میں ناپ ناپ کہ ہر ایک کو اس کا حصہ دیا جاسکے۔ اس کے جذبات کنٹرول میں نہیں آسکتے، لہذا روح ازدواج اور ان کی پہلو، دو انسانوں کا تعلق، دو جانوروں کی طرح فقط شہوت اور خستہ نہیں ہے۔ یہ تعلق ناقابل تقسیم ہے، ناقابل انضباط۔ لہذا تعدد ازواج بری چیز ہے۔

ہمارے خیال میں، اس گفتگو میں کچھ زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ ٹھیک سے شادی کی روح جذبات و احساسات ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ قلبی احساسات آدمی کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ مگر — جذبات و احساسات قابل تقسیم نہیں — یہ شاعرانہ تخیل ہے، یہ مغالطہ ہے۔ اس میں تو بحث نہیں کہ خاص احساسات کسی حصہ جسم کے مانند دو نہیں کئے جاسکتے اور ہر شخص کو اس کا حصہ نہیں دیا جاسکتا۔ جس پر یہ نتیجہ چھپا ہوا کہ روحانی و نفسیاتی امور بھی قابل تقسیم نہیں ہیں۔ بحث روح بشر کی گنجائش میں ہے، جسے شدہ بات ہے کہ آدمی کی روح میں اتنی تنگی نہیں ہے کہ دو رشتے اس میں نہ سما سکیں۔ ایک باپ دس بیٹوں کو پرستش کی حد تک محبوب رکھتا ہے۔ ہر ایک پر جان بھی قربان کر لے۔

ہاں، ایک بات ضرور ہے کہ کثرت کی وجہ سے محبت وہ عروج نہیں پاتی جو وحدت کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ عشق و جذبات کی آخری معراج کثرت سے جوڑ نہیں کھاتی۔ اور عشق کی عقل و منطق بھی اس سے ہم آہنگ نہیں۔

”رسل“ نے شادی اور اخلاق پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

”بہت افراد، آج کل عشق کو احساسات و جذبات کا منصفانہ تبادلہ جانتے ہیں۔ تعدد ازواج کو مسترد کرنے کے لیے دوسری دلیلوں کو چھوڑ کر ہی دلیل کافی ہے۔“

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ ”جذبات کی منصفانہ تقسیم کی جائے، تو دلیل اسی میں منحصر کیوں ہے؟ آخر باپ، اپنی تمام اولاد سے محبت نہیں کرتا، اور وہ سب باپ کو نہیں چاہتے؟ یہاں، جذبات کا منصفانہ تبادلہ نہیں ہوتا؟ اتفاق دیکھئے کہ والد کی تعداد کافی ہو، باپ کا رشتہ الفت ہر ایک سے ایسا ہوتا ہے کہ اولاد کے فرداً فرداً جذبہ الفت پر غالب آتا ہے۔

حیرت ہے۔ بات وہ کر رہا ہے، جو ہمیشہ شوہروں کو سمجھاتا ہے کہ بیوی کے عشق کو بیگانہ عورت کے مقابلے میں قابل احترام سمجھیں اور ان کے غیر سے معافیت کو نہ روکیں، پھر بیویوں کو بھی یہی نصیحت کرتا ہے — کیا واقعتاً، رسل کے نزدیک میاں بیوی کے جذبات کا منصفانہ تبادلہ ہو سکتا ہے؟

سوت کا وجود، نا اتفاقی کا مشہور ذریعہ ہے۔ بیوی کی نظر میں سوت بڑا دشمن کوئی نہیں۔ ”تعدد ازواج“ کی نظر میں سوت بڑا دشمن کوئی نہیں۔ بلکہ میدان جنگ میں لڑنے کا ایک طریقہ ہے۔ ایک بیوی بچے والے گھر کو خلوص اور محبت کی کھنڈک سے پرکھ کر ہونا چاہئے۔ ماؤں کی دشمنیاں اور انتقام طلبی کی دھمکی آگ بچوں میں دوڑ جاتی ہے، دو، دو۔ تین، تین گروہ بن جاتے ہیں۔ گھر کا ماحول جیسے بچوں کا پہلا مدرسہ تعلیم و تربیت روح ہونا چاہئے، جہاں نیکی و رحم و محبت کا سبق سنا جاتا ہے وہاں نفاق اور غیر شریفانہ باتیں سکھائی جانے لگتی ہیں۔

تعدد ازواج سے اس قسم کے نامناسب تربیتی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے، لیکن ایک بات یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ نتائج کتنے تعدد ازواج کے غیر سے پیدا ہوتے ہیں اور کتنے اس کج روی کی وجہ سے جنم لیتے ہیں جو میاں اور دوسری بیوی کے رویے میں آجاتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بے چینی

سب کی سب تعداد ازواج کے خمیر کی پیدا کردہ نہیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر باہمی دونوں کی پیداوار ہیں۔

ایک میاں بیوی باہم زندگی بسر کرتے ہیں، دونوں کی زندگی اپنی اپنی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔ اسی اثنا میں، مرد ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر دوسری عورت پر فریفتہ ہو جاتا ہے، اس کے دماغ میں چند ہم سری کا سودا سما جاتا ہے، وہ خفیہ طور پر قول و قرار کر لیتا ہے۔ ناگہاں دوسری بیوی آسمان سے آنے والی موت بن کر پہلی بیوی کے آتش یا گھر میں نازل ہو جاتی ہے۔ اس کے شوہر اور خود اس کے ساتھ رفیق و شفیق بن بیٹھتی ہے اس کی زندگی پر شبخوں مارتی ہے۔ صاف سی بات ہے کہ اس پہلی بیوی کا ردِ مسلسل کینہ و انتقام کے علاوہ اور کیا ہو۔ بیوی کے لیے سب سے زیادہ پریشاں کن بات یہ ہے کہ اس کا شوہر اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ عورت کی سب سے بڑی شکست یہ ہے کہ یہ سمجھے کہ میں اپنے شوہر کا دل نہ بچا سکی۔ اب وہ کسی اور کو دوست بنا رہے ہیں جب مرد، خود سری و ہوس رانی کی راہ غلط پر آتا اور دوسری بیوی شب خون کرنے لگتی ہے۔ تو پھر پہلی بیوی سے محسوس ویرانگی کی توقع فضول ہے۔

ہاں، اگر پہلی بیوی کو شوہر کے اس عمل کی وجہ جواز معلوم ہو، مثلاً وہ سیر نہیں ہوا اور تعداد ازواج سے وہ اسے پیٹھ نہیں دکھانا چاہتا۔ مرد بھی اپنی ہوس رانی کا غلط راستہ اور خود سری چھوڑ دے۔ پہلی بیوی کے ساتھ جذبات و احترامات کا رشتہ برقرار رکھے، دوسری بھی دھیان رکھے کہ پہلی کے حقوق ہیں۔ وہ حقوق قابل احترام بھی ہیں ان پر دست درازی جائز نہیں ہے۔ خصوصاً، سب مل کر ایک سماجی مشکل کو حل کرنے کی فکر میں رہیں، تو یقیناً، اندرونی بے چنیاں کم ہو جائیں گی۔

قانون تعداد ازواج، سماجی مشکل کا ایک ترقی پسندانہ حل ہے۔ اس قانون کو نافذ کرنے والے کو بھی ذرا اونچی سطح سے دیکھنا چاہیے۔ اسے اعلیٰ درجے کی اسلامی تربیت

سے آراستہ ہونے کی ضرورت ہے۔

تجربہ نے بتایا ہے۔ جب اور جہاں مرد نے خود سری و ہوس رانی کے غلط رویے سے دامن بچایا اور بیوی نے واقفاً محسوس کیا کہ اس کے شوہر کو دوسری بیوی کی ضرورت تو وہ خود آگے بڑھی اور دوسری بیوی کو اپنے شوہر کے گھر میں رانی ہے اور مذکورہ بالا برائیوں میں سے کوئی بھی برائی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اکثر بے چنیوں کا سبب مرد کا وہ غیر انسانی رویہ ہوتا ہے جو وہ اس قانون کے اجرا میں اختیار کرتا ہے۔

**اخلاقی زاویہ نظر** | کہتے ہیں تعداد ازواج کی اجازت، گھٹیا حرم کی اجازت دی گئی ہے۔ اخلاق کا تقاضا ہے کہ ان اپنی شہوت کو ممکن حد تک کم کر کے کرتا جائے کیونکہ آدمی کا مزاج ایسا ہے کہ جس قدر شہوت کے راستے کھلے رکھے گا اس کی رغبت اور اس کا شوق بڑھتا جائے گا، ہوس کی آگ بڑھ سکتی جائے گی۔

مان ٹسکونے "روح القوانين" ص ۱۲ پر، کئی بیٹوں پر یہ رائے دی ہے: "شاہ مراکش کے حرم میں سفید و زرد و سیاہ پوت، ہرسل و قوم کی عورتیں ہیں۔ یہ شخص اگر ان سے دو گنی عورتیں بھی ماس کر لے، جب بھی ایک نئی نویلی دلہن کا طلب گار رہے گا۔ کیونکہ ہوس پرستی، خست کی طرح بڑھنے والی چیز ہے۔ دولت جس قدر بڑھتی جائے .... تعداد ازواج گھٹیا درجے کی عشق بازی ہے اور صاف فطرت (ہم جنس بازی) کو بھی تجربے میں لاتی اور معاشرے میں پھیلاتی ہے۔ شہوت رانی کی راہ میں جو عمل بھی حد سے باہر ہوگا، مزید بے قاعدگی کا سبب بنے گا جبکہ سد مبول میں شورش ہوئی تو اس وقت بادشاہ کے محسوس میں ایک بیوی بھی نہ تھی حکمران صاحب خلاف فطرت عشق بازی میں دن رات گزار رہے تھے۔"



یہ اعتراض دو پہلوؤں سے بحث و نظر کا طالب ہے۔  
۱۔ پاکیزگی اخلاق، افعال شہوت کے خلاف ہے، پاکیزگی نفس کے لیے بہت  
کو کم سے کم ترکیب جائے۔

۲۔ انسانی نفسیات کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی جس قدر فطرت کے ساتھ چلے گا  
کشرشی بڑھتی جائے گی اور جس قدر اس کی مخالفت کرے گا۔ اسی قدر اس میں ٹھہر جائے گا۔  
پہلا زاویہ، افسوس ہے کہ یہ ایک غلط تعلیم ہے اور اس سبب پر قائم ہے جس کی  
اساس ”ریاضت“ ہے، اس مندو، بدھ اور... جیسے نظریات و مذاہب کی  
اسی پر چھاپ ہے، اسلامی اخلاق کی اساس کچھ اور ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے یہ نہیں کہ شہوت  
کو جس قدر کم کیا جائے اخلاق سے زیادہ قریب ہے۔ اور اگر صرف پرہیز گار ہو جائے تو سونی  
اخلاقی ہے۔ اسدم کی نظریں شہوت رانی میں افراط اصول اخلاق کے خلاف ہے۔  
تعددا زواج، افراطی عمل ہے، یا نہیں؟ تو یہ دیکھیں کہ فطرت نے مرد کے لیے  
”یکہم سری“ ہی رکھی ہے اور چندہم سری کو انحرافی و افراطی عمل قرار دیا ہے۔

ایکس ویس ۳۱، مقالے میں معلوم ہوا کہ آجکل شاید کوئی بھی پیدائہ ہو جائے جو مرد  
کی فطرت کی ”یکہم سری“ کا قائل ہو اور چندہم سری کو خلاف فطرت ماننا ہو بلکہ اس کے  
برعکس بعض کی رائے یہ ہے کہ مرد کی فطرت چندہم سری سے زیادہ مناسب اور ایکہم سری  
مجرد کی صرح خلاف فطرت ہے۔ ہم اس نظریے کے اگرچہ مخالف ہیں لیکن مرد کی فطرت  
یکہم سری کے قائل بھی نہیں۔

مان شکو کی طرح جن لوگوں نے تعددا زواج کو شہوت پرستی کے ہم پلہ  
مانا ہے ان کی نظر حرم سرا باذی خلفاء بنی عباس و بنی عثمان پر ہے۔ اسلام، سب سے  
آگے اور سب سے زیادہ اس کردار کے خلاف ہے۔ اسلام نے تعددا زواج پر جو  
حد و قید لگائی ہے اس سے ہوس رانی و آزادی مرد کا خاتمہ ہو جانا ہے۔

بحث کا دوسرا تمہیدی پہلو ”آدمی کی طبیعت جس قدر راضی رکھی جائے اتنی  
بیشکس ہوتی جاتی ہے اور جس قدر مخالفت کی جائے اسی قدر کھڑی رہتی ہے۔“  
یہ نظریہ بالکل فرائیڈ کے نظریے کے مقابلے میں ہے کہ آج بھی فرائیڈ کے ماننے والے  
اس کا پرچہ پگینڈا کرتے رہتے ہیں۔

فرائیڈ لازم و نالے کہتے ہیں۔ طبیعت کو جس قدر مطمئن کیا جائے، سکون و قننا  
دیا جائے اتنا ہی منہ زور ہوتی ہے، کشرشی دکھاتی ہے، ”لہذا ان لوگوں کا شمار  
اس گروہ میں ہے جو سوفیصد، آزادی اور رسم و رواج، ادب و آداب کو درہم برہم  
کینے والا گروہ ہے۔ خاص کر جنسی معاملات میں۔ کاش، مان شکو زندہ ہوتا۔  
ور دیکھتا کہ اس کے نظریات فرائیڈ اور اس کے پرستاروں نے کس طرح استعمال کیے  
ہیں۔ اس کی فریضوں کا کتنا مذاق اڑایا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے دونوں خیال غلط ہیں کیونکہ طبیعت و فطرت کے کچھ  
مقوق و حدود ہیں ان حقوق و حدود کو سمجھنا اور پہچاننا ضروری ہے۔ طبیعت (فطر)  
دو چیزوں کے نتیجے میں کشرشی کرتی اور سکون کو درہم برہم کر ڈالتی ہے۔ ایک محرم  
و ناکامی، دوسرے، اس کے سامنے لگی ہوئی ہر حد و قید سے مکمل آزادی۔

بہر حال تعددا زواج ضد و مخالف اخلاق نہیں نہ اس سے پاکیزگی نفس اور روح  
کا سکون متاثر ہوتا ہے، جو مان شکو کا خیال ہے۔ نہ ایک یا چند شرعی بیوں پر  
قناعت و اتفا خلاف اخلاق ہے۔ جیسے اور اس کے ماننے والے، جن کا ہر وقت عملی  
مظاہرہ اسی نظام کے تحت چاہتے ہیں۔

عقد ازدواج کے بموجب میاں بیوی دونوں  
قانونی نقطہ و نظر  
ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے  
کے قبضے میں آجاتے ہیں، ایک دوسرے سے لذت اندوزی کا جو ربط پیدا ہوتا ہے

اس کا سبب شادی کے منافع کی ملکیت ہے جو عقد ازدواج کے بموجب ہے۔ لہذا تعدد زوجات کی صورت میں صاحب حق پہلی زوجہ ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ بھی شوہر اور کسی غیر عورت کے درمیان طے ہوتا ہے وہ دراصل "فضولی" ہے (قانونی حیثیت سے کمزور ہے) دیں یہ ہے کہ مرد کے "منافع زن و شوہر" اب سے پہلے، زوجہ اول کے ہاتھ بکسچے ہیں۔ اور وہی ان کی مالک سمجھی جاتی ہے، اس بنا پر اولیت اسی کو حاصل ہے اور اس کی طرف توجہ نہ پنا چاہیے۔ اس سے اجازت لینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر تعدد زوجات کی اجازت دی جائے تو اسے پہلی بیوی کی رضامندی کے حوالے سے ہونا چاہیے۔ دراصل پہلی بیوی ہی اپنے شوہر کے بارے میں فیصلہ کر سکتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرے یا نہ کرے۔

تو، دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک مرتبہ اپنا مال بیچ ڈالے پھر اسی بکے ہوئے مال کو دوسری تیسری اور چوتھی مرتبہ الگ الگ خریداروں کے ہاتھ بیچے۔ اگر بیچنے والا وہی مال بعد والوں کے قبضے میں دیدہ و مستحق منہ ہے۔

یہ اعتراض اس نکتے پر اٹھ سکتا ہے کہ "فطرت حقوق ازدواج" کو منافع کا تبادلہ فرض کیا جائے۔ یعنی، میاں بیوی کو "زن و شوہر کے منافع" کو ہر دوسرے فریق کو مالک بنا جائے۔ ہم سر دست اس بات سے بحث نہیں کرتے کہ یہ نکتہ اعتراف و تنقیح طلب ہے یا نہیں۔ فرض کریں کہ ازدواج کی قانونی فطرت یہی ہو۔ جب بھی اعتراض اس صورت میں تو ممکن ہے کہ مرد کی طرف سے نئی چیز اور تنوع پسندی کا پہلو پایا جاتا ہو۔ تو پھر ماننا پڑے گا ازدواج کی قانونی حیثیت "زن و شوہر" (میاں بیوی) کے منافع کا تبادلہ ہی کی ہوگی۔ اور بیوی ہر لحاظ سے بالادست ہوگی اسے شوہر کے مفادات کا لحاظ کرنا ہوگا اور شوہر کے لیے کوئی وجہ جواز نہ ہوگی کہ کئی بیویاں خود سے کیے۔

لیکن جس صورت میں مرد کا جذبہ تنوع پسندی نہ ہو بلکہ گزشتہ مقامات میں بیان کردہ اسباب میں سے کوئی اور داعی ہو، اس وقت تو یہ اعتراض بے محل ہو جائے گا۔ مثلاً: بیوی بانجھ ہو۔ یا اس عمر کی ہو جب بچہ نہیں ہو کرتا ریاست ہو اور مرد اور داد کا محتاج ہو۔ یا بیوی مریض ہو اور شوہر اس سے لذت نہیں حاصل کر سکتا۔ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں بیوی کو کئی بیویاں کرنے سے روکنے کا حق نہیں ہو سکتا۔

یہ صورت حال وہ تھی جہاں تعدد ازدواج کی وجہ جواز، انفرادی پہلو اور وہ بھی شوہر کی ذات سے متعلق ہو، لیکن اگر اس معاملے میں معاشرتی قدم بھی آجائے اور تعدد ازدواج کی بنیاد، عورتوں کی فراوانی اور مردوں کی کمی ہو۔ یا معاشرے کو افرادی قوت درکار ہو اور تعدد ازدواج اس مقصد کے لیے تجویز کیا جائے، تو پھر صورت مسئلہ کچھ اور ہوگی، ان مقامات پر تعدد ازدواج قانونی فرض اور باصطلاح فقہ واجب کفائی ہوگا۔ معاشرے سے عیاشی و ادبانی کے خاتمے، یا معاشرے میں افرادی عدمی افزائش کی خاطر یہ ذمہ داری تو اٹھانا پڑے گی۔ بدیہی بات ہے کہ جب ذمہ داری اور سماج کی طرف سے فریضہ عائد ہو جائے تو اجازت و رضامندی و قبول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرض کریں۔ معاشرہ واقعاً عورتوں کی فراوانی میں مبتلا، یا اسے افراد کی عددی کثرت کی ضرورت ہے، تو شرعی ذمہ داری اور واجب کفائی کا حکم تمام بال بچے والے میاں بیوی پر نافذ ہوگا۔ گھروں کی خواتین کو فداکاری و شہادت کا وہی مظاہرہ کرنا ہوگا جو لڑکے کے فوج میں داخل ہونے کے وقت کیا جاتا ہے۔ کہ معاشرے کے تحفظ کے لیے محاذ جنگ پر جائے۔ ان مقامات پر، ایک یا کئی افرادی رضامندی کا حوالہ غلط ہوگا۔

جو لوگ زور دیتے ہیں کہ حق و عدالت کا تقاضہ ہے کہ تعدد ازدواج پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر نہ ہو، ان کی نظر فقط مرد کی تنوع طلبی ہی پر ہے، وہ



فردی و معاشرتی ضرورتوں کو بھلا بیٹھے ہیں۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ اگر فردی یا معاشرتی ضرورت موجود نہ ہو تو کئی بیویوں کا جواز ہی قابل قبول نہ ہوگا اس میں پہلی بیوی کی اجازت کے ہونے نہ ہونے کی بات ہی کیا رہ جاتی ہے۔

**فلسفی نقطہ نظر** مساوات حقوق زن و مرد فلسفی اصول ہے۔ اس کی بنیاد ہے کہ دونوں انسانیت میں برابر ہیں لہذا قانون تعدد ازواج ضد فلسفی ہے۔ چونکہ زن و مرد مساوی حقوق انسان ہیں اس لیے یاد و نول کو حق دیا جائے کہ متعدد ہم سر رکھ سکیں یا کسی کو اجازت نہ ہو، مرد کو کئی بیویوں کا حق ہو اور عورت کو چند شوہر رکھنے سے محروم رکھنا جتنی پرستی و مرد نوازی ہے۔

مرد کو چار بیویاں کرنے کا حق دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک عورت کی ویلیو (چوتھے حصے) کے برابر ہے، عورت کی یہ بہت بڑی توہین ہے۔ حتیٰ کہ سماج نے بھی میرٹ و رگو بی میں عورت کو مرد کے نصف کے مساوی مانا اور دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی ہے۔ لیکن قانون تعدد ازواج اس کے بھی منافی ہے۔

تعدد ازواج پر یہ اعتراض سب زیادہ حقیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معتز کو بالکل معلوم نہیں کہ تعدد ازواج کے فردی و معاشرتی زاویے سے موجبات و عسل و اسباب کیا ہیں؟ اس صرف معتز کی ذرا سی توجہ نہیں ہے معتز کا خیال ہے کہ موضوع زیر بحث — ہوس ہے۔ جب ہی تو کہہ ہے کہ مرد کی ہوس کو نو دیکھا گیا اور عورت کی ہوس نظر انداز کر دی۔

گذشتہ صفحہ میں تعدد ازواج کے عسل و موجبات و مجوزات و اسباب پر گفتگو ہو چکی۔ خصوصاً یہ ہمیت بھی یاد دلائی جا چکی کہ جب شوہر عورت میں شادی

ندہ مردوں سے زیادہ ہوں تو بیاتہ جوڑوں میں میاں بیوی دونوں پر یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ایسی خواتین کو گھروں میں بسائیں یا اس پر زیادہ بحث نہیں کرنا چاہیے۔ اس مرحلے میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تعدد ازواج و میرٹ و سہادت میں اسلام کے فلسفے کی بنیاد حقوق خواتین کی تو ہیں اور ان سے بے توجہی ہوتی اور سد م، انسانیت کی سطح پر پیدا ہونے والے حقوق میں تختہ و فرق مرتب نہیں ہوتا تو ہر مسئلہ میں حکم کی نوعیت یکساں ہوتی۔ کیونکہ یہ فلسفہ ہر جگہ یکساں طبقہ پذیر قرار دیا۔ سد م نے ہمیں یہ نہیں کہا کہ ایک عورت کی میرٹ ایک مرد کی نصف میرٹ کے برابر ہے اور ہمیں یہ نہیں کہا کہ ایک عورت کو ایک مرد کے برابر ترکے میں حصے سے گا۔ ورنہ ہمیں بھی یہ حکم نہیں کہ ایک مرد چار بیویاں کرے۔ گواہی (سہادت) کے بارے میں بھی ہر مسئلے کا حکم ایک ہے۔ ان باتوں سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نظر کچھ اور فلسفوں پر ہے اور اس کی قانون سازی کی سائنس اور ہے۔ ہم میرٹ کے بارے میں گزشتہ مباحثہ رد شنی ڈال چکے ہیں۔ ایک اور مقالے میں یہ بھی بتا چکے ہیں کہ انسانیت میں زن و مرد کی مساوات اور انسانیت کی بنیاد پر پیدا ہونے والے حقوق زن و مرد کا احترام، سد م کی نظریں حقوق انسانی کی الف بے کا درجہ رکھتا ہے۔ سد م زن و مرد کے حقوق مساوی کے درجے سے بلند رکھتا ہے، اس بات کا گہری نظر سے مطالعہ ضروری ہے۔ اور ان کا نفاذ بھی لازم ہے۔

## چند ازواجی دستور میں اسلام کا کردار

اسلام نے نہ تو چند زوجی دستور کو ایجاد کیا نہ لے منسوخ کیا، اسلام سے صدیوں پہلے یہ نظام دنیا میں موجود تھا، اور اب معاشرے میں ایسے مشکلات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا حل صرف تعدد ازواج ہی میں، اسلام سی کا حامی ہے۔ لیکن۔ اسلام نے چند ازواجی دستور میں اصلاحات ضرور کیے ہیں۔

### محدودیت :

پہلی اصلاح۔ اسلام نے تعدد ازواج کی رسم میں ایک اقدام یہ کیا کہ لے محدود کر دیا۔ اسلام سے پہلے چند ازواجی دستور لا محدود تھا، ایک مرد، سینکڑوں عورتیں رکھ سکتا تھا۔ یوں حرم سرا پیدا ہوتی۔ اسلام نے زیادہ سے زیادہ کی حد مقرر کر دی۔ ایک آدمی کو چار شادیاں کرنے اور چار بیویوں سے زیادہ بیویاں رکھنے سے روک دیا۔ آغاز اسلام میں ایسے افراد تھے، حکایات و روایات ان لوگوں کے نام موجود ہیں، جو اسلام لائے اور ان کے گھروں میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں، اسلام نے ان سے مٹا لیا اور انھوں نے زائد بیویوں کو رخصت کر دیا۔ غیلان ابن اسلم، کی دس بیویاں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ چھ بیویں کو رخصت کر دے۔

نوفل بن معاویہ کی پانچ بیویاں تھیں، اسلام لایا، حضور نے فرمایا، ایک کو رخصت کرنا ضروری ہے۔

شیعہ روایات میں ہے کہ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں ایک ایرانی مجوسی نے، اسلام قبول کیا۔ گھر میں اس کی سات بیویاں تھیں، امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس بارے میں دریافت کیا گیا، یہ شخص اسلام قبول کر چکا ہے، ان سات بیویوں کے بارے میں یہ شخص کیا کرنے امام نے فرمایا :

تین بیویوں کو بہر حال رخصت کر دے۔

### عدالت :

دوسری اصلاح۔ اسلام نے عدالت کی قید لگا دی :

اس نے اجازت نہ دی کہ بیویوں یا ان کی اولاد میں کسی قسم کی درجہ بندی ہو۔ قرآن کریم نے صاف صاف کہا :

فان خفتم الا تعدلوا فواحدہ

اگر تمہیں عدل نہ کر سکنے کا خوف ہو تو پھر صرف ایک بیوی پر استفا کرو۔

اسلام کی آمد سے پہلے دنیا میں اصول عدالت کا خیال ہی نہ تھا۔ نہ بیویوں کے معاملات میں انصاف تھا نہ ان کی اولاد میں۔ مقالہ نمبر ۲ میں کرستین سن اور دوسری کی رائے نقل کی جا چکی کہ، ایران کے ساسانی دور میں تعدد ازواج کی رسم عام تھی۔ بیویوں اور بچوں میں درجہ بندی ہوتی تھی، ایک یا کئی بیویوں کو ممتا ز محل کہا جاتا اور "پادشاہ زن" سے موسوم ہوتی تھیں۔ انہیں تمام حقوق حاصل تھے۔ دوسری بیویاں نوکر سمجھی جاتی تھیں۔ انھیں قانونی حق بھی بہت کم نصیب تھے۔ نوکر بیویوں کی اولاد میں اس کے قبول تھے، ان کی باپ منسوب نہیں کی جاسکتی تھیں۔

اسلام نے اس رسم کو منسوخ کیا، اسلام نے کسی بیوی اور اس کی اولاد کے قانونی حقوق میں کمتری و فرق کو مسترد کیا۔

ویل ڈیورنٹ نے تاریخ تمدن، جلد اول میں تعدد ازواج پر بحث کرتے



ہوئے گئے ہے :

آہستہ آہستہ ایک ایک فرد کے پاس چھا خاصہ سرمایہ جمع ہوتا گیا،  
لے کر ہوئی کہ اگر اس کی دولت زیادہ حصہ داروں میں تقسیم کی گئی تو  
اس کی ہر اور دو کو بہت کم حصہ ملے گا، اس کو فکر ہوئی پہلی بیوی اور  
دوسری بیوی، نیز دوسری ہم خواب عورتوں میں فرق رکھے تاکہ میراث  
اصلی بیوی کی اولاد کو ملے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قدیم زمانے میں بیوی اور اولادوں کے درمیان  
فرق مرتب رائج تھا، تعجب ہے کہ وہیں ڈیورنٹ اپنی بات کہتے کہتے یہاں تک پہنچا:  
”موجودہ سلسلہ تک براعظم ایشیا میں یہی سلسلہ جاری رہا، آہستہ آہستہ  
بیوی ایک ہی رہ گئی۔ دوسری بیویاں یا محبوب عورتیں خفیہ ہو گئیں  
یا بالکل ختم ہو گئیں۔“

وہیں ڈیورنٹ نے یا تو خیال نہ کیا، یا توجہ نہ کرنا چاہی، کہ جو وہ صدیاں گزر گئیں،  
ایشیا میں، دین مقدس اسلام نے اولاد میں فرق مرتب ختم کر دیا ہے۔ ایک اصلی بیوی  
اور چند بچی محبوبائیں رکھنے کی رسم یورپ کی رسم ہے، ایشیا کی نہیں، آخر میں یہ دستور  
یورپ کے ایشیا میں آیا اور پھیلا ہے۔

بہر حال، اسلام نے تعدد ازواج کے بارے میں دوسری اصلاح یہ کی ہے کہ فرق  
مراتب کو ہم فریب، سب بیویوں اور ان کی اولاد کو ایک درجہ دیا۔

اسلام کے نزدیک زندگی بازی کسی شکل و صورت میں جائز نہیں، علماء اسلام  
تقریباً سب ہی متفق ہیں کہ بیویوں میں فرق مرتب ناجائز ہے، ایک آدھ فقہی دستان  
میں بیوی کے حق کی تشریح یوں کی گئی ہے جس سے بولے فرق آتی ہے۔ میرے نزدیک  
یہ بات ناقابل تردید ہے کہ قرآن کریم اس کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں عدل نہ برتے، ایک بیوی کی طرف  
زیادہ جھکاؤ ظاہر کرے تو قیامت میں یوں محسوس ہوگا کہ دھا بدن زمین  
پر کھینچ کر چلے گا آخر کار جہنم میں داخل ہو جائے گا۔

عدالت انسانی فضائل میں بہترین فضیلت ہے۔ شرط عدت کا مطلب ہے بلند  
ترین اخلاقی قوت کا مالک ہونا۔ چونکہ سو مانوس ہر کے جذبات تمام بیویوں کے لیے  
یکساں اور برابر نہیں ہو سکتے، اس لیے عدت کی نگہداشت اور ان کی فرق نہ کرنا،  
مشکل ترین مرحلہ ہے جو شوہر کے ذمے ہے۔

سب کو معلوم ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے کے آخری دس  
برس میں، جو لڑائیوں کے دن تھے، بے شوہر عورتیں مسلمانوں میں بکثرت موجود  
آنحضرتؐ جن شادیاں کیں وہ بیوہ اور بڑی عمر کی عورتیں تھیں وگرنہ کہیں دوسرے شوہر ہوتا اور بھتیجی بیٹی کی دیکھ  
حضرت عائشہؓ تھیں جس سے آپؐ نے شادی کی، حضرت عائشہؓ اس پر فخر کرتی تھیں  
کہ میں اکیلی بیوی ہوں جس نے آنحضرتؐ کے علاوہ کسی دوسرے مرد کا بدن لمس  
نہیں کیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ازواج کے معاملات میں انتہائی عدت کا  
برتاؤ کرتے تھے، ذرہ برابر فرق نہ برتتے تھے۔ عروہ ابن زبیر حضرت عائشہؓ  
کے بھانجے تھے، انھوں نے اپنی خالہ سے آنحضرتؐ کی سیرت کے بارے میں کچھ سنا  
کیے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: آنحضرتؐ اپنی سیرت کے مطابق ہم میں سے کسی کو دیکھ کر  
پرترجیح نہ دیتے تھے۔ سب کے ساتھ عدالت و یکسانیت کا برتاؤ کرتے تھے۔ بہت  
کم ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ اپنی تمام ازواج کے گھر نہ جائیں۔ سب کا مزاج ہر سنی  
فرماتے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ جس خاتون کا دن ہوتا اس کے یہاں رہتے

گدے دوسریوں سے غافل نہ ہوتے غیرت طلبی ضرور کرتے۔ رات باری والی بی بی ہی کے یہاں گزارتے تھے اور اگر اتفاقاً کسی ایسی اہلیہ کے یہاں شب گزارنا چاہتے جس کی باری نہ ہوتی تو خود ان اہلیہ کے گھر جاتے اور اس رات کی اجازت طلب فرماتے تھے، اگر وہ اجازت دیتی تھیں تو دوسری کے یہاں شب بائیں ہوتے تھے۔ اگر وہ اجازت نہ دیتی تھیں تو پ دوسری کے یہاں نہ جلتے تھے۔ میں خود بھی ایسے موقع پر آنحضرتؐ کو اجازت نہیں دیتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عادت میں جو انتقال تک رہے، جب چلنا پھرنا چھوڑ دیا۔ اس وقت بھی انصاف و عدالت کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے، اور اپنا بستر اس حجرے سے اس حجرے میں منتقل کرتے تھے۔ آخر ایک دن سب کو جمع کر کے ایک حجرے میں رہنے کی اجازت لی۔ اور حجرہ حضرت عائشہؓ میں رہنے لگے۔

حضرت عثمان بن ابیصالب علیہ السلام کے گھر میں جب دو بیویاں تھیں تو امام اس قدر عدل کا خیال فرماتے تھے کہ اگر ایک معظّمہ کی باری ہوتی تو دوسری کے یہاں وضو کرنے بھی نہ جاتے تھے۔

اسلام بجائے خود اس قدر عدالت کا قائل ہے کہ مرد اور اس کی دوسری بیوی کو یہ حق نہیں دیتا کہ شادی کے لمحے یہ معاہدہ کر لیں کہ دوسری بیوی پہلی بیوی سے کچھ فرق حقوق کے ساتھ گھر میں رہے گی۔ یعنی اسلام کے نزدیک عدالت، شوہر پر واجب شرعی ہے۔ شوہر کسی قبل از وقت شرط کے ذریعے اپنی اصل ذمہ داری سے پیچھا نہیں چھڑ سکتا۔ عورت و مرد دونوں میں سے کسی کو اس قسم کی شرط تنہا عقد میں رکھنے کی اجازت نہیں۔ دوسری بیوی صرف علی طور پر اپنے حق سے دست بردار ہو سکتی ہے، مگر یہ شرط نہیں کر سکتی کہ وہ پہلی بیوی کے برابر حقوق نہ رکھے گی۔ اسی طرح پہلی بیوی علی طور پر اپنی رضا و رغبت سے اپنے حقوق سے دست بردار

ہو جائے تو ہو جائے، لیکن قانونی طور پر اپنے حقوق کے بارے میں کوئی ایسا قول و قرار نہیں کر سکتی جس کی رو سے وہ قانوناً محروم ہو جائے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا، کیا مرد اپنی بیوی سے یہ شرط کر سکتا ہے کہ فقط دن کو اس کے یہاں آئے گا یا مہینے میں ایک بار، یا ہفتے میں ایک بار رہے گا۔ یا شرط کر لے کہ پورا لفظ یا فلاں بیوی کے برابر لفظ لے نہ دے گا۔ در یہ بیوی ان شرط یا ان میں سے کسی ایک شرط کو مان لے؟ کیا حکم ہے؟

حضرت نے فرمایا: نہیں، ایسی شرطیں صحیح نہیں ہیں۔ ہر بیوی عقد ازدواج کے بموجب خود بخود ایک زوجہ کے تمام حقوق حاصل کریتی ہے۔ البتہ عقد و حصول حقوق کے بعد ہر بیوی، شوہر کی توجہ اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اور یہ کہ اسے طلاق نہ دے، یا کسی اور مقصد کی خاطر اپنے کچھ حقوق شوہر کو جہت کر سکتی ہے۔ ان اخلاقی شرائط کے بعد، تعدد ازدواج ذریعہ ہوس رانی کے بجائے فرائض و حقوق کی شکل و صورت اختیار کر گیا ہے۔ شہوت رانی و ہوس پرستی کا مطلب مکمل آزادی اور آرزو سے دل پوری کرنا ہے۔ ہوس پرستی اس وقت وجود پذیر ہوتی ہے، جب آدمی دل کے قابو میں آجائے اور جو دل چاہے وہ کرے۔ اور دل پر خواہشات کا قبضہ ہو۔ دل اور خواہشات دل دلیس و حساب قبول نہیں کرتے۔ جہاں نظم و ضبط، قانون قاعد، فرض کی انجام دہی اور عدل و انصاف کی بات آجائے وہاں، ہوس، آرزو و آزادی خیال کا قدم نہیں آسکتا۔ اس وجہ سے، اسلامی پابندیوں کے ساتھ "تعدد ازدواج" کو ذریعہ ہوس رانی کہنا درست نہیں۔

جو لوگ تعدد ازدواج کو ہوس رانی کا ذریعہ مانتے ہیں وہ ایک ناجائز کام



کے لئے سرمدی قانون کو بہانہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معاشرے کو ان کے مجھے  
وہ اس غمہ بہانے پر سزا دینے کا حق ہے۔

**عدل و انصاف کا خوف** | انصاف کی بات کرنا چاہیے، تعدد زوجہ  
کی صورت میں اسلامی پابندیوں کے مطابق  
کرنے والوں کی تعدد بہت کم ہے۔ فقہ اسلام کہتی ہے:

”اگر درست ہو کہ پانی کا استعمال جسم کو نقصان پہنچائے گا تو وضو نہ کرو۔“

”اگر خوف ہو کہ روزہ تمہارے لیے ضرر کا باعث ہوگا تو روزہ نہ رکھو۔“

فقہ میں یہ دونوں حکم موجود ہیں، آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو پوچھتے ہیں  
۔ جناب پانی کا استعمال مجھے نقصان پہنچاتا ہے، میں وضو کروں یا نہ کروں؟ روزہ  
سے خوف ضرر ہے۔ روزہ رکھوں یا نہ رکھوں؟ یقیناً یہ سوال درست اور بر محل ہیں  
ایسے اشخاص وضو وضو نہ کریں، ایسے آدمی ہر روز روزہ نہ رکھیں۔

قرآن مجید کے نفاذ میں:

”فان خفتم الا تعدوا فواحدة“ (اسماء ۴)

”اگر تم کو خوف ہو کہ بیویوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایک سے زیادہ  
بیوی نہ رکھو۔“

اس صورت میں، اپنے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی سے سنا ہے کہ اس نے  
پوچھا ہو۔ ”میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ دوسری بیوی لانا چاہتا ہوں، مگر  
ڈرتا ہوں کہ بڑی برائی و عدالت نہ برت سکوں گا، شادی کروں یا نہ کروں؟ میں نے تو  
یہ سوال نہیں سنا۔ آپ نے بھی یقیناً یہ بات کسی سے نہ سنی ہوگی۔ ہمارے عوام بیویوں  
میں عدل و مساوات قائم نہ رکھنے کی نیت کے بعد بھی گرا سلام اور حکام اسلام کی  
آڑ میں کئی شادیاں کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ تو بات صاف ہے۔ یہ لوگ اپنی بدکرداری

سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔

جو لوگ کم از کم اسی ایک پابندی کو پوری طرح نباہ سکتے ہوں تو بلاشبہ وہ  
تعدد ازواج پر عمل کر سکتے ہیں اور ان پر کوئی اعتراض بھی نہ ہو سکے گا۔

**حرم سرائیں** | تعدد ازواج کی بنیاد پر اسلام کے خلاف گفتگو کا ایک  
سبب گزشتہ خلفاء و سدھن کی حرم سرائیں تھیں

عیسائی مشیروں اور کچھ مصنفین نے سدھی جارت تعدد ازواج کو ان سون  
حرم سرائوں سے جوڑ دیا جہاں کے ظلم و ستم کی کہانیوں کا پروپیگنڈا کیا اور اسے اسلام  
کے سرمنہ دیا۔

ہمارے مصنفین بھی ان کے ترجمان بن گئے اور ان کی تحریروں میں وہی صدے  
بازگشت آنے لگی، وہی الفاظ، وہی فکر، اور وہی مقاصد کہ تعدد زوجہ کو دوسرے  
نام حرم سرائے۔ اتنی آزادی فکر بھی نہیں حاصل نہیں کہ تعدد ازواج و حرم سرائے  
فرق تبا سکیں۔

**دوسرے شرائط و لوازمات** | عدل و انصاف سے قطع نظر کچھ اور  
ذمہ داریاں، کچھ درلوازم و فرائض

بھی مرد پر عائد ہوتے ہیں۔ بیوی کے حقوق کا ایک سلسلہ اپنی جگہ پھر نوہر سے  
فائدہ حاصل کرنے کا جواز سب جانتے ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی مرد چند شادی کر سکتا،  
اس کا حوصلہ در مالی امکانات سے جارت دیتے ہیں تو اعتراض کیوں ہے، خزانہ ایک  
بیوی کے لیے بھی تو مکانات مالی پر نظر رکھی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ جسمانی اور طبعی مکانات بجائے خود ایک شرط لازم ہیں۔  
کافی اور وسائل اشیاء میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے  
روایت ہے۔ امام نے فرمایا:

جو شخص عورتوں کو جمع کرے اور انہیں جنسی طور پر مطمئن نہ کر سکے، اور وہ عورتیں بدکرداری میں مبتلا ہوں تو اس کا گناہ اس تنوہر کی گردن پر ہے۔

حرم سراؤں کی تاریخ اور ان کے بارے میں داستانوں کا چرچا ایسی عورتوں کی شان دہی کرتی ہیں جو نوجوان اور اپنے جنسی دباؤ میں گرفتار تھیں، وہی بدکرداری کرتی اور بے اوقات جملہ وجدل کا سبب بنتی تھیں۔

## محترم قارئین!

ان سات مقالوں میں "چند ازدواجی" کے مسئلے پر جو کچھ میں نے لکھا، اس میں سبب و علل اور تعدد ازدواج کی بنیاد واضح کی ہے۔ اور یہ بات عرض کی ہے کہ اسلام نے اس دستور کو منسوخ کیوں نہ کیا؟ تعدد ازدواج کے شرائط و حدود، دستور و پابندیاں بیان کی ہیں جن کے بعد یہ دستور منظور کی۔

آپ پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ اسلام نے تعدد ازدواج کی ضرورت میں عورت کی توہین نہیں کی بلکہ اس طریقے سے اس نے جنس خواتین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ شادی کے قابل عورتوں کی فردانی اور ان مردوں سے زیادتی کی نسبت جو مرد شادی کے قابل ہوں۔ اور یہ تناسب دنیا میں پہلے بھی اور اب بھی ہے۔ اگر اس معاشرتی مسئلے کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تو عورت، مرد کے لیے ایک بدترین گھوٹا بن کے رہ جاتی۔ مرد کا اس کے ساتھ ایک لونڈی سے بھی بدتر سلوک ہوتا۔ کیونکہ نان ایک لونڈی کے لیے بھی کم از کم ایک قسم کا معاہدہ، ایک قسم کی ذمہ داری تو بہر حال رکھتا ہے، اس کی اولاد کو اپنی اولاد ماننا ہے لیکن معشوقہ اور فریڈ گرنز سے یہ سلوک بھی نہیں ہوتا۔

## آج کا مرد اور تعدد ازدواج:

آج کا مرد تعدد ازدواج سے روگردان ہے۔ کیوں؟ کیا، اس کا مقصد بی پہلی بیوی سے وفاداری ہے۔ یا اس کی خواہش ہے کہ وہ ایک بیوی کے پردے پر روزیامزہ چکھے اور اپنی اس جس کو نہ ختم ہونے والے گناہوں سے آسودگی بخشنے؟



زوج کی تعداد زوج کی خانہ پر کی وفاداری و پاکدامنی کے بجائے عیاشی و گناہ گاری نے کر دی۔ ورنہ یہ طرح کا مرد تعددِ ازدواج کی ذمہ داری سے نکل بھاگتا ہے کہ اس میں پابندی اور جواب دہی کا جو جھگڑا ہے اسے کیوں اٹھائے وہ اس سے نفرت کرتا ہے کل کا مرد اگر بوسہ رانی کرنا چاہتا تھا تو گناہ کی راہیں اپنی کھلی نہ تھیں، وہ مجبوراً تعددِ ازدواج کے بہانے اپنی خوشی پوری کرنے کی سعی کرتا ہوگا، ممکن ہے کہ وہ گھٹیا مقصد ہی نشا دیا کرتا ہو اور قانونی و مالی اور اخلاقی پابندیوں سے بچتا بھی ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ ایک ذمہ داری ضرور اٹھاتا تھا، وہ ان بیویوں کی اولاد کو اپنی اولاد ضرور ماننا تھا۔ آج کا مرد اپنی عیش پرستی کے بعد عورت کی کوئی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں، اس کا فائدہ اسی میں ہے کہ تعددِ ازدواج کے خلاف مہم چلائے۔

آج کا مرد سیکرٹری، ٹائپسٹ، جیسے ناموں اور کاموں کے لیے خواتین کو جمع کر کے ان سے بیوی کا کام لے۔ پھر مزہ یہ ہے کہ اس کی اجرت اور اخراجات، حکومت یا کمپنی کی جیب سے دے کر دیتا ہے۔ خود اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی صرف نہیں کرتا۔

آج کا مرد مہر و نان و نفقہ کی زحمت و تکلیفات اٹھائے بغیر روزانہ صبح سویرے طلاق کی ضرورت پیش آئے بغیر اپنی محبوبہ بدل لیتا ہے۔ موسمی چومبہ، تعددِ ازدواج کے خد ف ہے۔ وہ ہونا بھی چاہئے آخر اس کی نوجواں سیکرٹری "موبور" اس کی پیونشیں ہے، سال بھر بعد اسے بدل لے گا۔ ایسے امکانات کے بعد تعددِ ازدواج کی ضرورت بھی کیا ہے؟

تعددِ ازدواج کے بڑے سخت مخالف برٹینڈ رسل کی سوانح عمری میں پڑھا کہ — اس کی زندگی کے ابتدائی عہد پر اس کی بڑی ماں کے عدوہ دوسری دو عورتوں کی بڑی چھاپ تھی ایک "ایس" (ALYS) اس کی پہلی بیوی دوسری اس کی دوست "آٹولین مول" (OTTOLINE MORELL)۔ مورل اس دور

کی مشہور عورت تھی، بیسویں صدی کے آغاز میں وہ بہت سے لکھنے والوں کی دوست تھی۔ مثلاً ایسا نہیں تھا تعددِ ازدواج کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا۔

"ہی یار بازیاں تھیں جن کے سائے میں رسل نے اپنی کیسی بیوی "ایس" (ALYS) کے ساتھ زندگی نباہ دی۔ رسل نے اپنی زبان سے خود اقرار کیا ہے: کچھ دن بعد سائیکل پر سوار دو پہر کو شہر کے قریب ایک ٹھنڈی بستی جارہا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا۔

اب مجھے "ایس" (ALYS) سے محبت نہیں رہی۔

# فہارس

- ① فہرست آیات۔
- ② فہرست احادیث۔
- ③ فہرست اشعار۔
- ④ فہرست علماء اہل تشیع و اہل اہل حق و اہل حق و کتب۔



## فهرست آیات قرآن

تین آیه

صفحه

اِذْ وَجَّهْنَا إِلَىٰ امْكُتْ مَا يَوْحَى ..... (طه/٣٨)

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ ..... (احزاب/٤٣)

اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيفَةً ..... (بقره/٣٠)

الطَّلَاقِ صَرَّيَانِ فَاَمَّا كَ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيحٍ بِاِحْسَانٍ ... (بقره/٢٣٩)

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلِّغْنَ اَجَلَهُنَّ ..... (بقره/٢٣١)

فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ ..... (اعراف/٢٣)

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ ..... (اعراف/٢٠)

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ... (نساء/٣٢)

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ ... (نساء/٤)

لَقَدْ ارْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ ... (صافات/٢٥)

وَمُتَّهِمٌ فِي الْاَنْجِيلِ كَنْزَرِعٍ اَخْرَجَ شَطَاةً فَازَرَهُ ... (نجم/٢٩)

هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لِهِنَّ ... (بقره/١٨٤)

وَاَتَوَّ النِّسَاءَ صَدَقَاتِهِنَّ نَحْلَةً ... (نساء/٥)

وَ اِذَا حَيَّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِاِحْسَنِ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا ... (نساء/٥٦)

وَعَدَّ وَالْهَمَّ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ ... (انفال/٦٠)

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَقْدِرُوْا فَوَاحِدَةٌ ... (نساء/٢)

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَاِبْعَثُوْا حَكَمًا ... (نساء/٣٥)

وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ... (اعراف/١٨٩)

وَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ضَعِيفًا ... (نساء/٢٨)

وَ قَدْ سَمِعْنَا رَافِيًا لَكُمْ ... (اعراف/٢٠)

وَ كَيْفَ تَأْخُذُوْنَهُ وَ قَدْ افْتَضَىٰ بَعْضُكُمْ اِلَىٰ بَعْضٍ ... (نساء/٢)

وَ لَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ... (بقره/١٨٨)

وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوْهُنَّ ... (نساء/١٩)

وَ لَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اَبَاؤُكُمْ ... (نساء/٢٢)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ... (تین/٢)

وَ مَتَّعُوْهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرًا وَ عَلَى الْمَقْتَرِ قَدَرًا ... (بقره/٢٣٦)

وَ مِنْ اٰیَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ لُحُومًا ... (روم/٢١)

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوَّيْنَاهَا ... (شمس/٤)

يَا اَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلَىٰ رَبِّكَ ... (اشقاق/٦)

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا يَجْعَلْ لَكُمْ اَنْ تَرْفُو النِّسَاءَ كُرْهًا ... (نساء/٥)

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ...

## فہرست احادیث نبوی و ائمہ اطہار

انقذ الله في النساء فانكم اخذتمون بامانة الله و... (پیغمبر اکرم)  
 اذا الراد الرجل ان تزوج المرأة فليقل: اقررت بالميثاق الذي اخذ الله  
 امساك بمعروف او تسريح باحسان (امام صادق)  
 نکاح کرو، طلاق نہ دو، عرس الہی طلاق سے لرز اٹھتا ہے (حدیث رسول)  
 اگر عمر حبلہ بازی نہ کرتے اور متعہ حرام نہ کرتے... (علی)  
 ان صلاق ام ایوب لحوب (پیغمبر اکرم)  
 ایسا کرنے والا چار مہینے بعد جبراً اپنی قسم توڑے... (امام محمد باقر)  
 یہ بات اس کے لیے ٹھیک ہے جسے اللہ نے بیوی کی وجہ سے... (امام کاظم)  
 تمہیں متعہ کی کیا ضرورت ہے حالانکہ اللہ نے تمہیں اس سے بے نیاز کیا ہے... (امام غم)  
 جبرئیل نے عورتوں کے بارے میں آنا زور دیا کہ... (رسول اللہ)  
 خدا کی نگاہ میں اسی گھر سے زیادہ محبوب کوئی جگہ نہیں جہاں نکاح ہوا... (رسول اللہ)  
 خدا دشمن رکھتا اور لعنت کرتا ہے اس مرد پر جو بیویاں بدلتا... (رسول اللہ)  
 اثناء عقد بیویوں میں درجہ بندی صحیح نہیں... (امام باقر)  
 ما شغار فی الاسلام... (رسول اللہ)  
 ما حل اللہ شیئاً بغض الیہ من الطلاق (رسول اللہ)  
 من اخلاق الانبیاء حب النساء... (پیغمبر اکرم)  
 جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان دونوں میں انصاف... (پیغمبر اکرم)  
 جو اپنی زوجہ کو باس نہ دے، نفقہ نہ ادا کرے مسلمانوں کے امام پر فرض ہے  
 کہ ان دونوں کو الگ کر دے۔ (امام صادق)

جو کئی بیویاں جمع کر لے پھر ان کی جنسی آسودگی نہ کر سکے... (آنحضرت)  
 وہ مقام جہاں، تقیہ نہ کروں گا وہ متعہ ہے۔ (امام صادق)  
 مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ شادی شدہ نے متعہ کیا... (علی)  
 غداق سے زیادہ مبغوض و منفور اللہ کے نزدیک کوئی نہیں (امام صادق)



## فہرست اشعار

راز طرب عشق، کہ داند کہ چہ ساز است - کز زخم ... تگ و تاز است  
 رازیت درین پردہ گراں ز پشیمانی - دانی .... مجاز است  
 عشق است کہ ہر کہ دگر رنگ در آید - ناز است ... نیاز است  
 در صورت عاشق چہ در آید ہم سوز است - ..... ہم ساز است  
 تا توئی پامنہ اندر فراق : البقیع الاشیاء عندی الطلاق  
 سخن درست بگویم، نمی تو نم دید : کہ می خوردند حریفان ... نظارہ کتم  
 غیر میں محفل میں یوسے جام کے : ہم ہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

## فہرست اعلام

علی :	زم . (الوابشر) :
الاحوال الشخفیه (کتاب) :	آئینہ :
ادارہ اقوام متحدہ :	ہکا تھیماں :
ارٹ و حقوق مدنی ایران (کتاب) :	ہکا دیوس :
اریطو :	ہیس :
زہرہ (اسلامی یونیورسٹی) :	سن اسٹائن :
اسپنسر، ہربرٹ :	(ا) :
سٹرنگ، پروفسر :	ابراہیم علیہ السلام :
سکاٹ، ڈکٹر زیدے :	بن ابی العوجا :
اسد بول :	ابن اثیر :
اشمید، جرنل پروفسر :	نعمانی، محی الدین :
اطلاعات، روزنامہ، تہران :	یوب انصاری :
اعلانہ حقوق انسانی :	بیسر :
افریقہ :	جوداود :
افلاطون :	وزیرہ، شیخ محمد :
اقبال، علامہ :	یوحنا :
اسن، بیگم کل یوڈ :	یونیورسٹی احسن :
افانسو، اوس :	

از بیته دوم (ملک بختیار) :

امامی، حسام الدین :

ام ایوب :

امریک :

امریکی :

اموی :

انتقاد بر تواریخ ارساسی و مسلمانان (کتاب) :

انجیل :

اندلس :

انسان موجود ناشدنی (کتاب) :

انقلاب روس :

انقلاب فرانس :

انگریز، انگریزی :

انگلش، فریدرک :

انگلستان (برطانیه) :

ایران :

ایران در زمان ساسانیان (کتاب) :

ایرانی (ملت ایران) :

ایشیا :

این منور :

## ( ب )

باققر (امام محمد باقر) :

باشاد (نفت روزه) :

برلن (مشرقی و مغربی) :

بقره، سوره :

بنی حسن (حسنی سادات) :

بنی حسین (حسینی سادات) :

بوخسار (جرمن) :

بورنیو :

بوده (مذهب) :

بوعلی :

## ( پ )

پترنگال :

پیریدو :

پیغمبر اکرم، دیکھے رسول اکرم :

پیمان مقدس با میثاق ازدواج (کتاب) :

پیرس :

پیوس دوم :

## ( ت )

تاریخ آبراهه (کتاب) :

تاریخ اجتماعی ایران از زمان ساسانیان

تا انقضای امویان (کتاب) :

تاریخ تمدن (کتاب) :

تاریخ تمدن اسلام و عرب (کتاب) :

تبت :

تنبیه الامة (کتاب) :

تهران :

تخودا، دقبیلہ :

تورات (کتاب) :

تھیوڈور (رومی بادشاه) :

( ج )

جاپان :

جاپانی :

جرمن :

جرمنی (مشرقی و مغربی) :

جستی نین، شاه روم :

جیفر صادق (امام) :

جعفری (مذهب، مذهب) :

جمهوریت (کتاب) :

جواهر الکلام (کتاب) :

جیمز، ویلم :

( ج )

چومب، موسی :

چیکو سلواکیہ :

چین :

## ( ح )

حافظ :

حسان بن ثابت :

حسن مجتبی (امام) :

حسین (امام) :

حقوق الزوجیه (رسالہ، کتاب) :

حلی، آیت اللہ :

حلی، علامہ :

حوا :

## ( خ )

خانلری، ڈاکٹر زہرا :

خدیجہ، ام المؤمنین :

خسرو پرویز :

خلاف (کتاب) :

( د )

دموس :

دنور :

دوکر پینی :



( د )

دارون :

دو مشرین ، هنری :

ڈیلی اکسپرس ، روزنامہ :

( ر )

راغب اصفہانی :

رائیٹر :

رسل ، برتریند :

رسل لی ، ڈاکٹر :

رسول اکرم ( رسول خدا ، رسول اللہ ، محمد مصطفیٰ ) :

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم :

رشید رضا ، سید محمد :

روان شناسی ماوران ، ( کتاب ) :

رو لینڈ ، روس :

روس ، سویت یونین ، جہوری :

روسو ، جان چاک :

روسی :

رومانی :

رومی :

ریک ، پروفیسر :

روم :

زردشتی :

زکریا :

زناشوی و اخلاق ( کتاب ) :

زن جنس برتر ( کتاب ) :

زندگانی محمد ( کتاب ) :

زندہ بیدار ، رسالہ ( کتاب ) :

زن روز ، رسالہ :

زہرا ، حضرت فاطمہ :

( س )

ساسانی :

ساسانیان :

سان برنارڈینو :

سان فرانسکو :

ساواثر ، ڈاکٹر :

سحن ، مجید :

سدوم :

سردانٹس :

سعدی :

سنن ابی داؤد ( کتاب ) :

سنی دہلستان ، اہل سنت :

سویر :

سبزر :

سیاست ( کتاب ) :

سی سی پوس پوسر :

( س )

شا ، برنارڈ :

شایگان ، ڈاکٹر علی :

شرح قانون مدنی ایران ، ( کتاب ) :

شفا ، ( کتاب ) :

شعب :

شمس ، شبلی :

شہید ثانی :

شہید ( فقہ ، مذہب ، علوم ، فقہا ) :

( ص )

صاحب جواہر :

صاوق ، دیکھیہ جوہر صادق علیہ السلام :

صحیح بخاری ( کتاب ) :

صدائق تہمین شیرازی :

( ط )

طارق بن مرتع :

طباطباتی ، علامہ :

طبری :

طوسی ، شیخ ( شیخ الطائفہ ) :

( ع )

عائشہ ، ام المؤمنین :

عباس ، دیم رسول :

عباسی ، خلفا ، بنی العباس :

عثمانی ، سلاطین ، خلفا :

عراقی ، فخر الدین :

عرب ( جاہلیت ) :

عربی ، ( زبان ) :

عربی ، محی الدین :

عمرہ بن نہیر :

علی بن ابی طالب ( امیر المؤمنین ) :

علی بن یقطین :

عمر ، حضرت :

عمورہ :

عمید ، ڈاکٹر موسیٰ :

عیسائی ، مسیحی :

( غ )

غالب ، مرزا :

غزالی :

غیلان بن اسم :  
( ف )

فرار :  
فرانس سوار ، روزنامه :  
فرانس :  
فرانسیسی :  
فرانڈ :  
فرانڈ و تحریم وراثتوں کی با محارم ( کتاب ) :  
فرعون :  
فرستہ ، اول :  
فصل برکی :  
فلاڈلفیا :  
فلسفۃ الشو و الارتقاء ( کتاب ) :  
فلاڈلفیا :  
فیگارو ، روزنامه :  
( ق )  
قانون اساسی و متمم قانون اساسی ایران :  
قانون مدنی ایران :

فرز کریم :  
( ک )

کارنجیا :  
کارل الکسیس :  
کاشف الغطاء علامہ :  
کاظم ، امام موسی کاظم :  
کافی ، کتاب :  
کامن ، سامی :  
کرستی سن :  
کشاف ، تفسیر ( کتاب ) :  
کلبی ، و فلسفی دبستان :  
کوالوسکی ، مونیہ :  
کوریہ ، جمہوری :  
کیتھولک :  
کینسی ، رابرٹ :  
کینسی رپورٹ :  
کیش :  
کیلی فورنیا :  
کیمھان ، روزنامه :

( گ )

گاندھی :  
( ل )  
لبنی :  
لاس انجلس :  
بنانی :  
لذاب فلسفہ ( کتاب ) :  
لکی :  
لیزر :  
لندن :  
لوبون ، گوستاو :  
لوط :  
لینڈزی ، جج :  
بیون لودوئس :  
ماربو ، بشریں :  
ماہار :  
مانسکو :  
مخوسی :  
نئی الدین ، ابن عربی :  
مدین :  
مدینہ :

مراکش :  
مرجیت و روحانیت ( کتاب ) :  
مریم ، حضرت :  
مسالک ( کتاب ) :  
مسجد الحرام :  
مسیح ، عیسی :  
مسیحیت ، عیسائیت ، عیسائی :  
مصر :  
معاویہ :  
مفردات غریب القرآن ( کتاب ) :  
مکام الاخلاق ( کتاب ) :  
میکادو :  
ملایا :  
المنار ، تفسیر :  
منشور اقوام متحدہ :  
منفرد و انبغی :  
منوچہریاں ، خانم مراکیز :  
مورل ، اٹولیس :  
موسی علیہ السلام :  
مولوی :



مونوریس، شاہ روم :

منیگو، اشے :

محدوی :

مینزان العمل (رسالہ) :

(و)

والشر :

والنشن :

وسائل (کتاب) :

وکتوریہ، عمدہ :

ولایت وزعامت، مقالہ :

ول ڈیورنٹ :

وید (کتاب)

وینئر :

(ھ)

ہارون رشید :

ہزار ویکشپ (کتاب)

ہند :

ہندی :

ہوبنر :

ہیکل، ڈاکٹر محمد حسین :

کی

یورپ :

یورپی :

یونانی :

یونسکو، مجلہ :

یہود، قوم :